

# پیش



محمد فاروق انجم

Hina

## پیش لفظ

میں نے کئی کہانیاں لکھی ہیں، کئی سلسلے، کئی ڈرامے لکھے ہیں، لیکن پیش لفظ پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ آج مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تو کہانی لکھنے سے بھی مشکل ہے۔ کہاں سے شروع کروں، ان ہی سوچوں میں سرگرداں لکھ رہا ہوں کہ میرا پہلا ناول آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں سب سے پہلے رب العزت کا شکر ادا کروں گا۔ بے شک اللہ کی مدد سے میں اس ناول کو لکھ سکا۔ اور پھر اپنے والدین کا شکریہ جن کی دعائیں میرے ساتھ سائے کی طرح رہتی ہیں۔ یہاں میں شکریہ ادا کروں گا محترم جناب انوار علیگی صاحب کا جن کی شفقت میرے ساتھ اُس روشنی کی طرح ہے جو اندھیرے میں راستہ دکھاتی ہے۔ یہ ان کی راہنمائی کا نتیجہ ہے کہ میں ناول کو لکھ سکا ہوں۔ میں ان کی صحت اور کامرانی کی ہمیشہ دعا کرتا ہوں۔ میرا یہ پیش لفظ ادھر اور اہ جائے گا اگر میں عبدالغفار صاحب (علی میاں پہلی کیشنز) کا ذکر نہ کروں۔ ان کی شخصیت تو خوبصورت ہے ہی لیکن ان کا دل بھی ایسا صاف ہے کہ ایک بار ملنے کے بعد دل چاہتا ہے کہ ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہے۔ میرا پہلا ناول انہوں نے اپنے ادارے سے شائع کیا ہے۔ جہاں مجھے اچھے ادارے اور اچھے محترم لوگ ملے ان میں ایک اچھے انسان کا عبدالغفار کی شکل میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اپنے دوست اور بھتیجے عاصم محمود کا شکریہ کہ میرے بہت سے معاملات میں اس کی کوشش اور تعاون بھی میرے ساتھ رہتا ہے۔

میرا یہ ناول سب سے زیادہ شائع ہونے اور پڑھا جانے والے ہفت روزہ اخبار جہاں میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے اور ایک مقبول سلسلہ کی سند بھی اس ناول نے حاصل کی۔ جس پر میں ایک بار پھر رب العزت کا شکر گزار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ کتابی شکل میں بھی اس ناول کو وہی پزیرائی ملے گی..... ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس ناول کی کہانی انسانی جذبات پر مبنی ہے۔ ایسے جذبات چونچے بھی ہوتے ہیں، جھوٹ فریب اور رقابت کے زہر میں بھی ڈوبے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس کی محبت شفاف تھی۔ جس میں ملاوٹ نہیں تھی۔ ایک بھائی کی شجاعت جسے اپنی عزت کا تحفظ کرنا آتا تھا۔ اس ناول میں محبت کا کھیل کھیلنے والا دھوکے باز لڑکا بھی تھا جس کا دل مطلب اور مفاد کے زہر سے لبریز تھا۔ چال بازی کے وہ پتے جو کہاں اور کس کے ہاتھ میں تھے کچھ علم نہ تھا۔ لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال کو پڑھتے ہوئے یقیناً آپ بھی اس میں کھو جائیں گے۔ مجھے آپ کی قیمتی آراء کا شدت سے انتظار رہے گا۔

محمد فاروق انجم

تیمور سلطان کو قریب سے جاننے والوں کا کہنا تھا کہ اس کے سینے میں کسی شیر کا دل دھڑکتا ہے۔ وہ مضبوط قوتِ ارادی کا مالک اور نڈر ہے اور اگر کسی نے اس کی ذات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو پھر اس کے لیے اس کے دل میں زہر کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ تیمور میں ہر وہ خوبی تھی جو ایک بہادر شخص میں ہوتی ہے، اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ وہ ایک بار جو بات اپنے منہ سے نکال دیتا تھا پھر وہ الفاظ کبھی واپس نہیں لیتا تھا؟

تیمور کا باپ فوج میں تھا۔ اس کی زندگی بہادری اور شجاعت میں ہی گزری تھی۔ خوف کے آگے کبھی اس نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی تربیت بھی اپنی فطرت کے مطابق ہی کی تھی۔

باپ کی خواہش کے مطابق تیمور فوج میں نہیں گیا تھا بلکہ اس کے برعکس اس نے بزنس کی ڈگری لے کر کاروبار شروع کر دیا تھا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہو گیا تھا۔ تیمور کی ماں تو بہت پہلے اس دنیا سے چلی گئی تھی اور باپ کے جانے کے بعد وہ اپنی چھوٹی بہن نازلی کے ساتھ اس دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔

نازلی بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ کالج میں پڑھتی تھی۔ تیمور اس کا ہر طرح سے بہت خیال رکھتا تھا۔ اس گھر میں ان دونوں کے علاوہ ایک باورچن اور صفائی وغیرہ کے لیے ایک عورت کے علاوہ گیٹ پر کھڑا چوکیدار ہوتا تھا۔ تیمور کے دل میں یہ بات کئی بار آئی تھی کہ وہ نازلی کی شادی کر کے اسے اپنے گھر میں رخصت کر دے لیکن پھر اس کی ادھوری تعلیم کا سوچ کر وہ اپنی سوچ بدل دیتا تھا۔ تیمور اپنی بہن پر کوئی ایسی پابندی بھی نہیں لگانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر نازلی کی اپنی کوئی پسند ہو تو وہ خود تسلی کے بعد اس کی پسند میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا

تیمور کی بات سن کر جیسے نازلی کو مایوسی سی ہوئی تھی۔ اس نے تیمور کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ جیسے ہینڈسم، خوبصورت لڑکے کی نظر میں کوئی لڑکی نہیں ہے؟ یا پھر اس لڑکی کو تلاش کرنا ہوگا جس کی نظر میں آپ ہیں۔“

گھر سے بزنس اور بزنس سے گھر تک محدود رہنے والے تیمور نے کبھی کسی لڑکی کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ جو بزنس وہ کرتا تھا اس کے علاوہ وہ پراپرٹی میں سرمایہ کاری بھی کرتا تھا۔ جیسے ہی اسے منافع ملتا وہ اسے بیچ کر کچھ اور خرید لیتا تھا۔ اس کام سے بھی اس نے اچھا خاصا روپیہ کمایا تھا۔

نازلی کی توجہ دلانے سے تیمور سوچنے لگا تھا کہ کون ہے جس سے وہ شادی کرے۔ پہلی بار اس نے اس بارے میں بہت دیر تک سوچا تھا۔ اس کی نگاہ کے سامنے کئی لڑکیاں گھومنے لگی تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو کاروبار کے دوران کہیں نہ کہیں کسی حوالے سے ملتی تھیں۔

☆=====☆=====☆

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ تیمور کی اچانک آنکھ کھل گئی تھی۔ گہرے سناٹے میں دیوار کے ساتھ لگے کلاک کی سینڈوں والی سوئی چلتے ہوئے آواز پیدا کرتے ہوئے احساس دلاری تھی کہ دن کی ہنگامہ خیزیوں میں جس سوئی کی رفتار کو بھول جاتے ہو، وہ بھی اپنا شور رکھتی ہے۔

تیمور نے کروٹ بدل لی تھی۔ ایک بار پھر اسے نازلی کی وہ بات یاد آگئی تھی جو اس نے لڑکی کے بارے میں کہی تھی۔ اچانک تیمور چونکا۔ اس کی بند آنکھیں پوری طرح سے کھل گئی تھیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک چہرہ نمودار ہو گیا تھا۔ وہ خوبصورت چہرہ عشرت کا تھا۔ تین ماہ قبل عشرت اس کے آفس میں نوکری کے لیے آئی تھی۔ اس نے بھی بزنس میں ڈگری لے رکھی تھی۔ انٹرویو کے دوران جب تیمور نے اس سے یہ سوال کیا تھا کہ جس کمپنی کو وہ چھوڑ کر آ رہی ہے وہ کمپنی اس کی کمپنی سے کہیں اچھی اور بڑی ہے، اس نے وہ کمپنی کیوں چھوڑ دی؟

اس کا جواب عشرت نے بڑے اعتماد سے دیا تھا۔ ”وہ نوکری میں نے تھپڑ کی وجہ سے چھوڑ دی۔“

اس کا جواب سن کر تیمور ایک بار چونکا۔ ”تھپڑ کی وجہ سے؟“

”جی ہاں۔“ عشرت نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ”اس کمپنی میں ایک لڑکی اور بھی کام کرتی تھی۔ کمپنی کا جی ایم کمیونٹیشن ہے۔ وہ ہمیشہ اس لڑکی کو بری نگاہ سے ہی دیکھتا تھا اور

اور اگر وہ نازلی کی پسند پر مطمئن نہ ہوا تو پھر اسے انکار کرنے میں کوئی عار نہیں ہوگا۔

یہ سوچ بھی اس کے ذہن میں تھی کہ نازلی کا حجاب کبھی بھی اسے اپنے دل کی بات بڑے بھائی سے کہنے کے لیے مجبور نہیں کرے گا۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پہلے شادی کر کے اس گھر میں اپنی بیوی کے روپ میں ایک عورت لائے گا۔ تاکہ اس کی بہن اپنے دل کی بات اپنی بھابی سے کہنے میں کسی تردد کا سامنا نہ کرے۔

یہ بات جب تیمور نے نازلی سے کی کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے تو نازلی جیسے آنکھ جھپکنا بھول گئی ہو۔ وہ تیمور کو یوں دیکھنے لگی جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جو بات وہ اپنے بھائی سے کہنا چاہتی تھی وہ اس نے خود ہی کہہ دی ہے۔

”کیا ہوا ہے؟ کوئی شاک لگ گیا میری بات سن کر؟“ تیمور نے جب دیکھا کہ نازلی پتھر کی مورنی کی طرح ہو گئی ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے یقین نہیں آرہا کہ آپ نے یہ بات کہی ہے۔“ نازلی خوشی سے لبریز بولی۔

”کیا تمہیں مجھ سے ایسی بات کی کوئی اُمید نہیں تھی؟“ تیمور نے کہا۔ ”تمہاری بھابی کے روپ میں اب اس گھر میں تمہاری ایک دوست آجائے گی۔ جس سے تم اپنے دل کی ہر بات کر سکو گی۔“

نازلی مسکرائی اور شرارت سے بولی۔ ”لیکن پہلے آپ تو اپنے دل کی بات کریں۔“

”کیا مطلب کون سی دل کی بات؟“ تیمور نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”وہی دل کی بات جو آپ کے دل میں ہے۔“ نازلی پھر مسکرائی۔

”میرے دل میں جو بات تھی وہ میں نے کہہ دی۔“ تیمور نے کہا اور اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ نازلی کی بات کو سمجھ نہیں سکا تھا۔

نازلی بھی اٹھ کر اس کے پاس چلی گئی اور بولی۔ ”بھائی..... شادی کا تو آپ نے بتا دیا لیکن جس سے آپ شادی کر رہے ہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

نازلی کی یہ بات سن کر تیمور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ہاں میں نے شادی کا تو سوچ لیا لیکن میں شادی کروں گا کس سے وہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“

”آپ چھپائے مت اور مجھے بتائیں۔“ نازلی ضد کرنے کے انداز میں بولی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں میرے دل میں کوئی بھی لڑکی نہیں ہے۔ دل میں کیا نظر میں بھی نہیں ہے۔“ تیمور نے کہا۔

بولتے ہوئے بھی بہک جاتا تھا۔ بے چاری ڈرتی تھی۔ ایک دن جب جی ایم نے پھر کچھ اُلٹا سیدھا کہا مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے سب کے سامنے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔  
”اور نوکری چلی گئی۔“ تیمور نے اگلی بات اس کی طرف دیکھ کر خود ہی کہہ دی۔  
”ہاں۔“ عشرت نے کہا۔

”میرے خیال میں تو اس بات پر آپ کو انعام ملنا چاہئے تھا۔“ تیمور نے کہا۔  
”یہاں سچ کا انعام تلخیوں میں ہی ملتا ہے۔“ وہ بولی۔

تیمور نے عشرت کو نوکری دے دی تھی۔ عشرت بہت محنتی تھی۔ اس نے بہت جلد اپنی صلاحیت کو سب سے منوالیا تھا۔  
تیمور یک دم بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا اور پھر ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

صبح ناشتے کی میز پر تیمور نے نازلی سے عشرت کے بارے میں اپنا خیال عیاں کیا تو نازلی کو جیسے ایک بار پھر کسی نے مورتی کا روپ دے دیا ہو۔ وہ دو، تین بار عشرت سے مل چکی تھی۔ اُسے عشرت کی عادت اچھی لگتی تھی۔ ایک بار ایک پارٹی ڈنر میں دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا تھا اور بہت سی باتیں بھی کی تھیں۔  
”ونڈرفل۔ کیا انتخاب ہے۔“ نازلی خوش ہو کر بولی۔ ”اب ان سے بات کون کرے گا؟“

”میں کروں گا۔ مجھے کوئی ڈر یا خوف نہیں ہے۔ دو باتیں ہوں گی۔ ہاں ہو جائے گی یا پھر انکار ہو جائے گا۔“ تیمور نے لا پرواہی سے کہا۔

اسی دن دفتر میں جب چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔ تیمور نے عشرت کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ اس کے کہنے پر عشرت اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گئی تھی۔ چند ثانیے تک تیمور اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں بھنسی ہوئی پنسل کے ساتھ کھتا رہا۔ عشرت سوچ رہی تھی کہ تیمور نے اسے اپنے کمرے میں کیوں بلایا ہے اور اگر بلایا ہے تو پھر کوئی بات کیوں نہیں کر رہا ہے۔

تیمور نے پنسل ایک طرف رکھی اور عشرت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کہتے ہیں کچھ باتیں گھما پھیرا کر کرنی چاہئیں لیکن مجھے ایسی عادت نہیں ہے۔ میں سیدھی اور صاف بات کرنے کا عادی ہوں۔ اس لئے جو بات میں تم سے کرنے والا ہوں وہ بھی سیدھی اور صاف ہے۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

عشرت کی توجہ تیمور کے ایک ایک لفظ پر تھی، لیکن جیسے ہی اس نے آخری جملہ ادا کیا اس کا انہماک ٹوٹ گیا، اور اُس نے چونک کر تیمور کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اُسے یقین نہ آیا کہ، تیمور نے کیا وہی کہا ہے جو اس نے سنا ہے؟

”تم میری اس بات کا جواب کل بھی دے سکتی ہو۔ چاہو تو کچھ دن اور بھی لے سکتی ہو۔ میں یہ واضح کر دوں کہ یہ بات میں انتہائی ہوش و حواس سے اور بڑی ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ یہ بات کرنے سے پہلے میں نے اپنا فیصلہ اپنی بہن نازلی کو بھی سنایا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئی تھی۔“ تیمور نے متانت سے کہا اور چپ ہو کر عشرت کی طرف دیکھنے لگا۔  
”کیا مجھے جانے کی اجازت ہے؟“ عشرت نے اپنی نگاہیں تیمور کے چہرے سے ہٹا کر کہا۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ تیمور نے کہا۔

عشرت اُٹھ کر دروازے کی طرف جیسے ہی بڑھی تیمور نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہا۔  
”آفس ٹائم ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ میں نے لمبی اجازت نہیں دی کہ تم کل آؤ ہی نہ۔“

عشرت نے رک کر اس کا یہ بھی جملہ سنا اور پھر اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ تیمور اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جتنی جلدی اس نے بات کی تھی اس کا جواب اُسے اسی رفتار سے نہیں ملا تھا۔ حالانکہ تیمور کو اُمید تھی کہ عشرت جیسی لڑکی ہے، وہ اسی وقت جواب دینے میں کسی تامل سے کام نہیں لے گی لیکن یہ محض اس کی ایک سوچ تھی۔ مشرق کی لڑکی کتنی بھی خود اعتماد ہو، وہ اپنی زندگی کا اہم فیصلہ اکیلے اور فوری نہیں کرتی۔

تیمور اپنی کرسی پر پھر بیٹھ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو بھی اس نے کیا ہے کیا وہ صحیح ہے؟ کیا اس سے عشرت کے اعتماد کو کوئی ٹھیس تو نہیں پہنچی؟ کسی کو باعزت طریقے سے شادی کرنے کی پیشکش کرنا کوئی معیوب بات تو نہیں ہے۔ تیمور ان ہی سوچوں میں اُس کشتی کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا جو سمندر کے بیچ میں ہوتی ہے۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے یقین تھا کہ ابھی عشرت پھر آئے گی۔

ایک دم دروازہ کھلا اور عشرت واقعی واپس آ گئی۔ تیمور کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اور اس نے اُمید بھیرنگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

عشرت نے اپنے کندھے پر اپنا بیگ لٹکایا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ عشرت نے وہ کاغذ تیمور کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ تیمور نے متحیر نگاہوں سے کاغذ کی طرف

دیکھا۔ اسے جلدی جلدی پڑھا اور پہلے سے بھی زیادہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا..... تم نے ریزائن کر دیا؟ میری اتنی سی بات سن کر۔“

”آپ غلطی پر ہیں۔ آپ نے کوئی اتنی سی بات نہیں کہی۔ وہ بہت بڑی بات ہے۔ ایک زندگی دوسرے کے نام کر دینے کی وہ بات بنیاد ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ اتنی سی بات ہے۔“ عشرت نے متانت سے کہا۔

”اگر تمہیں میری بات اچھی نہیں لگی تو تم مجھے انکار کر سکتی تھی۔ یہ ہم دونوں کے بیچ کی بات ہے۔ بات اسی جگہ ختم ہو جاتی۔“ تیمور نے کہا۔

”یہ ایک بڑا شہر ہے۔ میرا گھر یہاں سے کافی دور ہے۔ میں دو بیس بدل کر آتی اور جاتی ہوں۔ میرے گھر میں میری ایک ماں اور ایک بھائی ہے۔ بھائی ایک کمپنی میں ملازم ہے۔ ہم کبھی بھی امیر نہیں تھے۔ میرے ابو بھی ملازم تھے۔ میری ماں چاہتی ہے کہ میری شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ شاید اس لئے کہ وہ بیمار رہتی ہیں۔ انہیں میری بڑی فکر ہے۔“ عشرت نے اسی جگہ کھڑے کھڑے اپنی بات کہنا شروع کی۔ تیمور بڑے انہماک سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ پھر بولی۔ ”جو بات آپ نے ابھی مجھ سے کی اس بارے میں میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ ایسی سوچ مجھے کبھی بھی نہیں آئی تھی۔“

”ایم سوری اگر میری بات سے تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“ تیمور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”الفاظ کمان سے نکلے تیر کی طرح ہوتے ہیں، ایک دفعہ نکل پڑیں تو واپس نہیں ہوتے۔“ عشرت نے کہا۔

”لیکن میں نے جو بھی کہا تھا وہ بڑی سنجیدگی اور ذمہ داری سے کہا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ میں نے بھی کبھی اس بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن اچانک جب میرا ارادہ شادی کے لیے بنا تو میری نظر تم پر جاٹھری۔“ تیمور نے اپنی صفائی بیان کی۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے میں چلتی ہوں۔“ عشرت نے اپنا بیگ کندھے پر ٹھیک کیا اور جانے کے لیے مڑی۔

”پلیز..... تم یہ ریزائن واپس لے لو۔“ تیمور نے استدعا کی۔

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ عشرت نے اپنا چہرہ دوسری طرف رکھے ہی کہا۔

”پلیز.....“ تیمور نے پھر کہا۔

”ایم سوری..... میں شاید اب کہیں بھی نوکری نہ کروں۔“ عشرت کے لہجے میں متانت

تھی اُس نے کہا اور تیمور کی کوئی بات سننے بغیر وہ تیزی سے دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ تیمور اسی جگہ دم بخود کھڑا رہا۔ اسے اُمید نہیں تھی کہ اس کی بات کا انجام عشرت کے ریزائن کی صورت میں ہوگا۔ اسے اپنے آپ پر افسوس ہو رہا تھا۔ دل میں ایک بچھتاوہ سا پیدا ہو گیا تھا۔

دفتر کا سارا شفاف چلا گیا تھا۔ چیز اسی نے تمام کمروں کی روشنیاں بجھا دی تھیں۔ صرف تیمور کا کمرہ روشن تھا۔ چیز اسی اسٹول پر بیٹھا اس انتظار میں تھا کہ کب تیمور اپنے کمرے سے باہر نکلے اور وہ بھی تمام دروازے مقفل کر کے اپنے گھر کی راہ لے۔

تیمور اپنے کمرے سے بوجھل قدموں کے ساتھ باہر نکلا تھا۔ جاتے جاتے رک کر اس نے ایک بار اس سیٹ کی طرف دیکھا جہاں عشرت بیٹھتی تھی۔ اس نے کچھ سوچا اور پھر باہر چلا گیا۔

اس رات تیمور ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا۔ ناشتے کی میز پر نازلی بھی ایک دو بار اس کی خاموشی کی وجہ جاننے کی کوشش کی تھی لیکن تیمور بڑی صفائی کے ساتھ ٹال گیا تھا۔ جب تیمور اپنے دفتر میں گیا تو جاتے ہی سب سے پہلے اس کی نگاہ عشرت کی خالی سیٹ پر پڑی تھی۔ عشرت اس کے آنے سے قبل اس سیٹ پر براجمان ہوتی تھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنی بات کی پکی ننگی ہے۔“ تیمور نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔

سارا دن دفتر میں کام کرتے ہوئے تیمور کو بڑی شدت سے عشرت کی کمی کا احساس رہا تھا۔ دفتر کا وقت ختم ہوتے ہی اُس نے جلدی سے عشرت کی فائل نکالی، اُس نے عشرت کا ’سی دی‘ دیکھا اور اس کا پتہ ایک کاغذ پر نوٹ کرنے کے بعد وہ سیدھا اپنی کار میں بیٹھا اور اس کا رخ عشرت کے گھر کی طرف کر دیا۔ اُس جگہ جا کر وہ پوچھتا ہوا عشرت کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔

تیمور نے نیل دی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ قدموں کی چاپ دروازے کی طرف بڑھی اور پھر رک گئی۔ تیمور کو لگا جیسے کوئی اندر سے دروازے میں لگے شیشے سے دیکھ رہا ہے کہ باہر کون ہے۔ اس نے اپنا چہرہ اور بھی واضح کر دیا۔ پھر دروازہ کھلا اور عشرت کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”السلام علیکم۔“

تیمور کو لگا جیسے وہ اب اپنے دفتر میں پہنچا ہے۔ کیونکہ عشرت اسی انداز میں اُٹھ کر اس کی آمد پر السلام علیکم، کہا کرتی تھی۔ اس کے چہرے پر دن میں پہلی بار مسکراہٹ آئی اور اس نے

اس کے سلام کا جواب دیا۔

”آئیے..... اندر تشریف لے آئیے۔“ عشرت نے دروازہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑی ہوتے ہوئے کہا۔

”شکریہ۔“ تیمور نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

عشرت نے تیمور کو ڈرائیونگ روم میں بٹھا دیا۔ گھر چھوٹا تھا لیکن صاف ستھرا اور پرسکون تھا۔ کمرے کی دیواروں سے اس کی سفیدی کہیں کہیں سے اتر چکی تھی۔

”ایم سوری کہ میں نے یہاں آکر تمہیں تکلیف دی۔“ تیمور نے کہا۔

”کیسی بات کر رہے ہیں آپ۔ مجھے اچھا لگا کہ آپ آئے۔ میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“ عشرت نے مسکرا کر کہا۔

”پلیز اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ تیمور نے روکنا چاہا۔

”میرے سامنے تو آپ یہ نہ کہیں میں جانتی ہوں کہ آپ کودن میں کتنی بار چائے کی ضرورت ہوتی ہے۔“ عشرت نے کہا۔

”یہ بات ٹھیک ہے لیکن میں تمہارا ریزائن تمہارے گھر واپس کرنے کے لیے آیا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔

”آپ تشریف رکھیں، میری امی نے مجھے صبح سے کوئی پچاس بار پوچھا ہے کہ میں آج آفس کیوں نہیں گئی اور میں نے انہیں ہر بار یہی کہا ہے کہ پتہ چل جائے گا میں آفس کیوں نہیں گئی۔“ عشرت نے کہا۔

”تم نے بتایا نہیں تو انہیں کیسے پتہ چل جائے گا کہ تم آفس کیوں نہیں گئی۔“ تیمور نے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ بات آپ انہیں بتائیں گے۔“ عشرت نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں بتاؤں گا؟ کیا بتاؤں؟“ تیمور یک دم حیرت سے چونکا۔

”وہی جو حقیقت ہے۔ مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے اس لئے میں نے امی کو کچھ نہیں بتایا۔“ عشرت نے کہا۔ ”میں چائے تیار کرتی ہوں۔ تب تک امی آپ کے پاس آتی ہیں۔“ عشرت جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی۔ تیمور اس تذبذب میں تھا کہ وہ اس کی امی کو کیا بتائے کہ آج عشرت آفس کیوں نہیں آئی؟ وہ تو محض اسے اس کا ریزائن واپس کرنے کے لیے آیا تھا اور یہ درخواست لے کر آیا تھا کہ وہ اس کا آفس نہیں چھوڑے گی لیکن یہاں تو ماجرا ہی کچھ اور تھا۔ عشرت جاتے جاتے رکی اور بولی۔ ”میں امی کو بھیج رہی ہوں۔“

چھ ہی دیر میں عشرت کی ماں اس کا ہاتھ پکڑے اندر آگئی۔ وہ بیمار رہنے کی وجہ سے لاغر ہو گئی تھی شاید بیٹن رہنے سے یا سوچوں کے انبار میں دھسنے سے عشرت کی ماں زیادہ ہی بوجھل تھی۔ سنی دے رہی تھی۔ عشرت نے اپنی ماں سے تیمور کا تعارف کرایا اور اسے تیمور کے سامنے بٹھانے کے بعد خود باہر نکل گئی۔ اس نے جاتے جاتے ایک دلکش مسکراہٹ تیمور کی طرف منتقل کی تھی۔

پہلے تو عشرت کی ماں، تیمور کا حال چال پوچھتی رہی اور پھر رنجیدہ سی ہو کر بولی۔ ”عشرت ابھی پڑھتی تھی جب اس کا باپ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ عشرت نے اس گھر کو چلانے کے لیے اور اپنے بھائی کی تعلیم مکمل کرانے کے لیے نوکری کر لی۔ اب میرا وہ بیٹا بھی ایک کمپنی میں ملازم ہے۔ عشرت نے اس گھر کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ جب تک میرے بیٹے کو نوکری نہیں مل گئی عشرت نے اپنے لئے آئے ہوئے ہر رشتے کو ٹھکرا دیا۔“ اس کی ماں چپ ہو گئی اور پھر یک دم اس نے تیمور سے سوال کر دیا۔ ”کیا عشرت سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟ کیا آپ نے عشرت کو نوکری سے نکال دیا ہے؟ وہ کبھی چھٹی نہیں کرتی لیکن آج وہ نہ تو آفس گئی اور نہ ہی میرے بار بار پوچھنے پر اس نے کچھ بتایا ہے۔ کیا بات ہے۔“

تیمور اپنے ذہن میں بہت سے جھوٹ سجا کر بیٹھا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب یہ دے گا لیکن جیسے ہی اس کی ماں نے ایک ساتھ کئی سوال کئے تو گھڑے ہوئے جھوٹ ایک ساتھ ذہن سے نکل گئے اور وہ بولا۔ ”عشرت نے خود نوکری چھوڑ دی ہے۔“

”خود نوکری چھوڑ دی ہے؟“ عشرت کی ماں چونکی۔ پھر جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔ ”ہاں میری بات آخر مان ہی لی اس نے۔ میں کہتی تھی کہ اب تمہارا بھائی اتنا کمالیتا ہے کہ اس گھر کا گزارہ عزت سے ہو سکتا ہے۔ تم اب اپنا گھر بسالو۔ شاید میری بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔“

”دراصل میں نے کل عشرت کو شادی کی پیشکش کی تھی۔“ تیمور نے کسی تردد کے بغیر کہا۔ یہ بات سنتے ہی عشرت کی ماں جیسے سکتے میں آگئی ہو۔ اس کی نگاہیں تیمور کے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ مرجھائے ہوئے اور سوچوں کے صحرا میں سرگرداں چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آئی۔ بے یقینی کی کیفیت اس کی نگاہوں سے جھانکنے لگی تھی لیکن عشرت کی ماں کو یقین کرنا پڑا کہ تیمور جو کہہ رہا ہے اس نے وہی سنا ہے۔ کیونکہ تیمور نے اس بار عشرت کی ماں کا بوڑھا ہاتھ پکڑ کر عشرت کے لیے استدعا کی تھی۔

اسی اثنا میں عشرت ایک ٹرے اٹھائے اندر آگئی۔ اس ٹرے میں کھانے پینے کا بہت سا

سامان تھا۔ اُس نے چائے کا کپ تیسور کو دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس لئے ریزائن کیا تھا۔“

تیسور اس گھر سے جب رخصت ہوا تو وہ خوشی سے جھوم رہا تھا۔ عشرت کو اپنی شریک حیات منتخب کرنے پر فخر ہو رہا تھا۔ اس نے یہ اطلاع جاتے ہوئے گاڑی سے ہی فون کر کے نازی کو دی، تو نازی یوں خوشی سے اُچھلی جیسے اس کے ہاتھ کوئی خزانہ لگ گیا ہو۔ وہ تیسور کی بات سن کر پھولے نہیں سمار ہی تھی۔ جیسے ہی تیسور نے رابطہ منقطع کیا، نازی نے اپنے سامنے بیٹھے ایاز احمد کی طرف دیکھا۔ ایاز کی نگاہیں نازی کے چہرے کی خوشی سے اصل بات کا نقاب ہٹانے کی سعی میں تھیں۔

ایاز احمد ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا باپ اور اس کے دو بڑے بھائی ملک سے باہر رہائش پذیر تھے۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ ایک بنگلہ نما گھر اس شہر میں تھا۔ جہاں وہ اپنی ماں اور تین بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ کالج میں پڑھتا تھا، لیکن کسی ڈگری کا خواہش مند نہیں تھا۔ اسے اس جگہ کہیں بھی نوکری نہیں کرنی تھی۔ بیرون ملک میں ان کا اپنا بزنس تھا۔ وہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ کئی بار وہاں گیا تھا۔ آنے والے وقت میں ان سب کا اس ملک میں مکمل منتقل ہو جانے کا ارادہ تھا۔ ایاز نے یہی نازی کو بتایا تھا۔

نازی اور ایاز ایک دوسرے کو چھ، سات ماہ سے جانتے تھے۔ ان کی دوستی انٹرنیٹ پر ہوئی تھی۔ وہ دوستی اب محبت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایاز نے کبھی نازی کو اپنی فیملی سے تو نہیں ملوایا تھا لیکن اس نے تصویروں کے ذریعے سے اپنی فیملی کے ہر فرد کا تعارف اس سے ضرور کرادیا تھا۔

نازی کو ایاز کی یہ بات بہت پسند تھی کہ اتنی دولت ہونے کے باوجود جبکہ اس کے باپ کی بھی نگرانی اس پر نہیں ہے، وہ بگڑا ہوا دولت مند نہیں تھا۔ وہ اچھا بولتا تھا۔ اس کی گفتگو بھی ہوئی، اور شفاف ہوتی تھی۔

اس وقت دونوں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایاز نے نازی کے چہرے پر اتنی خوشی دیکھی تو پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”بھائی شادی کر رہے ہیں۔“ نازی نے بتایا۔ ”انہوں نے جوڑی کی اپنے لئے پسند کی تھی اسے ابھی پر پوز بھی کر دیا ہے اور ہاں بھی ہو گئی ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ کم از کم اب تم اپنے دل کی بات تو کسی سے کہہ سکو گی۔ اب تمہارے دل میں کوئی ڈر یا خوف تو نہیں ہوگا۔“ ایاز نے کہا۔ اس کی نگاہیں نازی کے کھلے

ہوئے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”ایک ہفتہ کے بعد میرے ایگرام شروع ہو رہے ہیں۔ تب تک بھائی کی شادی بھی ہو جائے گی اور مجھے اظہار کا موقع بھی مل جائے گا۔“ نازی نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”ایک بات بتاؤ اگر تمہارے بھائی صاحب اپنی شادی کا نہ سوچتے تو کیا تم ان سے میرے بارے میں بات کرتی؟“ ایاز نے پوچھا۔

”شاید میں نہ کر پاتی۔“ نازی نے بلاتامل جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ میری کہانی کا دی اینڈ اسی جگہ ہو جاتا جہاں تمہارے بھائی کا فیصلہ آ جاتا۔“ ایاز نے پریشان ہو کر کہا۔

”لیکن اب پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔“ نازی نے کہا۔

”تھینکس گاڈ کہ بھائی جان کے دل میں پہلے اپنی شادی کا خیال آ گیا ورنہ میں تو مجنوں کے گروپ میں اضافے کا باعث بن جاتا۔“ ایاز نے مسکرا کر کہا۔ ”اور صحرا صحرا خاک چھانتا۔“

”صحرا میں خاک نہیں ہوتی ریت ہوتی ہے۔“ نازی نے فوراً کہا۔

”ریت اور خاک میں کوئی فرق ہوتا ہے؟“ ایاز نے پوچھا۔

”کیا میں کسی کلاس روم میں بیٹھی ہوں؟ چھوڑو ان باتوں کو کوئی اور بات کرو۔“ نازی نے مسکرا کر کہا۔ وہ اس بات سے جیسے جڑی لگی تھی۔

”اور بات یہ ہے کہ کب ملواری ہو اپنے بھائی سے؟“ ایاز نے پوچھا۔

”ابھی چلیں؟“ نازی نے اسے گھورا۔

ایاز ہنس پڑا۔ ”ارے تم تو غصے میں آ گئی ہو۔ میں تمہارے لئے کچھ کھانے کے لئے منگواتا ہوں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے بہت دیر ہو گئی ہے مجھے اب گھر جانا ہوگا۔“ نازی نے کہا۔

دونوں اس ریسٹورنٹ سے باہر نکلتے ہی الگ الگ ہو گئے تھے۔

تیسور اپنی عشرت کے گھر والوں کو جلد شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ تیسور بھی یہ چاہتا تھا کہ اس کی شادی نازی کے امتحان سے قبل ہو جائے۔ وہ اپنی شادی دھوم دھام سے کرنے کا خواہش مند نہیں تھا۔ چنانچہ ایک سادہ تقریب میں چند قریبی دوست اور رشتہ داروں



کی موجودی میں تیمور نے عشرت کے ساتھ شادی کر لی۔

عشرت کاروبار میں ہی اچھی سوجھ بوجھ نہیں رکھتی تھی بلکہ وہ گھرداری میں بھی سلیقہ شعار، سمجھ دار اور ہر امور میں ماہر تھی۔ چند دنوں میں ہی اس نے ناصر سے یہ کہ تیمور کا دل تسخیر کر لیا بلکہ نازی کے ساتھ بھی اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ نازی امتحان میں مصروف ہو گئی تھی۔ تیمور اپنے کاروبار میں لگ گیا تھا جبکہ عشرت ایک گھریلو خاتون کے روپ میں اپنا کردار بخوبی نبھا رہی تھی۔ زندگی پہلے سے بھی اچھی اور خوبصورت ہو گئی تھی۔ دن گزرتے گئے۔ نازی اپنے امتحان سے فارغ ہو گئی تھی، اور وہ عشرت کے اور قریب ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

اُس دن تیمور اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔

سہ پہر کے ساڑھے چار بج رہے تھے کہ انٹر کام پر اسے اطلاع دی گئی کہ، سکندر نام کا کوئی شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ کسی کنسٹرکشن کمپنی سے آیا ہے۔ تیمور اس سے پہلے کبھی اس نام کے شخص سے نہیں ملا تھا جو کنسٹرکشن کمپنی سے تھا۔ اس نے اس شخص کو اندر بلا لیا۔

وہ دو آدمی تھے۔ آگے والے آدمی نے سفید کلف لگا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال چھوٹے، چہرے پر بڑی مونچھیں اور بڑھی ہوئی شیو تھی۔ دائیں کان کے نو سے پیچھے گردن کی طرف جاتا ہوا زخم کا نشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور قد ٹکٹا ہوا تیمور کے برابر ہی تھا۔ جبکہ اس کے پیچھے والا آدمی بھی تقریباً اسی جیسا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس نے کالی پینٹ پہنی ہوئی تھی اور اس کی شرٹ پینٹ کے اندر نہیں تھی۔

تیمور نے دونوں کا جائزہ لیا۔ آگے والے آدمی نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے سکندر کہتے ہیں اور یہ ناصر ہے۔“

تیمور نے اس سے مصافحہ کرنے کے بعد کہا۔ ”تشریف رکھیں۔“

دونوں اس کے سامنے والی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ تیمور نے پھر پوچھا۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں ہم یہاں اپنی خدمت کرانے کے لیے تھوڑی آئے ہیں۔ دیے آپ پہلے مجھے جانتے ہیں؟“ سکندر نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں... میری آپ سے پہلی ملاقات ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”میرا کوئی تعارف تو ہوگا...؟ جسے غائبانہ تعارف کہتے ہیں۔“ اس نے اپنی گردن نکال

کر کہا۔

”نہیں.....“ تیمور نے بلاتامل نفی میں گردن ہلا دی۔

”سمال ہے مجھے سارا شہر جانتا ہے اور آپ ہیں کہ جانتے ہی نہیں ہیں۔“ سکندر نے سر ہار کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ اپنے بزنس میں ہی زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ دو اور دو پانچ کرنے کے چکر میں لگے رہتے ہیں۔“

”بہتر ہے کہ آپ کام کی بات کریں۔“ تیمور نے کہا۔

”میرا نام سکندر حیات ہے۔ سب مجھے جانتے ہیں۔ شریفوں سے زیادہ پولیس والے اور پولیس سے زیادہ غنڈے لوگ۔“ اس کے لہجے میں تغیر آ گیا تھا۔ پہلے جو دوستانہ سا رویہ تھا اس کی جگہ درشت لہجے نے لے لی تھی۔ ”میں ہر طرح کے کام کرتا ہوں۔ جائز اور ناجائز۔ کوئی بھی میری خدمت لے سکتا ہے۔ پیسہ لیتا ہوں اور کام کرتا ہوں۔ خواہ قتل ہو یا اغوا، کچھ بھی۔“

تیمور نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر پیوست کی ہوئی تھیں۔ ”مجھے ان باتوں سے کچھ نہیں لینا دینا۔ جس کام کے لیے آپ آئے ہیں وہ بات کریں۔“

سکندر نے گردن موڑ کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ شاید اس کی دانست میں تھا کہ سینکڑوں کاروباری لوگوں کی طرح تیمور بھی اس کے اس تعارف سے مرعوب ہو کر ایک بار اپنے ماتھے پر رومال ضرور رکھے گا۔

سکندر نے پھر تیمور کی طرف دیکھا، اور بولا۔ ”کام کی بات یہ ہے کہ آپ نے جو ابھی جے کے کمپنی کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے اُس سے آپ دستبردار ہو جائیں۔ دوسرا نمبر ہمارا ہے۔ آپ کے ہٹ جانے سے وہ ہم سے معاہدہ کر لیں گے اور ہم یہ ہی چاہتے ہیں۔“

”کیوں؟“ تیمور نے اس کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر کہا۔

”کیونکہ جو ایسا چاہتا ہے میں اُس سے پیسے لے کر آپ سے ویسا ہی کرانا چاہتا ہوں۔“ سکندر نے کہا۔ ”آپ اس معاہدے سے پیچھے ہٹ جائیں۔“

”کون ہے وہ؟“ تیمور نے اطمینان سے پوچھا۔

”جو کوئی بھی ہے۔ اس سے آپ کا کوئی سروکار نہیں ہے اور یہ بات میرے دھندے کے خلاف ہے۔“ سکندر نے کہا۔

”اگر میں تمہاری بات کا انکار کر دوں تو؟“ تیمور جو اس کے ساتھ عزت سے پیش آرہا تھا، وہ بھی اپنے لہجے میں تغیر لے آیا تھا۔

سکندر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”پھر مجھ سے کسی بھی اچھے انجام کی امید کرنا بے قونی ہوگی۔“

تیور نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”پھر سن لو۔ میں وہ معاہدہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ وہ معاہدہ نہیں چھوڑوں گا اور تم اس جگہ سے عزت کے ساتھ باہر چلے جاؤ ورنہ وہ ہو جائے گا جو کبھی تم نے شاید خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔“

تیور کا لہجہ دھیما اور ایسا تھا کہ سکندر ایک لمحے کے لیے تو دم بخود رہ گیا۔ آج تک اس کے ساتھ کسی نے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی اور اس کا تعارف سننے کے بعد کسی کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ کوئی اسے انکار کر سکے۔ اس طرح سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔

سکندر کے ساتھ بیٹھے ہوئے ناصر نے ایک نظر تیور کی طرف دیکھ کر پہلی بار زبان کھولتے ہوئے کہا۔ ”یہ کچھ زیادہ نہیں بول گیا۔“

”بولنے دو۔ ان کا حق بنتا ہے کہ یہ بھی بولیں۔“ سکندر نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

”لیکن ہمارے سامنے؟“ ناصر نے آنکھیں نکالیں۔

”ایک بات یاد رکھو یہ میرا آفس ہے۔ میں یہاں کسی کی اونچی آواز برداشت نہیں کرتا۔ جاؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔“ تیور نے جیسے ان کو سمجھایا ہو۔

”اور ہمیں انکار سننے کی عادت نہیں ہے۔“ ناصر نے اپنی گردن نکال کر دانت پیس کر کہا۔

”ناصر..... تم کیوں غصہ ہو رہے ہو۔ ہم ان سے لڑنے کے لیے تھوڑی آئے ہیں۔ ہم بات کرنے کے لیے آئے ہیں۔“ سکندر نے ناصر کو نرمی سے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”تم دونوں جو بھی ہواب یہاں سے چلے جاؤ۔“ تیور نے کہا۔

”دیکھیں آپ اس کی بات کا برا نہ منائیں۔ یہ جلد جذبات میں آجاتا ہے۔ بات سیدھی اور سادہ ہے۔ وہ معاہدہ ہمارا ایک دوست اُن سے کرنا چاہتا ہے۔ اگر آپ کے ریٹ کچھ کم نہ ہوتے تو وہ معاہدہ ہمارے ساتھ ہو جاتا لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب بھائی چارے سے آپ ہماری بات مان لیں۔“ سکندر نے بڑھے دھیمے لہجے میں کہا۔

”میں ایسا نہیں کروں گا۔“ تیور نے دو ٹوک انداز میں ایک ایک لفظ پر رک کر کہا۔

”ایسا آپ کو کرنا ہوگا۔“ سکندر نے بھی اپنے لہجے میں ایک بار پھر تغیر لاتے ہوئے اسی

انداز میں کہا۔

”تم دونوں اس جگہ سے عزت کے ساتھ جانا پسند کرو گے یا میں وہ طریقہ اختیار کروں جو شاید تم دونوں کو پسند نہ آئے۔“ تیور نے دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

ناصر پھر ہڑک اٹھا۔ ”کیا کر سکتے ہو تم؟“

”میں جو کر سکتا ہوں وہ بتاتا نہیں ہوں۔ صرف کرتا ہوں۔“ تیور کے چہرے پر کوئی خوف نہیں تھا۔

”ایسی باتوں کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔“ ناصر نے کہا۔

”تم نے شاید سنا نہیں کہ میں باتیں نہیں کرتا۔“ تیور نے پہلی بار قدرے غصے سے کہا۔

ناصر غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہم نے آج تک کسی کی کوئی بات نہیں سنی اور پھر اس انداز میں جس طرح تم بول رہے ہو۔“

”ناصر..... تم بیٹھ جاؤ۔“ سکندر نے اس کا بازو پکڑ کر نیچے کی طرف کھینچا۔

”بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ ناصر ایک بار پھر بیٹھ گیا۔ اس کی

سانس غصے سے پھولی ہوئی تھی۔

”تم چپ رہو اور اب میں بات کروں گا۔ تم سچ میں نہیں بولو گے۔“ سکندر نے اسے

سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بہتر ہے کہ تم بھی بات نہ کرو اور جو تم یہ ڈرامہ کر رہے ہو اس سے میں واقف ہوں۔

مجھ پر کوئی دھمکی اور دھونس موثر نہیں ہوگی۔“ تیور نے کہا۔ ”ایک بار نہیں ہزار بار کہتا ہوں کہ

نہ میں تم دونوں سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی وہ ہوگا جو تم چاہتے ہو۔“

سکندر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا اصول ہے کہ میں پہلی بار صرف بات

کرتا ہوں۔ آپ سوچ لو۔ اگلی ملاقات میں ہاں یا ناں کی صورت میں، میں کوئی بھی قدم

اٹھانے پر مجبور ہوں گا۔“

”دوبارہ آنے کی غلطی مت کرنا۔“ تیور نے کہا۔ ”اس ملاقات کو پہلی اور آخری

ملاقات سمجھ کر یہاں سے چلے جاؤ۔“

سکندر جو اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا اسی جگہ رک کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ

غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ جو لوگ سکندر کو جانتے تھے۔ ان کے علم میں تھا کہ وہ ایک خطرناک

شخص ہے۔ اس کے دل میں سفاکی بھری ہوئی ہے۔ وہ ایک لمحے میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔

علاوے میں اس کا نام دہشت کی علامت ہے۔

”تم مجھے جانتے نہیں ہو اس لئے ایسی بات کر رہے ہو۔ سارے کلب کا میں مالک ہوں۔

وہی میرا ڈیرہ ہے۔ پہلے میرے بارے میں پوچھ لو اس کے بعد کوئی فیصلہ کرنا۔“ اس بار سکندر نے پہلے سے بھی زیادہ درشت لہجے میں دانت پس کر ایک ایک لفظ کو چبا کر کہا۔  
”اگر میں تمہیں جانتا ہوتا تو میں تمہارے ساتھ اس سے بھی زیادہ سختی سے پیش آتا۔“  
تیمور نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔

وہ دونوں اس کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ تیمور کی اس بات نے سکندر کو اور بھی سخ پا کر دیا تھا لیکن وہ ابھی کوئی ہنگامہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تیمور کو سوچنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ اس نے اس کام کے لیے اچھی خاصی رقم لی تھی، وہ اپنے اصول کے مطابق کام کرنا چاہتا تھا۔ معاملہ چھوٹا ہوتا تو شاید وہ کچھ بھی کر گزرتا۔

”میں جا رہا ہوں لیکن یاد رکھنا اگلی بار جب بھی میں آیا تو پھر انکار کی صورت میں شاید تم یہ کاروبار کرنے کے قابل نہ ہو۔“ سکندر نے کہا۔ ”اچھے بچے کی طرح میری بات مان لیتا۔“  
”میں کاروباری لوگوں کے ساتھ کاروباری ہوں اور تم جیسوں کے لیے میں وہ زہر ہوں کہ مجھے چھوٹے سے بھی زندگی کی سانسیں تمہارے جسم کے ساتھ جڑی نہیں رہیں گی۔“  
تیمور کو اس بار غصہ کچھ زیادہ ہی آ گیا تھا اس نے اپنی شہادت کی انگلی اس کی طرف کر کے کہا۔  
”اس لئے کوئی ایسی غلطی نہ کرنا کہ تمہیں پچھتانے کا بھی موقع نہ ملے۔“

سکندر کو اپنی رگوں میں آگ دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے دفتر میں وہ کسی اسلحے کے بغیر آیا تھا۔ نیچے اس کی جیب میں موجود اس کے دو آدمیوں کے پاس اسلحہ تھا۔ ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی اس کے سینے پر گولی مادے لیکن کچھ کرنے کو روکنے کے لیے دو باتیں مانع تھیں، ایک اس کا پہلی ملاقات کا اصول جس میں وہ محض اپنی بات سے آگاہ کرتا تھا اور دوسری بات یہ کہ اس نے ہماری رقم لی تھی۔ وہ یہ کام اپنے طریقے سے کرنا چاہتا تھا۔

سکندر نے مزید کوئی بات نہیں کی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ تیمور نے ایک گلاس پانی تین گھونٹ لے کر اپنی کرسی پر براجمان ہو کر پیا، اور اس بات کو اپنے اوپر غالب کرنے کی بجائے ایک طرف ذہن کے کسی گوشے میں رکھ دیا۔

تیمور نے کچھ دیر بعد اختر کو اندر بلا لیا اور اُس سے پوچھا۔ ”جے کے کمپنی کو جو ہم نے ٹینڈر بھیجا تھا، ہمارے بعد میں کس کے ریٹ آتے تھے؟“

”ایک ہی تو کمپنی ہے جسے ہماری جگہ لینے کی بہت فکر ہے۔“ اختر نے کہا۔  
”کون؟“ تیمور نے اس کی طرف دیکھا۔

”فیوچر گروپ۔“ اختر نے بتایا۔

تیمور نے کچھ دیر سوچا۔ ”کون ہے بھلا اس کا سربراہ؟“  
”اس کا نام مسٹر ظلیل ناز والا ہے لیکن آج کل اس کا بیٹا رضوان سارے کاروبار کی دیکھ بھال کرتا ہے۔“ اختر نے بتایا۔

”کبھی تم اس سے ملے ہو؟“ تیمور نے پوچھا۔

”کبھی ملاقات نہیں ہوئی سر۔“ اختر نے کہا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ تیمور نے کہا اور اختر باہر نکل گیا۔ تیمور نے سوچا اس کا مطلب ہے کہ اس کے پیچھے رضوان ہے۔

تیمور نے سکندر کا کئی بار ذکر سنا تھا۔ وہ کیا کرتا ہے اس کا ٹھکانہ کہاں ہے، وہ اس کے بارے میں جانتا تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر یہ سب ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں سکندر کا کوئی خوف پیدا نہیں ہوا تھا۔

سکندر اپنی جیب میں بیٹھ گیا تھا۔ ناصر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”تم تو کہتے تھے کہ تم نے اس کے بارے میں مکمل تحقیق کی ہے۔ اس کا واسطہ صرف کاروباری لوگوں کے ساتھ ہے۔ اس کا تعلق کسی کے ساتھ بھی ایسا نہیں ہے کہ یہ بندہ ہمارے لئے خطرہ بن سکے۔ ایک دھمکی پر یہ پیچھے ہٹ جائے گا۔ پھر اس کے بولنے کا انداز اور ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا کیا تھا؟“

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ آخر وہ کس کے بل بوتے پر بول رہا تھا۔“ سکندر سوچتے ہوئے بولا۔

”ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔ یہ تمہیں جانتا ہی نہیں ہے۔“ ناصر نے کہا۔ ”بالکل بھی نہیں جانتا۔ بہت کاروباری ہے۔“

”پھر بھی کوئی کسی کے دفتر میں جا کر ایسی بات کہے اور سننے والے کے ماتھے پر پسینہ نہ آئے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟“ سکندر نے کہا۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔ ”اس جیسے تو ہم جیسوں کو دیکھتے ہی پسینے کی پھوار میں نہا جاتے ہیں لیکن اس کے ماتھے پر تو کوئی سلوٹ نہیں آئی۔“

”اب کیا ارادہ ہے؟“ ناصر نے اس کی طرف دیکھا۔

”اسے میں تین دن سوچنے کے لیے دوں گا۔“ سکندر نے کہا۔

”تین دن کیوں؟ کل چلتے ہیں مانتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اسی کے دفتر میں مار دیں گے۔“ ناصر نے سخ پا ہو کر کہا۔

”نہیں..... تین دن میں اسے اس لئے دے رہا ہوں کہ اگر وہ مجھے نہیں جانتا تو جان

لے۔ ہمیں اپنی بات منوانے میں آسانی ہو جائے گی۔ اس کے بعد اس کا ایسا حال کروں گا کہ اس جیسے جو مجھے نہیں جانتے وہ بھی اس کی وجہ سے جانے لگے گے۔“ سکندر نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”بڑی مشکل سے میں نے اس کی باتوں کو اس کے سامنے بیٹھ کر برداشت کیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ میرے اندر برداشت کرنے کی اتنی طاقت نہیں ہے۔“

☆=====☆=====☆

دن دے پاؤں شام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ پرندے آسمان کی بلندیوں پر اڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایاز ایک چمک دار کار کو پارک کرنے کے بعد اس سے باہر نکلا۔ اس نے پہلے گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا اور پھر سامنے لائبریری کی طرف بڑھ گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس دن بھی وہ اپنے لباس اور پروقاری چال سے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

لائبریری کے اندر جا کر اس نے متلاشی نگاہوں سے دیکھا ایک کرسی پر اپنے سامنے ضخیم کتاب کھولے نازلی براجمان تھی۔ ایاز اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ نازلی کتاب پڑھنے میں اس قدر محو تھی کہ اسے ایاز کی آمد کا پتہ ہی نہ چلا تھا۔ ایاز نے آہستہ سے اپنا گلا صاف کیا تو نازلی نے ایک نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور ہلکے تبسم کے بعد کتاب بند کی، اسے اس کی جگہ پر رکھا اور لائبریری سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد ایاز بھی باہر نکل گیا۔

لائبریری کے باہر چھوٹا سا باغچہ تھا۔ اس میں ایک طرف چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے کو ایک گھنے درخت نے اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا۔ نازلی اس چبوترے کی گھاس پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایاز بھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

”میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم اتنی دیر سے آئے ہو۔“ نازلی نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔

”ڈیڈی کا فون بار بار آرہا تھا۔“ ایاز نے کہا۔

”بار بار کیوں آرہا تھا۔“ نازلی نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”تم بتاؤ تم نے اپنے گھریات کی؟“ ایاز نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے

سوال کر دیا۔

”ابھی نہیں کی۔“ نازلی نے ڈھیلے انداز میں کہا۔

”تو کب کرو گی بات؟“ ایاز نے دھیمے لہجے میں مضطرب ہو کر کہا۔ ”جانتی ہو اب

وقت ضائع کرنے کا مطلب کیا ہے؟ ہم دونوں ایک دوسرے کو کھودیں گے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ نازلی نے اس کی طرف پھر دیکھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ جانتی ہو ڈیڈی کا فون کیوں آرہا تھا۔ اس لئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی ماہ کینیڈا میں منتقل ہو جائیں۔ ممانے تو ہاں بھی کر دی ہے۔ وہاں ڈیڈی نے میرے لئے ایک لڑکی بھی دیکھ رکھی ہے۔ وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ ایاز نے بتایا۔

”پھر تم نے کیا کہا؟“ نازلی پریشان ہو گئی۔

”میں نے ان سے کچھ سوچنے کا وقت مانگا۔ ڈیڈی نے پھر فون کیا کہ تم سوچنے کے لیے کیوں وقت مانگ رہے ہو۔ میں نے ٹالنا چاہا لیکن وہ یہ جاننے کے لیے مُصر رہے اور انہوں نے پھر مجھے فون کیا۔“ ایاز کے چہرے سے پریشانی اور بے چینی مترشح تھی۔

”پھر کیا ہوا؟“ نازلی نے جلدی سے پوچھا۔

”میں نے ڈیڈی سے کہا کہ اگر آپ میری شادی اسی ملک کی ایک لڑکی سے کر دیں تو؟ ڈیڈی نے پوچھا وہ کون ہے۔ اگر تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ مما بھی اس بات پر خوش ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم اپنی بہو کو اپنے ساتھ کینیڈا میں لے جائیں گے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ وہ لڑکی کون ہے۔“ ایاز بتا رہا تھا۔

جیسے ہی کچھ دیر کے لیے ایاز چپ ہوا۔ نازلی نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ ”پھر تم نے میرے بارے میں بتایا؟“

”کیسے بتاتا۔“ ایاز نے کہا۔

”کیسے بتاتا مطلب؟“ نازلی نے پوچھا۔

”تم نے ابھی اپنے گھریات کی نہیں ہے اور میں پہلے کیسے بتا دوں ان کو۔ یہ کیا کم ہے کہ میں نے اپنے دل کی بات تو کہہ دی ہے۔“ ایاز نے کہا۔

نازلی چپ ہو کر سوچنے لگی۔ اس کے چہرے پر گہری متانت آگئی تھی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ایاز۔ میں ہی دیر کر رہی ہوں۔“

”اب دیر مت کرو اور بات کرو۔“ ایاز نے زور دے کر کہا۔

”میں آج ہی بات کروں گی۔“ نازلی نے کہا۔

”یہ ہوئی ناں بات۔“ ایاز خوش ہو کر بولا۔

اس کے بعد وہ دونوں قریب ہی چاٹ کھانے کے لیے چلے گئے۔ رخصت ہونے سے قبل ایاز نے کہا۔

”ایک بات اور کہنی تھی تم سے۔“

”وہ کیا؟“ نازلی نے پوچھا۔

”اگر تمہارے بھیا جان راضی ہو جاتے ہیں اور مجھ سے، میری فیملی کے ساتھ فوری ملنا چاہتے ہیں تو بھلا کیا کرنا ہوگا؟“ ایاز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا کرنا ہوگا؟“ نازلی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

”پہلے میں تمہارے بھائی جان سے ملوں گا۔ اس کے بعد اپنی فیملی سے ملواؤں گا۔“ ایاز نے کہا۔

”پہلے تم کیوں ملو گے؟ اپنی فیملی سے ملو ادیتا۔“ نازلی نے فوراً کہا۔

”پہلے وہ میرا تو انٹرویو کر لیں۔ پاس کریں گے تو میں آگے بھی ملواؤں گا۔ فیل کر دیا تو کہانی تو اسی جگہ ختم ہو جائے گی۔“ ایاز نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

نازلی سوچنے لگی۔ اس کے چہرے پر گہری متانت آگئی۔ ایاز نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ نازلی مجھ سے انداز میں بولی۔ ”ایاز اگر بھیا نے انکار کر دیا تو؟“

”تمہیں یقین ہے کہ وہ انکار کر دیں گے؟“ ایاز نے سوال کر دیا۔

”میرا دل کہتا ہے کہ نہیں۔ وہ انکار نہیں کریں گے۔ انہیں میری خوشی عزیز ہے۔“ نازلی نے کہا۔

”تو پھر ڈرنے یا گھبرانے کی کیا بات ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”لیکن اگر وہ ہو گیا جو ہم نے سوچا نہیں ہے تو پھر کیا ہوگا؟ ہماری راہیں الگ الگ ہو جائیں گی؟“ نازلی کو اچانک اندیشے نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

”میں ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں۔ مجھ میں سگریٹ پینے کی برائی نہیں ہے۔ ہمارا بزنس ہے۔ پیسہ ہے۔ جائیداد ہے۔ ایک لڑکے میں اتنی خوبیاں ہیں بھلا انکار کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔“ ایاز نے اسے اطمینان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

ناولی کو اس کی بات سن کر کچھ سکون ہوا تھا۔ اس کے دل پر جانے کی طرح چھائے ہوئے اندیشے کو جیسے تیز ہوا اپنے ساتھ اڑا کر لے گئی ہو۔ وہ مسکرا پڑی۔ ”ہاں انکار نہیں ہوگا۔ بھائی جان فوراً مان جائیں گے۔“

”ہاں... اور ایسا تم سوچنا بھی مت کہ ہمارے ساتھ کچھ غلط ہوگا۔“ ایاز نے ایک بار پھر مضبوط اور پُر یقین لہجے میں کہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ”بائے“ کہا اور اپنے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔

اسی رات کھانے کے بعد نازلی نے عشرت کو ایاز کے بارے میں سب بتا دیا۔ وہ بات

تیور تک جا پہنچی۔

تیور نے ساری بات اطمینان سے سننے کے بعد عشرت کی طرف دیکھتے ہوئے متانت سے کہا۔ ”میں دراصل نازلی پر اپنی مرضی ٹھونسنا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ اس کی شادی بہت پہلے کر دیتا۔ اچھا کیا کہ اس نے اپنے دل کی بات تم سے کہہ دی۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں۔“

”پہلے ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ وہ لڑکا واقعی ہماری نازلی کے قابل ہے۔“ عشرت نے کہا۔

”ہاں تم نے میرے دل کی بات کہی ہے۔“ تیور نے کہا۔ ”کیا خیال ہے کہ پہلے میں اس لڑکے کے ساتھ ملاقات کروں۔“

”ہونا تو ایسا ہی چاہئے۔“ عشرت نے فوراً اس کی بات کی تائید کی۔

”کہاں ملوں اس سے؟“ تیور نے پوچھا۔

”آپ واقعی کچھ نہیں جانتے یا میرا امتحان لے رہے ہیں؟“ عشرت نے مسکرا کر پوچھا۔

تیور بھی مسکرایا۔ ”میں اس موقع پر واقعی کنفیوز ہو گیا ہوں۔“

”میں نازلی سے بات کروں گی صبح۔ وہ اسے کہہ دے گی کہ وہ آپ سے دفتر میں مل لے۔ کیا وقت دوں؟“ عشرت نے کہا۔

”تم چار بجے کا وقت دے دو۔ چائے کے دوران بات بھی ہو جائے گی۔“ تیور نے سوچ کر کہا۔

☆=====☆=====☆

ٹھیک چار بجے ایاز نے تیور کے کمرے میں قدم رکھا تو تیور نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر دوسری نظر گھڑی کی طرف مبدول کی تو اسے اس کا وقت پر آنا اچھا لگا۔ دونوں نے گرم جوش سے ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ دونوں کمرے میں ایک طرف رکھے صوفے کی طرف بڑھ گئے۔ تیور نے چائے کے ساتھ کچھ کھانے پینے کا سامان لانے کا حکم دیا اور یہ بھی کہا، کوئی کال اور کوئی ملاقات اس وقت نہ کرائی جائے۔

تیور نے ایاز کا گہری نگاہوں سے جائزہ لیا۔ اس نے بغیر سلوٹ کے شرٹ اور پینٹ زیب تن کی ہوئی تھی۔ سر کے بال چھوٹے اور اس انداز کے تھے کہ جیسے وہ فوج میں بھرتی ہو۔ پاؤں میں جوتے پالش کئے ہوئے تھے۔

تیور نے بات کا آغاز کیا۔ ”ہم آزاد خیال لوگ نہیں ہیں لیکن میرے گھر کی چار دیواری میں اظہار پر کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ اظہار کو قید کی دیواروں میں چن دینا میرا

خیال ہے کہ بڑے نقصان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے نازی کو موقع دیا کہ وہ اپنے دل کی بات ہم سے کرے۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہاں بلایا۔“ ایاز نے کہا۔

اس کے بعد تیمور نے اس کا باقاعدہ ایک انٹرویو شروع کر دیا۔ ایاز اس کے ہر سوال کا بڑے تحمل سے جواب دے رہا تھا۔ کسی بھی سوال پر اس کے چہرے پر ناگوار تاثرات کی کوئی سلوٹ دکھائی نہیں دی تھی۔

”اگر میں آپ کی فیملی سے ملنا چاہوں تو؟“ تیمور نے پوچھا۔

”آپ جب چاہیں مل سکتے ہیں لیکن اس ہفتے نہیں۔“ ایاز نے جواب دیا۔

”اس ہفتے کیوں نہیں؟“ تیمور نے پوچھا۔

”دراصل ہم سب کینیڈا شفٹ ہو رہے ہیں۔ میری ایک خالہ اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ ویزے اور پاسپورٹ کے معاملات تھے۔ امی، بہنوں کے ساتھ اسلام آباد پہنچی گئی ہیں۔ وہاں خالہ کے گھر بٹھے بھی ہو جائے گا اور جانے کے لیے کاغذات کی تیاری بھی مکمل ہو جائے گی۔“ ایاز نے بڑے تحمل اور سلیقے سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم ان سے اگلے ہفتے ملاقات کر لیں گے۔“ تیمور نے کہا۔

”یقیناً میں امی کو اطلاع کر دوں گا۔“ ایاز نے کہا۔ ”کیا اب مجھے جانے کی اجازت ہے؟“

”ہاں... میں نے بہت وقت لے لیا اور باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔“ تیمور نے گھڑی دیکھی تو مسکرا کر بولا۔

دونوں نے گرم جوشی سے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا اور ایاز وہاں سے رخصت ہو گیا۔ تیمور کو ایاز اچھا لگا تھا۔ سب سے زیادہ اسے ایاز کے انداز گفتگو نے متاثر کیا تھا۔ تیمور نے اس سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ایک اچھی اور سلیبی ہوئی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اس سے مل کر بہت خوش ہوا تھا۔

☆=====☆=====☆

سارکلب شہر کے پوش علاقے سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ جہاں رات گئے تک نو جوان سنوکر کھیلتے تھے۔ اوپر کی منزل پر سکندر نے اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی ہوئی تھی۔ ایک بڑا کمرہ تھا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ جس پر چار پانچ ایش ٹرے رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس وقت سکندر کے ساتھ اس کا خاص آدمی ناصر

براجان تھا۔ جبکہ ان کے سامنے دونو جوان بیٹھے ہوئے تھے۔

ان میں سے ایک کا نام جمال اور دوسرے کا نام نواز تھا۔ دونوں کی ملاقات جیل میں ہوئی تھی اور وہ اچھے دوست بن گئے تھے۔

جمال نے ایک لڑائی میں ایک شخص کو زخمی کر دیا تھا۔ لڑنا اور جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ اس کا بیٹھنا اٹھنا تھا۔ جب اسے قید کی صورت میں سزا ہوئی تو نواز نے اسے مشورہ دیا کہ وہ جیل سے رہا ہوتے ہی اس شہر میں نہیں رہیں گے۔ بلکہ کسی بڑے شہر کا رخ کر کے اپنے اوپر شرافت کا لبادہ اوڑھ کر زندگی کا آغاز کریں گے۔

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جیسے ہی وہ جیل سے رہا ہوئے انہوں نے اس بڑے شہر کا رخ کر لیا۔ جمال نے ایک سیٹھ کے پاس اس کی فیکٹری میں نوکری کر لی۔ جبکہ نواز نے ایک جگہ پان سگریٹ کی دکان کر لی۔ دونوں اس شرافت کی زندگی کو زیادہ دن قبول نہ کر سکے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کوئی ہاتھ مار کر اس شہر کو بھی خیر باد کہہ دیں۔

جمال کے سیٹھ کی پلاسٹک فیکٹری سے ملحق اس کا گودام بھی تھا۔ جہاں کپڑا بننے کا دھاگہ بوروں میں آتا اور جاتا تھا۔

جمال اور نواز نے فیصلہ کیا کہ وہ ان بوروں کو چوری کر کے کہیں بیچ دیں۔ اس صورت میں انہیں اچھا خاصا روپیہ مل سکتا تھا۔ اس جگہ دو تین ہی فاصلے پر فیکٹریاں تھیں اور زیادہ تعداد میں لوگوں کے گودام تھے۔ ہر ایک نے اپنا اپنا چوکیدار رکھا ہوا تھا۔ رات کو اگر کسی کا مال آ اور جانہ رہا ہو تو پھر اس جگہ ویرانہ ہی ہوتا تھا۔

جمال اور نواز نے سب سے پہلے ایک ایسے شخص کو تلاش کیا جو ایسا مال کم دام پر نقد بیسوں میں خرید کر کسی کے کانوں کان خبر نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس سے بات کرنے کے بعد انہوں نے چوکیدار سے بھی بات کر لی۔ اسے ایسی لالچ دی اور ایسے خواب دکھائے کہ چوکیدار کا ایمان بھی کمزور پڑ گیا اور اس نے ان دونوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک چھوٹے ٹرک میں سیٹھ کے گودام سے مال اس میں منتقل ہونا شروع ہو گیا۔ اس کے لیے انہوں نے رات کا پہلا پہری منتخب کیا تھا تاکہ کسی کو یہ شک نہ ہو کہ کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ مال منتقل کرنے کے بعد مقررہ جگہ پہنچا تو انہیں ان کے حصے کی رقم مل گئی۔ جمال اور نواز نے چوکیدار کو اس کا حصہ دے دیا۔

چوکیدار علاقہ غیر کارہائشی تھا۔ اس نے دن کا آغاز ہوتے ہی اپنے علاقے کی طرف رخصت سفر باندھ لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے علاقے میں کوئی بھی اس کا بال بھی میڑھا نہیں

سیٹھ کو جب یہ چلا کہ چوکیدار غائب ہے تو اسے تشریف ہوئی۔ دوسری چابیوں سے گودام کھولا۔ بہت سا مال غائب تھا۔ جمال اس واردات کے بعد کہیں نہیں گیا تھا۔ اس لئے شک کی بجائے یہ یقین ہو گیا تھا کہ چوکیدار نے گودام سے مال نکال کر بیچا ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اس کے علاقے میں کیسے جائیں۔ جس کے ذریعے سے چوکیدار کو سیٹھ نے رکھا تھا، ابھی اس سے بات چیت چل رہی تھی اور جمال خوش تھا کہ اس کے ہاتھ ایک بڑی رقم آگئی ہے۔ اپنے ضمیر کے ساتھ جنگ ہارنے کے بعد چوکیدار وہ رقم جو اسے جمال سے ملی تھی، لے کر سیدھا سیٹھ کے پاس جا پہنچا اور ساری حقیقت اس کے گوش گزار دی۔

سیٹھ ایسے کاموں کے لئے ہمیشہ سکندر کی مدد لیا کرتا تھا۔ اس نے سکندر کو بلالیا۔ سکندر نے اپنے آدمیوں کی مدد سے جمال اور نواز کو ایک ساتھ تلاش کر لیا جب وہ کہیں باہر رات کا کھانا کھا رہے تھے۔

جمال اور نواز پر ساری حقیقت سیٹھ کے گھر جا کر منکشف ہوئی، جہاں وہ چوکیدار بھی موجود تھا۔ دونوں اپنا پلان چوٹ ہوتا دیکھ کر خیرہ نگاہوں سے چوکیدار کی طرف دیکھتے جا رہے تھے جو اپنے ضمیر سے بہت جلد جنگ ہار گیا تھا۔ اُن کا ارادہ تھا کہ وہ معاملہ ٹھنڈا ہوتے ہی اس جگہ سے نکل جائیں گے۔ انہیں ایسا موقع ہی نہ ملا تھا۔

”سب کچھ واضح ہو گیا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ رقم مجھے واپس کر دو۔ ورنہ تم دونوں مجھے جانتے ہی ہو۔“ سکندر نے ان دونوں کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ وہ کوئی بہانہ کرتے۔ لہذا نواز نے کہا۔ ”ہم رقم واپس کر دیتے ہیں لیکن ایک وعدہ ہمارے ساتھ بھی ہو۔“

”بولو۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ ہمیں پولیس کے حوالے نہیں کریں گے۔“ نواز نے شرط رکھ دی۔

سکندر نے سیٹھ کی طرف دیکھا۔ سیٹھ نے کچھ سوچا اور اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”سکندر یہ تمہارا معاملہ ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ مجھے میری رقم چاہیے۔“

”دیکھو سکندر تم اس شہر کے بڑے اثر و رسوخ والے ہو، اور ہم چھوٹے لوگ ہیں لیکن ایک جان پہچان تو ہماری بھی آپس میں ہے ہی۔“ جمال نے کہا۔

”رقم دینے کے بعد تم اس شہر میں نہیں رہو گے۔“ سکندر نے سوچ کر کہا۔

”تو پھر کہاں جائیں؟“ جمال نے کہا۔

”کہیں بھی چلے جانا، لیکن اس شہر میں نہیں۔“ سکندر نے کہا۔

”یہ شرط ٹھیک نہیں ہے۔“ نواز نے احتجاج کیا۔

”تم جانتے ہو کہ مجھ سے کوئی بھی اپنی مرضی نہیں منوا سکتا۔ تمہارا لحاظ ہو رہا ہے تو اس کا فائدہ اٹھاؤ۔“ سکندر نے آنکھیں نکال کر اس کی طرف دیکھا۔

جمال اور نواز پھر چپ ہو گئے۔ وہ سکندر کے آگے اپنی بات منوانے کے لیے بضد نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کی بات مان لی اور رقم دینے کے لیے سکندر کو اپنے گھر لے گئے۔

جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئے جمال اور نواز کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ گھر میں جو بھی سامان تھا وہ بکھرا ہوا تھا۔ بتیس لاکھ روپے کی رقم جس بیک میں تھی، اور وہ بیک ایک خفیہ جگہ پر تھا، اس جگہ سے وہ بیک غائب تھا۔ دونوں حیرت سے بکھرے سامان کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔

”کک..... کون آیا تھا ہمارے گھر..... اور رقم والا بیک غائب ہے۔“ جمال کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

سکندر نے پہلے پورے گھر کا جائزہ لیا اور پھر جمال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے اطمینان سے بولا۔ ”ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تمہیں ڈرامہ لگ رہا ہے۔“ جمال چیخا۔ ”کوئی ہماری رقم لوٹ کر چلا گیا ہے۔“

”ہم نے وہ بیک اس جگہ رکھا تھا۔“ نواز نے ایک طرف اشارہ کیا۔ جہاں زمین میں ایک دو بائی دو کا گڑھا تھا۔ جو زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس گڑھے کے پاس کباڑ کا سامان پڑا تھا۔ یقیناً وہ سامان اس گڑھے پر رکھا ہو گا تاکہ کسی کو اس جگہ کا شک نہ پڑے۔

”اس جگہ بیک تھا؟“ سکندر نے پوچھا۔

”ہاں..... یہ ہی وہ جگہ ہے۔“ نواز نے کہا۔

”اور یہ سارا سامان اس کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس جگہ کوئی گڑھا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ ڈرامہ بند کرو اور وہ رقم مجھے دے دو۔“

”تمہیں ہماری بات کی سمجھ نہیں آرہی؟ ہمارے گھر میں چوری ہو گئی ہے اور وہ بیک نہیں ہے۔“ نواز نے چیخ کر کہا۔

سکندر نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور سیدھا نواز کے منہ پر دے مارا۔ ”کتنی بار بولوں مجھے اپنے آگے اونچی آواز پسند نہیں ہے۔ جو بات بھی کرنی ہے آہستہ کرو۔ میں تمہارا ملازم نہیں ہوں۔“

نواز اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر سکندر کو گھور رہا تھا۔ جمال جلدی سے آگے بڑھا اور دونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ ”دیکھو سکندر..... ہم سچ کہہ رہے ہیں کہ اس گھر میں ہماری غیر موجودگی میں کوئی آیا تھا اور ہمارا بیگ لے گیا۔“

”کوئی اور بھی جانتا تھا اس بیگ کے بارے میں؟“ سکندر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔“ جمال نے جواب دیا۔

”پھر کہیں تم دونوں میں سے کسی نے دوسرے کی آنکھوں میں مرچیں تو نہیں ڈال دیں؟“ سکندر نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

”نہیں..... نہیں..... ایسی بات مت کرو۔ اس کے لیے میں کیسی بھی قسم کھا سکتا ہوں۔“ جمال نے کہا۔

”تم چپ ہو؟ تم قسم نہیں کھانا چاہتے؟“ سکندر نے نواز کی طرف دیکھا۔

نواز نے ایک طرف منہ کر کے تھوکا، جس میں خون بھی تھا اور وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ”نواز کی فطرت میں دوست کے روپ میں دھوکہ دینا شامل نہیں ہے۔“

”ہم دونوں میں سے کسی کا بھی یہ کام نہیں ہے۔“ جمال نے کہا۔ اُسے یقین تھا۔

سکندر نے دونوں کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ دونوں سچ کہہ رہے ہیں۔ یہ کام کسی تیسرے بھیدی کا ہے۔ وہ انہیں اپنے کلب میں لے آیا تھا۔ پہلے اس نے سیٹھ کو ساری بات بتائی۔

”سکندر میرا پچاس لاکھ مال تھا۔ مجھے وہ رقم چاہیے۔ کیسے بھی یہ تم جانو۔“ سیٹھ نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

سکندر نے فون رکھ کر اپنے سامنے بیٹھے نواز اور جمال کی طرف دیکھ کر ناصری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اب کیا کریں ان کا؟“

”انہیں رقم تو دینی ہی ہوگی۔“ ناصر نے گردن ہلا کر کہا۔

”ہاں بھئی اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ بتاؤ جیل جانا ہے یا رقم دینی ہے۔“ سکندر نے پوچھا۔

”لیکن ہم پیسہ کہاں سے دیں؟“ جمال نے کہا۔

”یہ ہمارا معاملہ نہیں ہے۔ پیسہ تو تم دونوں دو گے۔ ورنہ تم دونوں جانتے ہو کہ مجھے مُردوں سے بھی پیسہ لینا آتا ہے۔“ سکندر نے درشت انداز میں لیکن دھیمے لہجے میں کہا۔

”اس وقت تو ہماری جان ہی ہے ہمارے پاس۔“ نواز نے کہا۔

”اس کے لینے کا ابھی وقت نہیں آیا۔“ سکندر نے مسکرا کر کہا۔

”سکندر..... تم ان کو ایک موقع دو۔“ ناصر بولا۔

”کیا موقع دوں؟“ سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ تو سچ بات ہے کہ یہ کہیں بھاگ نہیں سکتے۔ ہماری نگاہ اور ہاتھ کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں ان کو اندازہ ہے۔ انہیں اس شہر میں آزادی دے دو۔ یہ جو بھی کریں۔ کیسے بھی کریں۔ سیٹھ کے پچاس لاکھ روپے کہیں سے بھی پیدا کر کے دیں۔ خواہ بینک لوٹیں۔“ ناصر نے کہا۔

”کیوں..... ناصر کی بات میں دم تو ہے۔ یہ ہی ایک طریقہ ہے کہ تم دونوں سیٹھ کی رقم واپس کر سکتے ہو۔“ سکندر نے کہا۔

جمال اور نواز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اُن دونوں کو سیٹھ کا کوئی ڈر یا خوف نہیں تھا۔ اگر سکندر بیچ میں نہ ہوتا تو کوئی بھی ان کا کچھ نہ لگاڑ پاتا لیکن اب بات تھی سکندر کی۔ جو کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس سے جان چھڑانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی تھا۔

”کتنے دن دو گے۔“ جمال نے پوچھا۔

”تم کتنے دن لینا چاہتے ہو؟“ سکندر نے گیند اس کی طرف واپس دھکیل دی۔

”ایک ہفتہ تو ہمیں سوچنے کے لیے دو کہ ہمیں کرنا کیا ہوگا۔“ نواز بولا۔

”ایک ہفتہ؟“ سکندر نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”پچاس لاکھ روپے اسی شہر سے ہم نے حاصل کرنے ہیں۔ کوئی پلان ہوگا تو یہ ملیں گے۔“ نواز بولا۔

”کیوں ناصر؟“ سکندر نے اس کی رائے لینا چاہی۔

”بات ان کی بھی ٹھیک ہے۔“ ناصر نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

”چلو دیا ایک ہفتہ۔“ سکندر نے کہا۔ ”ایک ہفتہ کے بعد کتنے دن میں ہمیں رقم دو گے۔“

”ہم پوری تسلی کے ساتھ سوچیں گے۔ کسی کو نارگٹ کریں گے اور پھر اسی شہر کو لوٹ کر سیٹھ کے پچاس لاکھ روپے بھی دیں گے اور اپنا حصہ وصول کر کے یہ شہر چھوڑ دیں گے۔“ جمال نے کہا۔

”یعنی اگلی بات تم ایک ہفتہ کے بعد بتاؤ گے؟“ سکندر نے پوچھا۔



”ہاں ایک ہفتہ کے بعد۔“ نواز نے کہا۔

”ٹھیک ہے جاؤ۔“ سکندر نے کہا۔ ”ایک ہفتہ کے بعد آنا لیکن یاد رکھنا۔ میں زیادہ دن نہیں دوں گا۔ جو بھی کرنا ہوگا شارٹ ٹائم میں کرنا اور اگر کہیں بھاگنے کی کوشش کی تو پھر مجھ سے برا اور کوئی نہیں ہوگا۔“ سکندر نے آخری جملہ اس خطرناک انداز میں کہا تھا کہ جمال اور نواز کو لگا جیسے کسی نے ان کی رگوں زہر اتار دیا ہو۔

”ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ ہم اپنی موت کو دعوت نہیں دیں گے۔“ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور اجازت لے کر باہر نکل گئے۔

اُن کے جاتے ہی دونوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں مسکرا کر دیکھا۔ جب سیٹھ نے سکندر اور ناصر کو بلا کر ساری صورت حال سے آگاہ کیا تھا تو سکندر نے ناصر سے کچھ کہا اور ناصر اپنے آدمیوں کے ساتھ جمال اور نواز کی تلاش میں نکل گیا تھا۔ سب سے پہلے ناصر اپنے آدمیوں کے ساتھ ان کے گھر پہنچا تھا۔ گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔ ناصر نے باقی آدمیوں کو ان کی تلاش میں بھیج دیا تھا اور خود اُس نے ایک تار سے گھر کا تالا کھولا اور اندر جا کر بڑے اطمینان سے گھر کی تلاشی لینا شروع کر دی تھی۔ کچھ جدوجہد کے بعد وہ اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں اُنہوں نے پیسوں کا بیگ چھپایا ہوا تھا۔

ناصر نے وہ بیگ نکالا اور بیگ اپنی محفوظ جگہ پر پہنچا کر سیدھا سکندر کے پاس چلا گیا تھا۔ اُس نے جاتے ہی اشارے سے سکندر کو بتا دیا تھا کہ کام ہو گیا ہے۔ اسی اثنا میں اس کے آدمی جمال اور نواز کو بھی پکڑ کر لے آئے تھے۔

”اب آئے گا مزا۔“ سکندر نے ہنس کر کہا۔

”اُن کی بجائے ہمارا ہی بڑا ہاتھ لگ گیا ہے۔“ ناصر ہنسا۔

”اور وہ بھی بیٹھے بٹھائے۔“ سکندر نے کہا۔ دونوں بہت دیر تک اس بات پر خوش ہوتے رہے۔ ہنستے رہے۔ سکندر نے پھر معنی خیز انداز میں کہا۔ ”ضرورت پڑی تو ہم ان دونوں کو اپنے انداز میں استعمال کر سکیں گے۔“

”کہیں تمہارے ذہن میں بھی وہی بات تو نہیں ہے جو ابھی میرے ذہن میں آئی ہے۔“ ناصر نے پوچھا۔

سکندر ہنسا۔ ”اسی لئے تو لوگ کہتے ہیں کہ ہم میں بہت ذہنی آہنگی ہے۔“

”جمال اور نواز ہمارے پاس دو مہرے ہیں۔“ ناصر نے کہا۔

”بساط بھی ہم بچھائیں گے اور مہرے بھی ہماری انڈیوں میں ہوں گے۔“ سکندر نے

کہا۔

”آئیے دو وقت کو۔“ ناصر بولا۔

”بس تم دیکھتے جاؤ آگے آگے ہوتا ہے کیا۔“ سکندر نے کہا۔

☆=====☆=====☆

اُس چھ منزلہ عمارت میں بہت سے کاروباری دفاتر تھے۔ اس عمارت میں ہر وقت لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ تیمور بھی اس عمارت میں کسی کام کی غرض سے آیا تھا۔ اُسے ملاقات کے لیے اس عمارت کی چوتھی منزل پر واقع ایک دفتر میں جانا تھا۔ ابھی وہ لفٹ کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اُسے ایک جاننے والا مل گیا اور وہ دونوں استقبالیہ کے پاس رکھے صوفے پر بیٹھ گئے۔

ٹھیک اسی وقت ایاز بھی اس عمارت میں داخل ہوا۔ پہلے فلور پر جانے کے لیے اس نے لفٹ کی بجائے سیڑھیاں استعمال کی تھیں۔ اس جگہ جاتے ہی وہ ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ پندرہ منٹ بعد اس کمرے سے باہر نکلا تو چوتھی منزل پر جانے کے لیے اس بار اس نے سیڑھیاں استعمال کرنے کی بجائے سیدھا لفٹ کا رخ کیا۔

جیسے ہی لفٹ رکی اُس کا دروازہ کھلا، اندر اتنے افراد تھے کہ ایک کی مزید گنجائش تھی، ایاز جلدی سے لفٹ کے اندر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا اور لفٹ اوپر کی طرف جانے لگی۔ اس لفٹ میں سب سے پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کر تیمور بھی کھڑا تھا۔ اُس نے ایاز کو دیکھ لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ایاز کو بلائے لیکن فی الحال ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے اس نے سوچا کہ جیسے ہی لفٹ رکے گی وہ باہر نکل کر اس سے مل لے گا۔

تیسری منزل پر دو افراد باہر نکلے تھے اور دو ہی اندر داخل ہو گئے تھے۔ چوتھی منزل پر جیسے ہی لفٹ رکی ایاز پہلے باہر نکل گیا تھا۔ تیمور کیونکہ پیچھے تھا اس لئے اسے باہر آتے ہوئے کچھ وقت لگ گیا۔

باہر نکل کر تیمور نے ادھر ادھر دیکھا اُسے ایاز کہیں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ تیمور نے سوچا شاید اُسے جلدی تھی اس لئے وہ تیزی سے کسی طرف چلا گیا۔ تیمور بھی اپنے کام کے لیے اُس دفتر کی طرف بڑھ گیا جو کہ لفٹ کے پاس ہی تھا۔

تیمور کو اپنے کام کے سلسلے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا۔ واپس جانے کے لیے ایک بار پھر وہ لفٹ کے آگے کھڑا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ ایاز پر پڑی جو ایک دفتر سے باہر آ رہا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے سامنے والے دفتر سے ایک اور نوجوان باہر نکلا جو ایاز کو دیکھتے ہی چلانے کے انداز

میں بولا۔

”ارے تم یہاں کیسے؟“

”مجھے یہاں کیا ہے۔“ ایاز نے پوچھا۔

”کس کے گلے پر چھری چلانے کے لیے آئے ہو؟“ اُس نوجوان نے مسکراتے ہوئے

اُسی انداز میں کہا۔

ایاز نے اس کا بازو پکڑا اور ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری اُونچی بولنے کی عادت نہیں گئی۔“

دونوں ایک ستون کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔ نوجوان کے اس جملے نے تیمور کو شک میں ڈال دیا تھا۔ لفٹ رک گئی تھی۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ تیمور نے ایک نظر لفٹ کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر دبے پاؤں ستون کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ دونوں کی آوازیں صاف آرہی تھیں۔

”اس کا مطلب ہے کہ تین ماہ ہو گئے ہیں تمہارا اس جگہ دفتر منتقل ہوئے۔“ ایاز نے کہا۔

”ہاں..... تم مجھ سے ہی سوال کئے جا رہے ہو میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہے ہو۔“ نوجوان نے کہا۔

”تمہارے سارے سوال فضول ہوتے ہیں۔“ ایاز نے کہا۔

”چلو فضول سوال کا ہی جواب دے دو۔ یہاں کیسے آئے ہو؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”ایک کام تھا اس سلسلے میں آیا تھا۔“ ایاز نے مختصر جواب دیا۔

”یہ تو مجھے پتہ ہے کہ تم کہیں بھی کسی کام کے بغیر نہ تو آتے ہو اور نہ ہی جاتے ہو۔“

نوجوان نے کہا۔

”کام سے آنا جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔“ ایاز نے کہا۔ ”جتنا وقت میں نے ضائع کرنا تھا

وہ کر لیا۔ اب نہیں۔ اب میں وقت کو اپنے ہاتھ میں لے کر چلنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ کیا سمجھے۔“

”طارق والا مسئلہ حل ہو گیا کیا؟“ نوجوان نے دوسرا سوال کر دیا۔

”وہ تو کب کا حل ہو چکا ہے۔“ ایاز نے مسکرا کر جواب دیا۔

”کیسے حل ہو گیا بھی؟“ نوجوان نے حیرت سے پوچھا۔

”دوسروں کو شیشے میں اتارنے کا فن آنا چاہیے۔ اب بھی میں جس گاڑی میں آیا ہوں

وہ بھی اسی کی ہے۔“ ایاز نے فخریہ انداز میں کہا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“ نوجوان کی حیرت دو چند ہو گئی تھی۔ ”وہ تو اپنے سابقہ گاڑیوں کے

کرائے کے لیے تمہیں مرنے مارنے پر تلا ہوا تھا۔“

”اُس کی گاڑیوں کا کرایہ میری طرف اسی ہزار روپے ہے۔ اُسے میں نے اُمید کی ہی

نہیں بلکہ یقین کی ایک ایسی کرن دکھادی ہے کہ اس نے نا صرف یہ کہ اسی ہزار روپے کا تقاضا

کرنا چھوڑ دیا ہے بلکہ اپنی گاڑیاں بھی مجھے استعمال کے لیے دیتا ہے۔ اُس کا سارا حساب

ایک ساتھ دے دوں گا۔“ ایاز کہہ کر ہنسا۔

”کون سا خزانہ ہاتھ لگ رہا ہے بھی؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”بتا دوں؟“ ایاز نے اس کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں یار بتا۔“ وہ بے چین سا ہو گیا تھا۔

”رہنے دے تو سارے شہر کو بتا دے گا۔“ ایاز نے کہا۔

”پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کیا؟“ اس نے کہا۔

”پہلے ہوا تو نہیں ہے ایسا۔ آخر تم بھی میری ہی کشتی کے سوار ہو۔“ ایاز مسکرایا۔

”تو پھر جلدی سے بتا دے کیا معاملہ ہے۔“ وہ جاننے کے لیے کچھ زیادہ ہی مضطرب

تھا۔

”ایک سونے کی چڑیا ہاتھ لگ گئی ہے۔ میرے عشق میں جال میں پھنسی چڑیا کی طرح

ہو گئی ہے۔ ایک دولت مند بھائی کی بہن ہے۔ شادی ہو جانے کی دیر ہے۔ تجویز کے

دروازے مجھ پر یوں کھل جائیں گے جیسے بارش سے بندہ شرابور ہو جاتا ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”اچھا کون ہے وہ سونے کی چڑیا؟“ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

”یہ تو نہیں بتاؤں گا۔ ہاں تجھے میں اپنی دعوت ولیمہ میں ضرور بلاؤں گا۔“ ایاز نے کہہ

کر اس کی گال پر ہولے سے اپنی انگلیاں پھیریں اور مسکرا کر چل دیا۔

تیمور اس کی پشت پر کھڑا اُسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا

تھا۔ ایاز کی حقیقت اُس پر منکشف ہو گئی تھی۔

☆=====☆=====☆

تیمور اگر اپنے آپ پر جبر نہ کرتا تو شاید وہ ایاز کو اس حالت میں اس عمارت سے واپس

نہ جانے دیتا جس حالت میں وہ آیا تھا۔

تیمور نے ساری بات عشرت کے گوش گزار کر دی۔ عشرت نے ساری بات بڑی توجہ

سے سنی۔ اُسے یہ سب جان کر بہت حیرت اور افسوس ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچنے لگی کہ نازی، ایاز کو بہت چاہتی ہے۔ جب اسے یہ سب پتہ چلے گا تو اُس کے لیے انتہائی تکلیف دہ بات ہوگی۔ شاید وہ یہ سب برداشت نہ کر سکے۔

”آپ نے اچھا کہہ کر آپ ایاز کے سامنے نہیں ہوئے۔“ عشرت نے کہا۔  
”دل تو یہ چاہتا تھا کہ اس کی ٹانگیں توڑ دوں اور ایسا عبرت کا نشان بناؤں کہ کوئی بھی ایسی حرکت نہ کر سکے۔“ تیمور نے کہا۔

”ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا ہے۔ ہمیں پہلے پتہ چل گیا۔ بعد میں حقیقت سامنے آتی تو پھر یہ زندگی کا روگ بن جاتی۔“ عشرت بولی۔

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ تیمور نے سر ہلا کر کہا۔ ”تم یہ ساری بات نازی کے گوش گزار کرو۔ تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے۔“

عشرت کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ ”تیمور تم نے اپنی بہن کو اس سلسلے میں مکمل اختیار دیا تھا کہ وہ اپنی پسند کے بارے میں ہمیں بتا سکے۔ جب کوئی کسی کو بہت چاہتا ہو تو پھر وہ اُس کے خلاف کوئی بات سننا بھی گوارہ نہیں کرتا۔“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ تیمور نے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر ہم نازی کو ایاز کی اصلیت کے بارے میں بتائیں گے تو شاید وہ اس بات کا یقین نہ کرے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہم پر کوئی شک کر بیٹھے۔ اس کے دل و دماغ میں غلط فہمیاں جنم لینا شروع کر دیں۔ کیونکہ ایاز نے اس کے دل و دماغ پر اپنی شرافت کا لبادہ پوری شدت سے اوڑھ لیا ہوا ہے۔“ عشرت نے متانت سے کہا۔ ”اور آپ نے ایاز سے ملاقات کے بعد خود یہ کہا تھا کہ وہ ایک اچھے خاندان کا لڑکا ہے اور آپ کو بہت اچھا لگا ہے۔“

اس کی بات سن کر تیمور نے بھی کچھ لمحوں کے لیے سوچا۔ ”لیکن اب اس کی اصلیت سامنے آگئی ہے۔“

”اُس کی اصلیت ہمارے سامنے آئی ہے نازی کے سامنے نہیں۔ جب چاہت میں بات آگے بڑھ جائے تو پھر کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ ہم لاکھ اسے ساری بات بتائیں۔ اُس پر ایاز سے ملنے کی پابندی لگا دیں۔ اُس کے اندر ایاز سے ملنے کی تڑپ اتنی ہی شدید ہو جائے گی اور ایک بہن کے دل میں بھائی کے لیے دراڑ آجائے گی۔“ عشرت نے تیمور کی طرف دیکھ کر کہا۔

تیمور کو اس کی بات سمجھ آ رہی تھی۔ اُس نے پوچھا۔ ”پھر ہم کیا کریں؟“

”ہمیں ثابت کرنا ہوگا کہ ایاز کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ جو ہمارے سامنے ہے وہ ایاز نہیں ہے بلکہ جو نقاب کے پیچھے ہے، وہ ایاز ہے۔“ عشرت نے کہا۔

”یہ ہم کیسے ثابت کریں۔ اُسے پکڑ کر میں نازی کے سامنے کھڑا کر دوں اور اُسے مجبور کروں کہ وہ جو ہے نازی کو خود اپنی زبان سے بتائے۔“ تیمور کو غصہ آ گیا تھا۔

”فرض کرو تم اُسے پکڑ کر نازی کے سامنے لے آتے ہو اور اُسے مجبور کرتے ہو کہ وہ اپنے بارے میں بولے۔ ایسے شاطروں کا کیا، وہ کہہ دے کہ تمہارا بھائی مجھ سے یہ زبردستی کہلانا چاہتا ہے۔ کیونکہ یہ ہم دونوں کو ایک نہیں کرنا چاہتے۔ تب کیا ہوگا، یہ جانتے ہیں آپ؟“ عشرت نے کہا۔ ”ایسے مجرم تھانے میں مار کھا کر بھی اپنی زبان نہیں کھولتے۔“

تیمور اُٹھ کر ٹہلنے لگا تھا۔ عشرت کی باتوں نے واضح کر دیا تھا کہ اس بات کو نازی سے کہنے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ یہ ایک نازک مرحلہ ہے۔ انہیں سوچ سمجھ کر کوئی بھی قدم اٹھانا ہوگا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں جو بھی کرنا ہوگا سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا۔“ تیمور نے کہا۔

”ہمیں موقع دینا ہوگا کہ یہ ثابت ہو کہ ایاز کیا ہے۔ تاکہ نازی خود اُس سے نفرت کا اظہار کر دے۔“

”ایسا ہوگا تو بہتر ہوگا۔“ عشرت نے کہا۔ ”اُس نے اپنے خاندان کی جو بھی کہانی بیان کی ہے وہ اس نے سوچ سمجھ کر کہی ہے۔ ایسے ہوشیار لوگ بہت آگے کی سوچ کر چلتے ہیں۔“

تیمور ایک جگہ رک گیا تھا اور وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔ وہ ایاز کو زیادہ دن نہیں دینا چاہتا تھا۔ اچانک اس نے عشرت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔“

”کون سی بات؟“ عشرت نے پوچھا۔

”جس سے ایاز کا نقاب نازی کے سامنے اُتر جائے گا۔ تم ایسا کرو۔ نازی سے کہو کہ وہ کل رات کے کھانے پر ایاز کو گھر بلا لے۔“ تیمور کچھ پُر جوش سا ہو گیا تھا۔

”میں کہہ دیتی ہوں لیکن آپ نے سوچا کیا ہے۔“ عشرت نے پوچھا۔

تیمور نے عشرت کا بازو پکڑا اور ایک ساتھ وہ بیڈ پر بیٹھے ہوئے اُسے بتانے لگا کہ اس کے ذہن میں کیا بات آئی ہے۔

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد تیمور نے کہا۔ ”جس کے لیے یہ سب ہو رہا ہے، اُس کے کھوجانے سے وہ کچھ تو کرے گا۔“

”ہاں..... کچھ تو کرے گا۔“ عشرت نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

جب عشرت کمرے سے باہر نکلی تو اُسے یقین تھا کہ ایاز کی اس سے اصلیت کھل کر سامنے آجائے گی۔

نازی اپنے کمرے میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ عشرت کے اندر جاتے ہی نازی نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ پہلے تو عشرت اُس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی اور پھر وہ بولی۔

”کیا خیال ہے کل رات کے کھانے پر ایاز کو نہ بلا لیں؟“

”کھانے پر؟“ نازی کی آنکھوں میں چمک اُبھر آئی اور اُس نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

”ہاں..... اس کی فیملی اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کھانا بھی کھالے گا اور گپ شپ بھی ہو جائے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے۔“ عشرت نے کہا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں بھابی۔“ وہ مسکرائی۔

”جو بھی کہنا ہے وہ تمہیں ہی تو کہنا ہے۔“ عشرت نے ہنس کر کہا۔

”آپ کی مرضی۔“ نازی بولی۔

”ٹھیک ہے میں ایاز کو فون کر دیتی ہوں۔ مجھے نمبر دو گی اس کا۔“ عشرت نے کہا۔

”بھابی میں نے کل لائبریری جانا ہے۔“ نازی نے کہا۔

”ہاں تم چلی جانا لیکن اُسے اطلاع بھی تو کرنی ہے ناں۔“ عشرت نے جان بوجھ کر

کہا۔

”ہاں تو میں کل جا رہی ہوں ناں لائبریری۔ ہو جائے گی اطلاع۔“ نازی نے کہا۔

عشرت نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر کہا۔ ”ٹھیک سے کہہ دینا۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں۔“ نازی نے کہا اور عشرت اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

نازی کتاب پڑھنا بھول گئی تھی اور ایاز کے خیالوں میں کھو گئی تھی۔ وہ بہت خوش دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح ٹیک لگائے بیٹھی اپنے خیالوں میں مستغرق رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

لائبریری سے باہر اُسی چوتھے پر وہ دونوں ساتھ ساتھ براجمان تھے۔ نازی نے ابھی ابھی اُسے رات کے کھانے پر آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ سنتے ہی ایاز کا دل یک دم کھل گیا تھا اور اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا، پہلے نازی اس کی گرفت میں تھی اب اس کا بھائی بھی اس کی مٹھی میں آگیا ہے۔ اپنی خوشی کا اظہار اس نے اپنے چہرے سے نہیں کیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ویسی چمک ضرور اُبھری تھی جو کسی فاتح کی آنکھوں میں آتی ہے۔ اُس نے نازی

کی طرف دیکھا اور متانت سے کہا۔

”نازی..... بھلا کھانے پر بلانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”ٹھیک ہے مت آؤ۔“ نازی نے لاپرواہی سے کہا کہ ایاز بھی چونک گیا۔

”بڑی بے مروت ہو۔ فوراً انکار بھی کر دیا۔“ ایاز نے کہا۔

”تم نے کہا اس کی کیا ضرورت ہے میں نے کہا ٹھیک ہے مت آؤ۔ اس میں بے

مروت ہونے کی کیا بات ہے۔“ نازی بولی۔

”بندہ ایک ادھ بار تو تکلفاً ایسا کہتا ہی ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”جہاں تکلف ہوتا ہے وہاں اپنا پن نہیں ہوتا۔“ نازی جھٹ سے بولی۔

”ویسے ایک بات تو بتاؤ۔ کھانے پر مجھے تمہارے بھائی جان نے بلایا ہے؟“ ایاز اپنے

دل میں ابھرنے والے خیال کی تصدیق چاہتا تھا۔

”مجھے تو بھابی نے کہا تھا۔“ نازی نے کہا۔

”تمہارے بھائی کی رضا مندی سے ہی کہا ہوگا؟“ ایاز نے مزید کریدا۔

”تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے کہ پیڑ گننے سے؟“ نازی نے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر میں پیڑ گن رہا ہوں تو کیا ہرج ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کتنے پیڑ تھے جن

کے آم کھائے ہیں۔“ ایاز نے کہا۔

”پیڑ گنو گے تو مالی آجائے گا۔“ نازی نے کہا۔

ایک دم ایاز کو لگا جیسے واقعی مالی آگیا ہو۔ اُسے پیڑ گننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس

کا کام آم کھانا ہے۔ وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے اب تم اتنا کہہ رہی ہو تو میں آ جاؤں گا۔“

نازی نے شرارت سے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ”خیر میں نے اتنا بھی نہیں کہا۔“

”تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تمہارا ذرا سا کہنا بھی میرے سامنے کتنا ہے۔“ ایاز نے اُس

کی طرف دیکھتے ہوئے متانت سے کہا۔

نازی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اب میں چلتی ہوں۔“

”اتنی جلدی.....؟ کہیں جانا ہے کیا؟“ ایاز نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔

”مجھے گھر جانا ہے۔“ نازی نے کہا۔

”ابھی کچھ دیر او بیٹھو ناں۔“ ایاز نے زور دینے کے انداز میں کہا۔

”نہیں آج اتنی ہی ملاقات کافی ہے۔“ نازی نے کہا۔ ”تم رات کو وقت پر آ جانا۔

بھائی جان کو زیادہ انتظار کی عادت نہیں ہے۔“

”تم کہو تو میں ابھی جا کر تمہارے دروازے پر بیٹھ جاؤں۔“ ایاز نے کہا۔  
 ”خیر اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔“ نازلی نے کہا۔ ”ویسے بائی داوے تمہارے گھر والے  
 کب اسلام آباد سے آرہے ہیں؟“  
 ”شاید اُن کو ایک دو دن اور لگ جائیں۔“ ایاز نے کہا۔  
 ”پاسپورٹ وغیرہ کا کام ہوا یا نہیں؟“ نازلی نے پوچھا۔  
 ”وہ تو انکل نے کر دیا ہے۔ اب چند دن وہ اس شہر میں گھومیں گے، اور کیا۔“ ایاز نے  
 کہا۔

نازلی نے اُس سے اجازت لی اور اُس طرف چل دی جہاں سے اُسے گھر جانے کے  
 لیے ٹیکسی مل سکتی تھی۔ ایاز اُسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب نازلی اُس کی آنکھوں سے اوجھل  
 ہو گئی تو اُس نے خوشی سے اپنا مکہ فضا میں مارا۔  
 کچھ ہی فاصلے پر اس کی بڑی کار کھڑی تھی۔ ابھی وہ اپنی کار کے پاس پہنچا ہی تھا کہ وہ  
 ٹھٹک کر رک گیا۔ کار کے پاس ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ اُس پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔  
 اُس کا نام طارق بت تھا۔ اُس کے سر کے بال لمبے اور چہرے پر چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی تھی۔  
 جسم کسرتی تھا۔

طارق کا بظاہر کاروبار تو ریٹ اے کار، کا تھا لیکن جس جگہ اس کا دفتر تھا اُس کی دوسری  
 منزل پر ہر وقت کرکٹ میچ لگا رہتا تھا۔ محلے کے ہی نہیں ارد گرد کے نوجوان اور لوگ وہاں جوا  
 لگانے کے لیے آتے رہتے تھے۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ایاز نے اسے دیکھا تو پوچھا۔

”تمہارے پیچھے آیا تھا۔“ طارق نے اطمینان سے جواب دیا۔

”میرے پیچھے کیوں آئے تھے؟ میں بچہ ہوں کیا؟“ ایاز نے اس کے پاس جا کر کہا۔  
 ”یہ جو تم عشق فرما رہے ہو اور اس عشق کے پیچھے جو کھیل تمہارا چل رہا ہے۔ اس میں  
 میری ایک بڑی رقم لگی ہوئی ہے۔ یاد ہے کتنی؟ پورے ایک لاکھ نو ہزار تین سو چھیالیس روپے  
 ہے۔“ طارق نے کہا۔

”تم یہ بتانے کے لیے میرے پاس آئے ہو؟“ ایاز نے براہِ سامنے بنا کر کہا۔

”میں یہ دیکھنے کے لیے آیا تھا کہ تم اُسی کام پہ ہونا جس کے لیے مجھ سے کار لے کر  
 جاتے ہو۔“ طارق نے کہا۔

”تو پھر دیکھ لیا تم نے؟“ ایاز کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے اُسے طارق کا اس طرح

سے آنا اچھا نہیں لگا۔

”ہاں دیکھ لیا۔ یہ کھیل ختم کب ہو رہا ہے؟“ طارق نے پوچھا۔  
 ”کیا مطلب؟“ ایاز نے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ کب اس سونے کی چڑیا سے شادی کر رہے ہو اور کب مجھے میری  
 رقم ہمہ منافع واپس کر رہے ہو؟“ طارق نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر خاہش کی۔  
 ”مجھے تم سے بھی زیادہ جلدی ہے۔“ ایاز نے کہا۔  
 ”جلدی ہے تو پھر اس سے بھی جلدی کرو۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔“ طارق نے

کہا۔

ایاز مزید دو قدم چل کر اس کے پاس گیا اور متانت سے کہا۔ ”دیکھو طارق ہم دونوں  
 کے درمیان یہ معاہدہ ہوا تھا کہ جب تک میری شادی اس سے نہیں ہو جاتی تم مجھے نہ روکو گے  
 اور نہ اپنے پیسوں کا تقاضا کرو گے۔ دن میں جتنی پار میں تم سے کار لے جاؤں گا تم بس درج  
 کرو گے اور جیسے ہی شادی کے بعد میرے ہاتھ رقم لگتی ہے میں تمہیں ڈبل کر کے تمہیں لوٹا  
 دوں گا۔“

”ہاں یہ بات ہوئی تھی لیکن تمہارا کھیل لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح کے کھیل کو طول  
 دینا نقصان ہوتا ہے۔“ طارق نے کہا۔

”میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس لئے تم مجھے یہ مت سکھاؤ کہ مجھے کھیل کتنا طویل اور  
 مختصر کرنا ہے۔“ ایاز نے کہا۔

طارق نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس کے چہرے پر پیوست کرتے ہوئے کہا۔ ”ایاز  
 یہ یاد رکھو کہ میری دی ہوئی چھوٹ میں بھی ایک حد بندی ہوتی ہے اور میں اُس حد بندی تک  
 ہی انتظار کرتا ہوں۔“

ایاز نے کچھ دیر اُس کی طرف دیکھا اور پھر جانے کے لیے اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔  
 دروازہ کھول کر اس نے طارق کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”آج میری اس کے گھر دعوت ہے۔  
 رات کو مجھے دوسرے ماڈل کی کار چاہئے ہوگی۔ مجھے اُمید ہے کہ مجھے خوشخبری ملنے والی ہے۔“  
 ایاز کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ طارق نے اُسے جاتا ہوا دیکھ کر زیر لب کہا۔ ”تم بھی ریس  
 میں دوڑتے ہوئے ایک گھوڑے ہوا یا۔ اگر تم ہار گئے تو میری گولی تمہاری ٹانگ کو ہمیشہ کے  
 لیے مفلوج کر دے گی۔ زندگی بھر دوڑنے کے قابل نہیں رہو گے۔“

رات کو ایاز نے دوسرے ماڈل کی نئی کار طارق سے لے لی تھی۔ اُس نے پینٹ، کوٹ

آہے رکھ دی جس میں دو اشنام پیپرز لگے ہوئے تھے۔ دونوں پر ایک تحریر بھی لکھی ہوئی تھی۔ تیمور نے وہ تحریر پڑھی اور پھر نازی کو اپنے پاس بلا کر بڑی شفقت سے کہا۔

”نازی دراصل میں ایک بڑے پروجیکٹ کے لیے بینک سے لون لے رہا ہوں۔ یہ کاغذات آج ہی جمع ہو جاتے لیکن نہیں ہو سکے۔ تمہیں ان کاغذات پر دستخط کرنے ہوں گے۔ تم جانتی ہو کہ یہ جو کچھ بھی ہے میری محنت سے بنا ہے۔ میرے کمائے ہوئے روپے سے بنا ہے۔ باپ ہمارے لئے کوئی بڑی جائیداد چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ تمہیں یہاں دستخط کرنے ہوں گے کہ تمہارا اس ساری جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ تمہیں میں جائیداد میں حصہ دینے کا پابند نہیں ہوں۔ بینک کو ایسی ہی کلیرنس درکار ہے۔“

ایاز یہ سنتے ہی جیسے کانپ سا گیا۔ اُسے لگا جیسے کسی نے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔ اس کے باوجود اُس نے ایک بار بھی گردن اٹھا کر اُن سب کی طرف نہیں دیکھا اور اپنے ہی دھیان میں بیٹھا رہا۔

”بھائی جان مجھے آپ کے علاوہ اور کیا چاہیے۔ لائیے میں دستخط کر دوں۔“ نازی نے خوش دلی سے کہا اور تیمور کے ہاتھ سے قلم لے لیا۔ ایاز کا دل چاہا کہ وہ ابھی اٹھ کر نازی کے ہاتھ سے قلم کھینچ لے۔ اُسے بتائے کہ بھائی کی محبت میں اندھی ہونے کی بجائے آنکھ کھول کر دیکھو، اپنے ہاتھ کاٹ کر تم دے رہی ہو۔ تمہارا بھائی تم سے اس جائیداد میں حصے دار ہونے کا اختیار لے رہا ہے۔ تم اپنے بھائی سے کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد ایک پائی کی بھی حقدار نہیں ٹھہرے گی۔ تم اپنی ہی نہیں میری بھی بربادی پر دستخط کر رہی ہو۔

نازی کے سامنے فائل رکھ دی گئی تھی۔ نازی کے ذہن کے کسی حصے میں بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اپنے بھائی سے پیار کرتی تھی۔ جب اُس نے قلم کھولا تو ایاز کو لگا جیسے اس کا سینہ کسی نے چیر دیا ہے۔ نازی نے دونوں کاغذات پر اپنے دستخط کر دیئے تو ایاز دم بخود اپنی جگہ پر براجمان اُس شخص کی طرح حسرت کی تصویر بن گیا جو سمندر کے کنارے کھڑا ہو کر بحری جہاز کو رفتہ رفتہ دور جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

”ایاز..... ایاز۔“ تیمور نے پاس جا کر دوبار ایاز کو آہستہ سے پکارا تو وہ یک دم چونکا۔ اُس نے دیکھا کہ وکیل بھی جا چکا ہے۔ ”کہاں کھو گئے ہو؟“ ”وہ میں.....“ ایاز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ ”آؤ ابھی کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ تیمور نے کہا۔ کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے ایاز کو لگ رہا تھا جیسے اس کی ناگوں میں جان نہیں ہے۔

اور سفید شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ جس سے وہ اور بھی اچھا لگ رہا تھا۔ چہرے پر معصومیت، نقاب ایسا چڑھا لیا تھا کہ جیسے اس سے بڑھ کر شریف کوئی اور نہ ہو۔

ایاز وقت مقررہ پر نازی کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اُس کا استقبال تیمور نے بڑی گرجبوش سے کیا تھا۔ سب ڈرائیونگ روم میں بیٹھ گئے تھے۔ مشروب کے ساتھ باتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ تیمور نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ شک نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اس کی اصلیت جان گیا ہے۔ ایاز بھی ایسی اداکاری کر رہا تھا کہ تیمور بھی دل ہی دل میں اُسے داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ کھانا تیار تھا اور ابھی وہ کھانے کے لیے اُٹھنے والے ہی تھے کہ تیمور کو موبائل پر فون آ گیا۔

”اس وقت؟“ تیمور نے اچانک حیرت سے کہا۔ ”لیکن اس وقت تو میں اپنے ایک مہمان کے ساتھ مصروف ہوں..... ہاں ٹھیک ہے کہ آپ کو صبح سویرے پھر نکلتا ہے؟ لیکن..... اس وقت..... ٹھیک ہے آپ ابھی گھر آ جاؤ۔“ ”خیر یہ تو ہے کیا بات ہے؟“ عشرت نے پوچھا۔

”میرے وکیل کا فون تھا۔ ایک لون کے لیے ہم نے اپلائی کیا ہوا تھا۔“ تیمور نے سوچتے ہوئے کہا۔

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔“ عشرت نے کہا۔ ”کیونکہ یہ کیس دوسرے شہر میں فائل ہونا ہے، اس لئے وکیل صاحب آج گئے تھے۔ ایک اعتراض کی وجہ سے فائل جمع نہیں ہو سکی۔“ تیمور نے کہا۔ بظاہر ایاز بڑے سلجھے ہوئے طریقے سے اُن کے سامنے براجمان تھا لیکن اس کے کان کسی سانپ کی طرح تیمور اور عشرت کی باتوں کی طرف مبذول تھے۔ اس کے بعد تیمور اختصار کے ساتھ عشرت کو اس کیس کے بارے میں بتانے لگا۔

”ایاز..... ایم سوری اچانک یہ سب ہو گیا۔ پلیز محسوس نہ کرنا بس وکیل صاحب کو فارغ کرتے ہی کھانا کھاتے ہیں۔“ تیمور نے اچانک ایاز کو مخاطب کر کے معذرت خیز لہجے میں کہا۔

”نیور مائنڈ۔“ ایاز نے مسکرا کر کہا لیکن اُس نے تیمور کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ کچھ ٹھیک نہیں ہونے والا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد تیمور کا وکیل بھی آ گیا۔ اُس نے پہلے یہ تفصیل بتائی کہ کاغذات کیوں جمع نہیں ہوئے۔ وجہ جان کر ایاز کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ پھر وکیل نے ایک فائل تیمور کے

اُس کے سامنے بہت مزیدار کھانا پڑا تھا لیکن اس کے حلق سے نیچے کوئی لقمہ نہیں اتر رہا تھا اُس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایسا ہو جائے گا۔

”ایاز..... بھئی کب آرہی ہے تمہاری فیملی۔“ تیمور نے اچانک پوچھا۔

”بس دو، تین دنوں میں آرہے ہیں۔“ ایاز نے بمشکل جواب دیا۔

”میں چاہتا ہوں کہ ہم جلد تمہاری فیملی سے مل لیں۔“ تیمور نے اس کا جائزہ لینے ہوئے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ ایاز نے کہا اور پانی کے دو گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اتار کر اُس نے اپنے خشک گلے کو تر کیا۔

”تم اچانک کچھ پریشان اور کھوئے سے ہو گئے ہو۔ کیا بات ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”نہیں کوئی بات نہیں ہے۔“ ایاز مسکرایا۔

”مجھے لگ رہا ہے۔“ تیمور نے اس کی طرف دیکھا۔

”ایسا آپ کو لگ رہا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ عشرت نے کہا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ٹھیک سے کھا بھی نہیں رہے۔“ تیمور نے اس کی پلیٹ کی طرف دیکھا۔

”میری اتنی ہی خوراک ہے۔“ ایاز نے بہانہ بنایا۔

”ارے تم جیسے نوجوان کے لیے یہ کیا ہے۔ اتنا تو آنے میں نمک کے برابر ہے۔ یہ لو اور لو۔“ تیمور نے ٹرے اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

”شکریہ..... میں ان میں سے نہیں ہوں جو کھانے کے لیے جیتے ہیں۔“ ایاز نے کہا۔

”تو تم کس لئے جی رہے ہو؟“ تیمور نے اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”ایاز ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کھانے کے لیے نہیں بلکہ جینے کے لیے کھانا چاہیے۔“ عشرت نے پھر جلدی سے لقمہ دیا۔

ایاز نے اپنی پلیٹ ختم کی اور جانے کے لیے سوچنے لگا کہ کیسے وہ اجازت لے کر یہاں سے نکلے۔ تیمور کھانے کی میز سے اُسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دونوں باہر آ گئے۔ ایاز اس کی ایک بات بھی نہیں سن رہا تھا۔ اسے اس جگہ سے جانے کی جلدی تھی اور پھر اُس نے جانے کی اجازت مانگ ہی لی۔

تیمور اُسے گیٹ تک خود چھوڑنے کے لیے آیا تھا۔ جب اس کی کار اس گھر کی دہلیز سے نکل گئی تو تیمور نے اوپر کھڑکی میں کھڑی عشرت کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ تیمور نے

نازلی کے فائل پر دستخط کرنے کے بعد ایاز کے چہرے سے بہت کچھ پڑھ لیا تھا۔ نازلی اپنے کمرے میں خوش تھی کہ اس کے بھائی نے ایاز کی اس گھر میں جیسی آؤ بھگت اور عزت کی ہے، وہ اس کے لیے اطمینان کا باعث تھی۔

ایاز کارپوں چلا رہا تھا جیسے وہ کسی میں مار دے گا۔ اُس کے دل و دماغ میں ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ، یہ کیا ہو گیا ہے؟

ایاز نے کار سیدھی طارق کے دفتر کے سامنے روک دی۔ جس طرح اُس نے کار کی بریک لگائی تھی طارق بھی اپنی کرسی پر بیٹھا یہ دیکھ کر ایک بار چوٹکا تھا۔ کار کا انجن بند ہو گیا تھا۔ ایاز کم صم اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ جب طارق نے دیکھا کہ ایاز کار سے باہر نہیں نکلا تو وہ اٹھ کر کار میں اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”کیا بات ہے؟ بہت پریشان ہو۔“ طارق نے پوچھا۔

”گزر بڑ ہو گئی ہے۔“ ایاز نے کھوئے انداز میں کہا۔

”کیا ہو گیا ہے۔“ طارق نے اس کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

ایاز کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ طارق کو اس سے آگاہ کرے۔ اُس نے ساری بات طارق کے گوش گزار دی اور پھر بولا۔ ”نازلی نے نہ آؤ دیکھا اور نہ تاؤ کاغذات پر دستخط کر دیئے۔“

طارق نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد سوچا اور پھر بولا۔ ”میں ساری بات سمجھ گیا ہوں۔ یہ کھانے کی دعوت ایسے ہی نہیں دی گئی۔ اُس کا بھائی تمہاری سوچ سے بھی کہیں زیادہ شاطر ہے۔“

”وہ کیسے؟“ ایاز نے پوچھا۔

”یہ کوئی لون کا چکر نہیں ہے اور نہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ میں خود لوگوں کو لون لے کر دیتا ہوں۔ تمہارا اس کے بھائی نے شکار کر لیا ہے اور وہ بھی بندوق میں بغیر کسی کارٹوس کے۔“ طارق نے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ ایاز کی حیرت میں دو چند اضافہ ہو گیا تھا۔

”سیدھی بات ہے۔ تمہیں کھانے پر بلایا اور پھر وکیل کا ڈرامہ رچا دیا۔ نازلی نے دستخط کر دیئے۔ یہ تمہیں بتایا گیا ہے کہ جس لڑکی سے تم شادی کرنا چاہتے ہو اس کے ہاتھ کچھ نہیں ہے۔ ساری جائیداد اس کے بھائی کی ہے۔ بہن کے نام گھر میں پڑا فضول گلہان بھی نہیں ہے۔ اب تم اسے اپنا ناچا ہو تو ٹھیک ہے ورنہ چھوڑ دو..... ابھی۔“ طارق نے اُسے سمجھانے

کے انداز میں کہا۔ ایاز حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر جا رہا تھا۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو؟“ ایاز کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔ اس کی سمجھ میں طارق کی بات آرہی تھی۔

”شاید نہیں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ تم پر واضح کر دیا گیا ہے کہ تم کو اس گھر سے ٹھنک بھی نہیں ملے گا۔ سوائے لڑکی کے۔“ طارق نے کہا۔ ”اپنا نام ہے ورنہ انکار کر دو۔“ ایاز کی حالت ایسی تھی جیسے کسی کی نگاہوں کے سامنے پیاز کا چھلکا ایک ایک کر کے اتر رہا ہو۔ ”ہاں..... مجھ پر یہی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔“

طارق نے پھر کہا۔ ”تم نے لڑکی کو اپنی محبت کے دام میں نہیں پھانسا بلکہ لڑکی نے تمہیں گرفت میں کیا ہوا ہے۔ تم دونوں دولت مند کی تلاش میں تھے اور ایک دوسرے کے دھوکے میں ہو تم دونوں۔“

اب تو ایسا کوئی ابہام نہیں رہا تھا کہ جس سے ایاز کوئی شک کرتا۔ طارق نے اس کے آگے ہر بات اپنی دانست کے مطابق کھول کر رکھ دی تھی۔ اُس نے بھی سوچ لیا تھا کہ نازی کو اپنے بھائی کے آگے اپنی حیثیت کا پتہ تھا۔ اس لئے وہ بھی اس کے ساتھ محبت کا کھیل کھیل رہی تھی۔ تاکہ وہ اس سے شادی کرنے کے بعد ایک آسودہ زندگی گزار سکے۔

طارق نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر کار کی چابی خود ہی نکال لی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج سے میں تمہیں کار نہیں دوں گا اور یہ بتاؤ کہ میری رقم کیسے اور کب دو گے؟“

”آنکھیں پھیر لیں تم نے؟“ ایاز نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تمہاری انتہا دیکھ کر میں نے آنکھیں پھیری ہیں۔ اب تم اپنا چھو گے ہو۔ مجھے میری رقم کے بارے میں بتاؤ کب اور کیسے دو گے؟“ طارق نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”میں یہ کھیل اتنی آسانی کے ساتھ ختم نہیں ہونے دوں گا۔“ ایاز نے مصمم ارادے سے کہا۔

”کیا کرو گے تم؟“ طارق نے پوچھا۔

”میں اپنے آپ کو برباد نہیں ہونے دوں گا۔ میں نازی کو اس طرح سے الوداع نہیں کہوں گا کہ میری دونوں ہتھیلیاں خالی ہی رہ جائیں۔“ ایاز نے کہا۔

”اب کچھ نہیں ہوگا۔ اب وہ تمہارا کل تک انتظار کریں گے کہ کیا تم یہ جان کر بھی کہ نازی کے ہاتھ کچھ نہیں ہے تم آتے ہو؟ تم نہیں جاؤ گے تو نازی تمہیں ماضی کی طرح بھول جائے گی۔“ طارق نے کہا۔

”میں نے جو داؤ کھیلا ہے وہ خالی نہیں جانے دوں گا۔ میں نازی سے کل ملوں گا اور تم دیکھنا کہ میں اب کیا کرتا ہوں۔“ ایاز نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا اور کار سے باہر نکلے گا تو طارق نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”پیارے ایک بات یاد رکھنا۔ کچھ ہوتا ہے کہ نہیں ہوتا تم مجھے پیسے دو گے۔ اب میں کوئی مہلت نہیں دوں گا۔“

”ہر وقت مجھے تم یہی نہ سناتے رہا کرو۔“ ایاز نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

”ریس کا گھوڑا زخمی ہو جائے تو وہ دوڑ سے باہر ہو جاتا ہے۔ تم تو مجھے لگتا ہے لنگڑے ہو گئے ہو۔“ طارق نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ایاز نے اس کی طرف دیکھا اور اپنا بازو چھڑا کر چلا گیا۔

ایاز سیدھا اپنے گھر چلا گیا۔ دروازہ اُس کی ماں نے کھولا تھا۔ ایاز کی ماں کا نام نگہت تھا۔ اُس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی لیکن اُس نے اپنے آپ کو فیشن کے ساتھ اس طرح سے منسلک کر رکھا تھا کہ وہ اتنی عمر کی لگتی نہیں تھی، جتنی کہ وہ تھی۔

نگہت شروع سے ہی آزاد خیال عورت تھی۔ اس کی کبھی بھی ایاز کے باپ سے نہیں بنی تھی۔ دونوں کی سوچیں الگ الگ تھیں۔ ان کی شادی جلد ہی طلاق پر ختم ہو گئی تھی۔ ایاز سے ایک بڑی بیٹی ارم تھی۔ نگہت نے اپنے گھر کے پاس ہی کمرشل مارکیٹ میں بیوٹی پارلر اور بوتیک بنالیا تھا۔ اس جگہ اب اس کے ساتھ ارم بھی ہوتی تھی۔

”کیا بات ہے بہت اُداس لگ رہے ہو؟“ نگہت نے ایاز کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ ایاز نے کہہ کر جانا چاہا۔

”کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ اُس سے لڑائی تو نہیں ہو گئی..... کیا نام ہے اس کا.....“ نگہت یاد کرتے ہوئے بولی۔

”نازی صاحبہ۔“ اچانک ایک کمرے سے ارم نے نکل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... میری ہونے والی بہو نازی۔“ نگہت نے کہا۔

”میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ ایاز نے کہا اور اپنے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

نگہت نے بات کر کے اُسے پھر سے روک لیا۔ ”ایاز تم واقعی سنجیدہ دکھائی دے رہے



ہو۔ کیا بات ہے۔ مجھے بتاؤ۔“

”آپ کے مطلب کی بات نہیں ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”پھر وہ بات کریں جو میرے مطلب کی ہے۔“ نگہت نے متانت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بولیں..... کہ میں کوئی کام کیوں نہیں کرتا ہوں۔ کہیں کوئی نوکری کے لیے بھاگ دوڑ کیوں نہیں کر رہا۔ جو میرے ساتھ پڑھتے تھے وہ نوکریاں کر رہے ہیں اور ایک تم ہو کہ کسی آوارہ کی طرح نہ جانے کہاں دن اور رات گزارتے ہو۔ یہ ہی کہنا تھا آپ کو؟ میں نے کہہ دیا۔ کچھ اور کہنا ہے تو وہ آپ کہہ دیجئے۔“ ایاز نے غصے سے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ میرے ساتھ اس لہجے میں بات مت کیا کرو۔ تمہارے باپ کی جھلک مجھے دکھائی دینے لگتی ہے۔“ نگہت نے دانت پیس کر کہا۔ اُسے بھی غصہ آ گیا تھا۔

”مجھ میں اگر میرے باپ کی جھلک ہے تو کیجئے مجھ سے بھی نفرت۔“ ایاز اس کے پاس آ کر بولا۔ ”نکال دیں مجھے بھی اس گھر سے۔“

”جس دن میں نے فیصلہ کر لیا تمہیں بھی اس گھر سے نکال دوں گی۔ رشتوں کی زنجیر پہن کر میں نے اپنی زندگی برباد کرنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ تمہارے باپ کی کبھی میں نے نہیں مانی تھی اور نہ کبھی سنی تھی۔ تم کیا ہو۔“ نگہت نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح کہا جیسے اس کے سامنے اس کا بیٹا نہیں کوئی اور ہی کھڑا ہے۔ اُس کے لہجے میں سختی تھی۔

”ہاں میں کیا ہوں۔ کاش آپ نے ہمارے باپ کے ساتھ بنا کر رکھی ہوتی تو ہم بھی کچھ ہوتے۔“ ایاز نے کہا۔

”شکر کرو اُس شخص کا سایہ تم پر نہیں ہے ورنہ آج جس چھت تلے رہ رہے ہو، یہ بھی نہ ہوتی۔ روز مجھ سے جیب خرچ لے کر جو اس گھر سے نکلتے ہو، باپ سے ایک پھوٹی کوڑی نہ ملتی۔“ نگہت نے زعم سے کہا۔

ایاز نے اپنی ماں کی طرف دیکھ کر پُر دم آنکھوں سے کہا۔ ”پھوٹی کوڑی نہ ملتی... لیکن میرے ہاتھ میں میرے باپ کی انگلی تو ہوتی۔ مجھے گرنے سے پہلے تھانے والے ہاتھ تو ہوتے۔“ ایاز نے کہا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔

”ہونہہ... بات کرتا ہے۔ اب چلے جاؤ اپنے باپ کے پاس۔ کیوں اس گھر میں پڑے

ہوئے ہو۔“ نگہت چیخی۔

”چھوڑو امی... تم بھی کیا ایاز سے بحث کرنے بیٹھ جاتی ہو۔“ ارم نے لاپرواہی سے نیل کمر کے ساتھ اپنے ناخن رگڑتے ہوئے کہا۔

”بہت باتیں کرنے لگا ہے۔“ نگہت نے کہا۔

”وہ باتیں کرتا ہے تو تم سن کر کان سے نکال دیا کرو۔“ ارم نے کہا۔

”باپ کی بات کرتا ہے۔“ نگہت نے نفرت سے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”ہم بھی کب مذاق کے موڈ میں ہیں۔ ارے جلدی سے بہو لے آؤ۔ ہمیں اپنے بوتیک میں ایک لڑکی کی ضرورت ہے۔“ نگہت نے پیچھے سے آواز دی۔ اس کے ساتھ ہی ارم بھی ہنس پڑی۔ دونوں ماں بیٹی میں بہت ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وہ اکثر ایاز کو ایسی باتوں سے چھیڑا کرتی تھیں۔

وہ رات ایاز جاگ کر نازلی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نازلی اپنے بھائی کے ساتھ شامل تھی کہ اُس کے بھائی نے نازلی کو اندھیرے میں رکھ کر خود اس کے ساتھ چال کھیلی ہے؟

ایاز اس کھیل کو اتنی آسانی کے ساتھ ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور دوسرے دن پھر لائبریری نازلی سے ملنے کے لیے پہنچ گیا۔ اچانک ایاز کو دیکھ کر نازلی کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

”تمہیں پتہ تھا کہ میں یہاں آ رہی ہوں؟“ نازلی نے پوچھا۔

”ہاں پتہ تھا۔“ ایاز نے بتایا۔

”کیسے پتہ چلا؟“ نازلی نے پوچھا۔

”میرے دل نے کہا تھا کہ تم یہاں آ رہی ہو۔“ ایاز نے مسکرا کر کہا۔

دونوں مزید لائبریری کے اندر اس طرح کھسر پھسر نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ باہر آ گئے۔ ایاز تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ بات سے بات نکال کر وہ اُس موضوع پر آ گیا جس کے لیے اس نے رات جاگ کر گزار دی تھی۔

”کل میں نے تمہاری بھائی کے ساتھ محبت دیکھی تو دل حیرت اور خوشی سے سرشار ہو گیا۔“

”کیا دیکھا تم نے؟“ نازلی نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”تم اپنے بھائی پر کتنا اعتماد کرتی ہو۔ تمہارے بھائی نے اپنے منہ سے الفاظ نکالے اور

تم نے بغیر سوچے اُن کو پورا کر دیا۔“ ایاز نے اس کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے کیا دیکھا اور کیا کہہ رہے ہو مجھے سمجھ نہیں آرہی ہے۔“ نازی نے کہا۔

”بھائی نے کہا اور بہن نے کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ ایک بھائی کے لیے..... پیسے کی کوئی اہمیت نہیں۔ واہ۔“ ایاز نے کہا۔

نازی اس کی بات سن کر نفی۔ ”ارے وہ، میں سمجھی پتہ نہیں تم کیا کہنے والے ہو۔ بھائی اپنا کاروبار بڑھانا چاہتے ہیں۔ میری وجہ سے ان کے کاروبار میں رکاوٹ آئے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”ویسے تو مجھے یہ بات کہنے کا کوئی اختیار نہیں ہے لیکن پھر بھی اگر تم غصہ نہ کرو تو میں کہہ دیتا ہوں۔“ ایاز رک رک کر بولا۔

”ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“ نازی نے اس کی طرف دیکھا۔

ایاز نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر بولا۔ ”رہنے دو، یہ تم بہن بھائی کا معاملہ ہے۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو، بولو۔“ نازی نے کہا۔

”شاید تمہیں میری بات اچھی نہ لگے لیکن میں کہے دیتا ہوں۔ دیکھو نازی ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی اور تم نے بھائی کو یہ لکھ کر دے دیا کہ تم اس کی کسی جائیداد میں حصے دار نہیں ہو۔ اگر تم یہ اپنی شادی تک نہ لکھتی تو میرا خیال ہے کہ اچھا فیصلہ ہوتا۔“ ایاز نے بڑے زریک انداز میں کہا۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ نازی نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”دیکھو..... اس طرح لکھ کر دینے سے اب تمہارے بھائی کا کوئی مطلب تم سے نہیں رہا۔ دنیا کا یہ اصول ہے کہ کسی نے کسی چیز نے دوسرے کو باندھ رکھا ہے۔ اُس گھر سے ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ذرا سوچو کل تک تمہارے بڑے بھائی صاحب تمہاری بات سننے اور ماننے کے لیے تیار ہوتے تھے، کیونکہ انہیں تم سے مطلب تھا۔ اب تم سے انہیں کوئی مطلب نہیں ہے۔ اُن کا دل کرے تو وہ ہمارے رشتے کو بھی توڑ دیں اور اپنی مرضی ٹھونس دیں۔“ ایاز نے بات اس انداز میں کی کہ نازی ایک لمحے کے لیے چپ ہو گئی۔

”نہیں میرے بھائی ایسے نہیں ہیں۔“ نازی نے یک دم اپنا سر جھٹک کر کہا۔

”میں کب کہہ رہا ہوں کہ وہ ایسے ہیں۔ ایسا ہی میرے تایا جان نے میرے ابو سے کیا تھا۔ ادھر دستخط ہوئے اور ادھر میرے ابو کا سامان سڑک پر آ گیا۔“ ایاز نے کہا۔

نازی کے دل میں باتوں کی کاشت کے ساتھ شک کا بیج ڈال دیا تھا۔ یک دم اُسے ایاز کی بات میں دم نظر آنے لگا تھا۔ ایاز نے دیکھا کہ جس طرح کورے کاغذ پر کھینچی گئی لکیر جلد عیاں ہو جاتی ہے، اس طرح نازی کی آنکھوں میں اُسے شکوک کے رنگ دکھائی دینے لگے ہیں تو اُس نے فوراً کہا۔

”ہمارے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن نازی کیا تمہیں ایسا نہیں لگا کہ تمہارے بھائی صاحب نے کھانے کے بہانے مجھے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس کی بہن اس کے ٹکڑوں پر پلنے والی ایک لڑکی ہے۔ اس کے نام پھونی کوڑی بھی نہیں ہے۔ دیکھو یہ کیس فائل کرنے والا تو مجھے ایک ڈرامہ ہی لگا ہے۔ ایم سوری نازی شاید تمہیں میری باتیں اچھی نہ لگ رہی ہوں لیکن میں نے کبھی اپنے دل میں کوئی بات نہیں رکھی اور یہ بھی سن لو..... میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ میرے پاس بہت پیسہ ہے۔ جو تمہارا ہو جائے گا لیکن تمہارے بھائی کا یہ انداز مجھے کچھ اچھا نہیں لگا اور تم نے بھی فیصلہ کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس گھر سے رخصت ہونے سے پہلے ہی تم نے اپنا رشتہ بھائی کے ساتھ کمزور کر لیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ آج وہی رشتہ مضبوط ہے جس میں دولت کی گرہ بھی ہوتی ہے۔“

نازی کو بھی جیسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ رات جو بھی ہوا وہ واقعی یہ باور کرانے کی ایک کوشش تھی کہ، ایاز کو بتا دیا جائے کہ نازی کے نام کچھ نہیں ہے۔ پہلی بار اُسے یہ بھی احساس ہو گیا کہ وہ اپنے بھائی کے ٹکڑوں پر پلنے والی ایک لڑکی ہے۔ ایاز جو بھی کہہ رہا ہے وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔

ایاز نے ایک اور تیر چلایا۔ ”مجھے تو یہ لگا ہے جیسے قیمت لگائی گئی ہے، تمہاری محبت کی..... ایک طرف میں تھا اور دوسری طرف جائیداد۔ اگر تم اس وقت دستخط کرنے سے انکار کر دیتی تو شاید مجھے تمہاری زندگی سے کہیں دور جانا پڑتا لیکن ابھی یہ بھی فائل نہیں ہے۔ اب آگے تمہارے بھائی صاحب کیا چال چلتے ہیں۔ بساط اُن کے سامنے ہے۔“

نازی سوچوں کے ہمنور میں جھکولے کھاتی کشتی کی طرح تھی۔ صاف ذہن میں بہت سے سیاہ لکیریں کھینچ دی گئی تھیں۔

”خیر چھوڑو اُن باتوں کو آؤ کچھ کھاتے ہیں۔“ ایاز نے اس کا جائزہ لیا اور کہا۔

”ایاز.....“ اچانک نازی نے متانت سے اسے پکارا۔

”ہاں بولو۔“ ایاز اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”اس دنیا میں میرا بھائی کے علاوہ اور ہے کون۔ کیا واقعی ہمیں کچھ بتانے کی کوشش ہے بھائی نے؟“ نازی نے کہا۔ ”کیا تمہاری اس بات میں سچائی ہے کہ ہم کسی نہ کسی گرہ میں بندھے ہوئے ہیں۔ گرہ کھل جائے تو آنکھیں بھی پھر جاتی ہیں؟“

”مجھے تو کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔“ ایاز نے کہا۔ نازی چپ ہو کر سوچنے لگی اور پھر جیسے اس کے لیے اس جگہ بیٹھنا مشکل ہو گیا ہو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بے چین ہو گئی تھی۔

”میں جا رہی ہوں۔“

”ارے بیٹھ جاؤ۔ ابھی تو ہم نے کوئی بات ہی نہیں کی۔“ ایاز نے جلدی سے کہا۔

”میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ نازی نے کہا۔

”گھبرانے والی کیا بات ہے۔ میں ہوں ناں۔ جو کچھ میرا ہے وہ تمہارا ہوگا۔ خود شکوک مار دو ہر چیز کو۔“ ایاز نے چالاکی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”لیکن تمہارے بھائی نے ایک چال کھیلی ہے۔ ایک ڈرامہ کیا ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ کیا تھا اگر صاف کہہ دیا جاتا ہے کہ میں اپنی بہن کو کچھ نہیں دوں گا۔ اس کا میری جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ کچھ جانے کا افسوس نہیں ہے لیکن اگر تمہارے بھائی نے ہمیں الگ کرنے کی کوشش کی تو، اس بات کا مجھے ڈر ہے۔“

ایاز نے اپنی نگاہیں میڑھی کر کے نازی کا بچھا ہوا چہرہ دیکھا اور پھر چپ ہو گیا۔ نازی وہاں سے چلی گئی۔ اُس کے دل و دماغ پر بہت سے شکوک تھے۔

اب یہ اتفاق ہی تھا کہ جیسے ہی وہ مین روڈ پر آئی اس کی نگاہ اُن وکیل صاحب پر جا پڑی جو رات کاغذات پر دستخط کرانے کے لیے آئے تھے۔ جنہوں نے یہ کہا تھا کہ انہیں صبح سویرے ہی دوسرے شہر کے لیے روانہ ہونا ہے۔ نازی کے لئے اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ایاز کی ہر بات کو تسلیم کر لے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کے بھائی نے اُس کے ساتھ چکر کھیلایا ہے۔ پہلی بار بھائی کے لیے اس کے دل کی زمین پر زہر کی ایک بوند گری تھی۔

☆=====☆=====☆

نازی نے عشرت کے ساتھ بھی اُس دن کوئی خاص بات نہیں کی تھی۔ وہ اپنے اندیشوں اور خوف کے ساتھ اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔ ایاز نے نازی کی خیریت جاننے کے بہانے اُسے وقفے وقفے سے دونوں بھی کر دیئے تھے۔ اُس نے نازی کو اپنی باتوں کی گرفت میں اس

طرح سے لے لیا تھا کہ وہ ایاز کی بات پر دھیان دینے لگی تھی۔ ایاز بھی بڑی مستعدی سے نازی کے دل پر تیور کے لیے زہر پکاتا جا رہا تھا۔

دونوں میں ایاز نے نازی کا ذہن بہت حد تک بدل دیا تھا۔ اب ایاز سوچنے لگا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اب کون سی چال کھیل کر وہ ہاتھ سے گئی دولت کو پھر سے نازی کی دسترس میں کر سکے۔

اس کے لیے وہ طارق کے پاس چلا گیا۔ پہلے طارق نے اس کی بات غور سے سنی اور پھر اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اپنی دراز سے ایک رجسٹر نکالا اور اُسے کھول کر ایاز کے آگے کر دیا۔

ایاز نے ایک نظر رجسٹر کی طرف دیکھا اور متحیر لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”یہ تیرا مکمل حساب ہے۔ دیکھ لے کتنے پیسے ہیں تیری طرف۔“ طارق نے اطمینان سے کہا۔

”میں تم سے کچھ اور پوچھ رہا ہوں اور تم مجھے کوئی راستہ بتانے کی بجائے یہ حساب دکھا رہے ہو؟“ ایاز نے بگڑ کر کہا۔

”پہلے یہ دکھانا ضروری ہے۔“ طارق نے پھر اپنی دراز کھولی۔

”مجھے یاد ہے کہ میں نے تمہارے کتنے پیسے دیئے ہیں۔ ہر وقت مجھے یہی نہ بتاتے رہا کرو۔“ ایاز نے رجسٹر ایک دھماکے سے بند کیا اور اس کی طرف دھکیل دیا۔ اسی اثنا میں طارق نے ایک فائل نکال لی تھی۔ اُس فائل کے اندر ایک اسٹامپ پیپر لگا ہوا تھا۔ جس پر ایک تحریر کے ساتھ جتنے روپے اُس نے ایاز سے لینے تھے وہ بھی تفصیل کے ساتھ لکھے ہوئے تھے۔

”اب ذرا اس پر بھی نظر ڈالو۔“ طارق نے وہ فائل اس کے آگے رکھ دی اور ہاتھ میں پکڑی فائل کو اپنے دانتوں میں دبایا۔

ایاز نے وہ کاغذ پڑھا اور اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر نرم پڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہاں ٹھیک ہے میں نے کہہ دیا ہے کہ تمہارا حساب ٹھیک ہے۔“

”ٹھیک کیوں نہیں ہوگا میں نے ہر چیز بڑی ایمانداری سے لکھی ہے۔ یہ لو اس پر اپنے دستخط کر دو۔“ طارق نے فائل اپنے دانتوں سے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”دستخط کی کیا ضرورت ہے۔ بس ٹھیک ہے۔ ایک ایک پائی تمہاری چکتا ہو جائے گی۔“ ایاز نے کہا۔

”تم میری ایک ایک پائی ہی چکتا کرو گے۔ یہ میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو لیکن دستخط کرنا بہت ضروری ہے۔“ طارق نے اس کی آنکھوں میں اپنی سُرخ آنکھیں پیوست کرتے ہوئے کہا۔ اُس کا لہجہ ایسا تھا کہ ایاز کو لگا جیسے اس کے خون میں سنسنی دوڑ گئی ہے۔

”جب تم جانتے ہو کہ میں نے دینے ہیں اور تم نے لینے ہیں تو پھر اس پر دستخط کی کیا ضرورت ہے۔“ ایاز نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں تغیر آ گیا تھا۔ وہ بالکل نرم لہجے میں بات کرنے لگا تھا۔

”اپنا اور میرا وقت ضائع مت کرو اور دستخط کرو۔ میں نے تمہیں یہ بھی بتانا ہے کہ اب تم نازلی کو کیا مشورہ دو۔“ طارق نے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ کر مزید آنکھیں نکالیں۔

ایاز نے کچھ دیر سوچا اور پھر اس کا غز پر دستخط کر دیئے۔ طارق نے غور سے دستخط دیکھے، فائل اپنی دراز میں رکھی اور پھر اُس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا۔ ایک طریقہ بتاتا ہوں۔ اگر مجھے کوئی جلدی کی اُمید نظر آئی تو ٹھیک، ورنہ تم کہیں سے بھی اور کیسے بھی میری رقم مجھے واپس کرو گے۔ ورنہ پھر مجھ سے کم از کم یہ اُمید نہ رکھنا کہ میں کوئی نرمی کروں گا۔“

”کیا بتانے والے ہو تم۔“ ایاز نے ایک بار پھر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”میں تمہیں ایک خاص وکیل کا پتہ دیتا ہوں۔ ناجائز کاموں کو جائز کروانا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کیس اتنی مضبوطی سے کسی جال کی طرح بنتا ہے کہ سچ کسی پرندے کی طرح اس جال میں پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔“ طارق نے متانت سے کہا۔

”ہاں مجھے کسی ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔“ ایاز مضطرب ہو کر بولا۔ طارق نے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”اس کے پاس چلے جاؤ۔ میں اس کو فون کر دوں گا۔“

”اس کی فیس کیا ہوگی؟“ ایاز نے پوچھا۔

”دوسروں سے کچھ رعایت کر دے گا۔“ طارق نے کہا۔

”فیس کیا پہلے لے گا؟“ ایاز نے پوچھا۔

”فیس وہ پہلے لے گا لیکن گارنٹی ہے کہ بہت جلد وہ بھائی سے ایک بہن کو جائیداد میں حصہ لے دے گا۔“ طارق نے کہا۔ ایاز چیپ ہو کر سوچنے لگا۔ طارق نے دیکھ کر پوچھا۔ ”اب

کیا سوچ رہے ہو؟“

”میں وکیل کو فیس کہاں سے دوں گا؟“ ایاز نے کہا۔

طارق ہنسا۔ ”تمہاری ساری فیملی باہر ہے۔ ڈالر منگوا لو۔“

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ ایاز نے کہا۔

”مجھ سے تو اُمید مت رکھنا کہ میں اس معاملے میں کچھ کروں گا۔ یہ تمہیں ہی کرنا

ہوگا۔“ طارق نے صاف کہا۔

”کیا تم..... میرا مطلب ہے کہ جہاں اُدھار لکھا ہے وہاں اور بھی لکھ لو۔“ ایاز نے رک

رک کر کہا۔

”نہیں..... نہیں..... اب میں تم سے پیسے وصول کروں گا۔ تمہارے نام مزید نہیں

لکھوں گا اور تم کیوں پریشان ہو۔ ایک ایسا سولڈ جھوٹ اور گھڑ لو۔ نازلی کے پاس کچھ سونا تو

ہوگا ہی۔ وکیل کی فیس کے لیے بیچ دے، کیا ہے۔“ طارق نے کہا۔ ”میں نے اس کے بازو

میں سونے کے دو کڑے تو دیکھے ہیں۔“

ایاز سوچنے لگا کہ وہ کیسے نازلی سے پیسے مانگے۔ بہر حال ایک جھوٹ تو اُسے تراشا ہی

تھا۔

ایاز نے سوچ لیا تھا کہ وہ نازلی سے وکیل کی فیس کے لیے کیسے پیسے مانگے گا۔ اُس نے

یہ بھی پتہ کرا لیا تھا کہ جس وکیل کے بارے میں طارق نے بتایا تھا، وہ کیسا ہے۔ یہ جان کر

اُسے حیرت ہوئی تھی کہ وہ وکیل ایسے ہی کاموں کے لئے مشہور ہے۔ سچ اس کی دلہیز سے

کوسوں دور رہتا ہے اور جھوٹ پالتو طوطے کی طرح اس کے کندھے پر براجمان رہتا ہے۔

طارق کے حوالے سے ایاز نے ایک ملاقات اس وکیل سے کر بھی لی تھی۔ ساری بات

سن کر وکیل نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ، وہ یہ کیس اس طرح سے جیت جائے گا جیسے

کرکٹ میں مضبوط ٹیم کے مد مقابل ایک کمزور ٹیم ہو اور وہ اس کیس کو زیادہ لٹکنے بھی نہیں دے

گا۔ اس کے پاس بہت سے مہرے ہیں، جو وہ عدالت میں استعمال کرتا رہتا ہے۔

وکیل کی فیس زیادہ تھی۔ طارق کی وجہ سے اس نے کچھ کم کی تھی۔ ساری تفصیل لینے کے

بعد وہ اس کے چیمبر سے باہر آ گیا تھا۔ وہ پوری طرح سے مطمئن تھا۔

ایاز کی جب نازلی سے ملاقات ہوئی تو اُس نے متانت سے اُسے بتایا۔ ”آج میری

امی اور بہنیں اسلام آباد سے واپس آ رہی تھیں لیکن ایک حادثے کی وجہ سے وہ پھر رک گئیں۔“

”حادثہ؟ کیا ہوا؟“ نازلی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”میرے خالو کا روڈ ایکسی ڈینٹ ہو گیا ہے۔ وہ ہسپتال میں ہیں اور انہیں بہت سی چوٹیں آئی ہیں۔“ ایاز نے کہا۔  
 ”ویری سیڈ۔“ نازی نے تاسف سے کہا۔

”میرے خالو کی اولاد نہیں ہے۔ بس دو میاں بیوی ہی ہیں۔ خدمت اور دیکھ بھال کے لیے..... امی کو رکنا پڑا۔“ ایاز نے کہا۔  
 ”کیا تم بھی جاؤ گے؟“ نازی نے پوچھا۔

”میں رات گیا تھا۔ ابھی واپس آ رہا ہوں۔ مجھ سے ایسی پچویشن برداشت نہیں ہوتی۔ میں کسی کو انکیشن لگتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ میری حالت دیکھ کر امی نے مجھے فوراً واپس بھیج دیا۔“ ایاز کا چہرہ اتر اتر ہوا تھا۔

دونوں کے درمیان کچھ خاموشی حائل ہو گئی۔ ایاز نے پوچھا۔ ”تم سناؤ تمہارے گھر کا ماحول ٹھیک ہے۔ میرا مطلب ہے کہ بھائی جان اور بھابی جان کا رویہ پہلے جیسا ہی ہے ناں؟“

”میں زیادہ اپنے کمرے میں بند رہتی ہوں۔ بھابی بھی میرا پوچھنے کے لیے میرے کمرے میں نہیں آتی ہیں۔ تم ٹھیک کہتے تھے کہ ہم سب کسی نہ کسی گرہ میں بندھے ہوئے ہیں۔ جو گرہ کھل جاتی ہے، وہاں خلا آ جاتا ہے۔“ نازی نے اُداس ہو کر کہا۔  
 ”چاہو تو تم یہ گرہ پھر سے باندھ سکتی ہو۔“ ایاز نے توقف کے بغیر کہا۔

نازی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیسے؟“  
 ”اگر تم ہمت کرو تو۔ اس لئے نہیں کہ تمہیں کچھ ملے بلکہ اس لئے کہ تمہارا بھائی تمہیں مل جائے۔“ ایاز نے کہا۔

”میں کیا کروں۔ تمہارے ذہن میں اگر کوئی تجویز ہے تو مجھے بتاؤ۔“ نازی نے کہا۔ وہ کچھ مضطرب سی ہو گئی تھی۔

ایاز نے ایک بار پھر بغیر توقف کے کہا۔ ”تم بھائی پر جائیداد کا کیس کر دو۔“  
 ایاز کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی نازی اس کی طرف دم بخود ہو کر دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے کوئی عجیب بات سن لی ہو۔ جیسے اس کے کان میں ایسے الفاظ پڑ گئے ہیں جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں سنے تھے۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ نازی نے حیرت میں ڈوب کر پوچھا۔  
 ”دیکھو میں نے محض تمہیں ایک تجویز دی ہے۔ مانو یا نہ مانو یہ تمہاری مرضی ہے۔ اگر تم

کیس جیت جاتی ہو۔ جو کہ تم جیت ہی جاؤ گی۔ تو تم اس جائیداد میں حصے دار بن جاؤ گی۔ تمہارا بھائی تمہیں مل جائے گا۔ جس گھر میں رہتی ہو، وہ تمہارے لئے اجنبی نہیں رہے گا۔“ ایاز نے کہا۔

نازی نے اس کے چہرے سے اپنی خیرہ نگاہیں ہٹا کر کہا۔ ”نہیں میں ایسا نہیں کروں گی۔“

”یہ تمہاری مرضی ہے۔ تم نے مجھ سے تجویز مانگی میں نے وہ تجویز تمہارے سامنے رکھ دی جو میرے ڈیڈی نے اپنائی تھی۔ جیسے ہی فیصلہ میرے ڈیڈی کے حق میں ہوا تھا میرے تایا جان پھر سے میرے ڈیڈی پر ناصر مہربان ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے معذرت بھی کی تھی۔“ ایاز نے ایک ہی سانس میں اپنی بات کہہ دی۔

نازی پھر سوچنے لگی۔ وہ بولی۔ ”یہ بہت مشکل کام ہے اور اپنے بھائی کے خلاف میں عدالت میں جاؤں؟“

”مشکل کام کوئی نہیں ہوتا۔ بس ہمت کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک بات۔ جب تم کیس جیت جاؤ گی۔ ہم ایک ہو جائیں گے تو تم اپنا حصہ اپنے بھائی کو گفٹ کر دینا۔ ساری زندگی تمہارا بھائی تمہاری اس اچھائی کے بوجھ تلے دبا رہے گا۔ جو سلوک اس نے تمہارے ساتھ کیا اور جو تم کو روکی وہ اس کے احسان میں ہی تمہارے سامنے کبھی سر اٹھانے کی ہمت نہیں کرے گا۔“ ایاز نے ایک کے بعد ایک تیر چھوڑا۔

نازی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ”میں اپنے بھائی کو کسی پچھتاوے میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔“

”لیکن ایک دن تم اور میں پچھتاوے کے انگاروں پر اپنے پیر جلاتے رہیں گے۔ جب تمہارے بھائی صاحب اپنی مرضی تم پر مسلط کر کے کسی بھیڑ بکری کی طرح تمہیں اپنے گھر کی دہلیز سے رخصت کر دیں گے۔ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے اب اُن کے آگے۔“ ایاز نے نازی کو طیش دلانے کے انداز میں کہا۔

یہ بات نازی کے دل پر جا لگی اور یک دم اس کا دل پلٹا۔ وہ سوچنے لگی کہ اب اس کے ہاتھ میں کیا ہے، جس سے اس کا بھائی اس کی مانے۔ بھائی اور بھابی کے دل میں نہ جانے کیا ہے۔ آنے والے وقت میں وہ اپنی عدالت میں اس کی زندگی کا کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ تو وہی جانتے ہیں۔

نازی نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کوئی وکیل ہے تمہاری نظر میں؟“

اس سوال نے جیسے ایاز کے جسم میں توانائی بھری ہو۔ وہ بولا۔ ”تم اپنا ذہن بنا لو میں کوئی اچھا وکیل دیکھ لیتا ہوں۔“

نازلی اپنے ہاتھوں کو بے چینی کی کیفیت میں دبا رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔ کل بات کریں گے۔“

”نازلی..... ایک راستہ اور بھی ہے میرے پاس۔ وہ یہ کہ تم سب کچھ چھوڑ کر میرے پاس آ جاؤ۔ ہم اپنی دنیا بسا لیتے ہیں لیکن میں وہ راستہ اپنانا نہیں چاہتا۔ تمہیں عزت سے اس گھر سے اپنے گھر تک لانا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم کو تمہارا بھائی اور بھابی دل سے عزت کے ساتھ رخصت کریں۔“ ایاز نے متانت سے کہا۔

نازلی نے ایک نظر ایاز پر ڈال کر کہا۔ ”ایسا ہی ہوگا۔“

”ایسا تب ہوگا جب تم چاہو گی۔“ ایاز نے کہا۔

”میں تو چاہتی ہوں کہ اچھا ہو۔“ نازلی نے کہا۔

”کیا خیال ہے کسی وکیل کے پاس ابھی چلیں؟“ ایاز نے بے صبرے کی طرح کہا۔

نازلی یک دم چونکی۔ ”ابھی..... نہیں میں سوچ لوں۔“

”تم کتنا سوچو گی؟“ ایاز نے کہا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ نازلی نے کہا۔

”اپنا حق مانگنے کے لیے بزدل لوگ ڈرتے ہیں۔“ ایاز نے بلا تامل کہا۔ ”تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ہم کل ملتے ہیں۔“ نازلی بولی۔

”تم ہمت سے کام لو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ ایاز نے کہا۔

”تم ساتھ ہو تو ہمت بھی آ جائے گی۔“ نازلی نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ایاز نے خوشی سے مکہ ہوا میں لہرایا۔ اس کا چھوڑا ہوا ہیرنشانے پر لگا تھا۔ اب اُسے پھر سے اُسید ہوگئی تھی کہ وہ نازلی کے ذریعے سے دولت پانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

جس وقت ایاز مسرت کے بادلوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا، اُس وقت تیمور کو اس کا خاص آدمی دلبر ساری تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا۔

دلبر کو تیمور نے اُسی دن سے نازلی اور ایاز کی گمرانی پر مامور کر دیا تھا جب سے اُس نے ایاز کو اپنے گھر کھانے پر بلایا تھا۔ دلبر نے بتایا تھا کہ ایاز کس وکیل سے ملا تھا اور اُس نے اس

کے بعد نازلی سے کہاں ملاقات کی تھی۔ اس کے علاوہ دلبر نے ایاز کے گھر کا پتہ اور اُس کی ماں اور بہن کا بونیک بھی تلاش کر لیا تھا۔ ایسے کاموں میں دلبر کسی کھوجی سے بھی بڑھ کر تھا۔

تیمور نے دلبر کی ہر بات غور سے سننے کے بعد سوچا کہ، ایاز کا وکیل کے پاس جانا اور اس کے بعد نازلی سے ملنا، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اُسے کیس کرنے پر اُکسارہا ہوگا۔ تیمور نے نفرت سے ایاز کے بارے میں سوچا۔

تیمور نے عشرت کو فون کر کے ایاز کی ماں کے بونیک کا پتہ دیا اور کہا کہ وہ ابھی اس جگہ جا کر کچھ خریداری کے بہانے جائزہ لے۔

دو گھنٹے کے بعد عشرت نے تیمور کو فون کیا اور اُسے ساری تفصیل سے آگاہ کرنے کے بعد ایک خاص چیز کے بارے میں بتایا تو تیمور کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کھیل کو اسی جگہ ختم کر دے گا۔ چنانچہ اُس نے عشرت کو کچھ ہدایت دی اور رابطہ منقطع کر دیا۔

اُسی شام جب نازلی اپنے کمرے میں بیٹھی بھائی پر کیس کرنے کے بارے میں دھڑکتے دل اور خوف زدہ چہرے کے ساتھ سوچ رہی تھی تو دروازے کی ہلکی دستک نے اُسے چونکا دیا۔

”یس۔“ نازلی کے منہ سے بمشکل نکلا۔

دروازہ کھلا اور عشرت اندر آ گئی۔ ”کیا بات ہے تم اپنے کمرے میں ہی بند رہنے لگی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک بنے ناں؟“

”ہاں بھابی بس ایسے ہی۔“ نازلی نے کہا۔

”اچھا چلو میرے ساتھ۔“ عشرت نے کہا۔

”کیا ناں؟“ نازلی نے اس کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

”مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔“ عشرت بولی۔

اُس نے چاہا کہ وہ کوئی بہانہ کر دے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔ اس کے منہ سے نکلا۔

”میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“

نازلی نے عشرت کے جانے کے بعد بیزار سے سوچا کہ اُس نے ایسا کیوں کہہ دیا۔ وہ چپ کھڑی رہی۔ اُس نے یہ بھی سوچا کہ وہ اب جا کر کوئی بہانہ کر دے، لیکن اُس نے اب کچھ کہنے کی بجائے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اُسے تیار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

کار عشرت ڈرائیو کر رہی تھی۔ وہ اُسے دو، تین شاپنگ سنٹرز سے گھماتی ہوئی ایاز کی ماں

کے بوتیک کے سامنے لے گئی۔

”کبھی تم اس بوتیک میں آئی ہو؟“ اچانک عشرت نے پوچھا۔

نازلی نے چونک کر اس بوتیک کی طرف دیکھا۔ ”نہیں۔“

”لگتا ہے کہ اچھا بوتیک ہے۔ آج اسے بھی چیک کریں۔“ عشرت نے کہہ کر کار پارک کر دی۔

گھٹت اور ارم نے اپنا بوتیک بہت خوبصورتی اور قرینے سے سجایا ہوا تھا۔ مختلف کپڑے بہترین انداز میں ہینگ کئے ہوئے تھے۔ کچھ خواتین ادھر ادھر اپنی پسند کے کپڑے دیکھ رہی تھیں۔

نازلی نے اندر کا جائزہ لیا تو اُسے بھی وہ بوتیک اچھا لگا۔ عشرت نے ایک نظر نازلی کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ”اچھا بوتیک ہے ناں۔“

”ہاں اچھا ہے۔“ نازلی نے جواب دیا۔

”میں آج دوپہر بھی اس جگہ آئی تھی۔ یہاں سے آگے میری دوست کا گھر ہے۔ میں اسے ملنے کے لیے آئی تو اس نے مجھے بتایا کہ یہ اچھا بوتیک ہے۔ میں نے جاتے جاتے اندر آ کر دیکھا اور سوچا کہ تمہارے ساتھ آکر شاپنگ کروں گی۔ آؤ کچھ دیکھتے ہیں۔“ عشرت نے بتاتے ہوئے کہا۔

عشرت نے دیکھا کہ گھٹت ایک خاتون سے بات کر رہی ہے۔ جبکہ ارم اس وقت اپنے بیوٹی پارلر میں تھی۔ گھٹت ایک ماڈرن عورت کے روپ میں بہت اچھی بھی لگ رہی تھی اور جتنی اس کی عمر تھی اس سے کم بھی نظر آ رہی تھی۔

عشرت نے اپنے لئے ایک سوٹ پسند کیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی نازلی نے بھی ایک سوٹ نکال ہی لیا۔ دونوں کاؤنٹر کی طرف چلے گئے جہاں اس وقت گھٹت براجمان ایک خاتون سے پیسے وصول کر رہی تھی۔

عشرت نے سوچا کہ یہ اچھا موقع ہے نازلی کو کاؤنٹر کے پاس لے جا کر کھڑے ہونے کا۔ خاتون سے فارغ ہو کر گھٹت نے کاروباری مسکراہٹ ان دونوں پر نچھاور کی اور کہا۔ ”جی۔“

”یہ پیک بھی کر دیجئے اور بل بھی بنا دیجئے۔“ عشرت نے کہہ کر دونوں سوٹ کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔ گھٹت نے پیک کرانے کے لیے ایک لڑکی کو بلایا اور سوٹ اس کے حوالے کر دیئے۔

”بہت خوبصورت بوتیک بنایا ہے آپ نے۔“ عشرت نے تعریف کی۔

”ہم نے تو کوشش کی ہے۔ خوبصورت تو اسے کسٹمر کی آنکھ بناتی ہے۔“ گھٹت نے کہا۔

عشرت نے اپنی کار کی چابی کاؤنٹر پر رکھ دی۔ اس کاؤنٹر پر ایک شیشہ تھا اور اس شیشے کے نیچے چند وزینگ کارڈ، ماڈلز کی تصاویر کے ساتھ جہاں عشرت نے کار کی چابی رکھی تھی وہاں ایاز کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔

”ہم کچھ اور بھی دیکھ لیں۔“ اچانک عشرت نے کہا اور نازلی کو اشارہ کیا۔ ابھی وہ دو قدم ہی چلے تھے کہ عشرت نے رک کر نازلی سے کہا۔ ”نازلی وہ چابی پکڑ لو۔“

نازلی اسی جگہ سے مڑی اور جیسے ہی اُس نے چابی اٹھائی اس کی نگاہ ایاز کی تصویر پر پڑی اور وہ چونک پڑی۔ اُس نے حیرت سے اس تصویر کی طرف دیکھا۔ اُسے حیرانی اس بات پر ہوئی تھی کہ اس بوتیک میں اس کی تصویر کیوں ہے؟

”کیا ہوا؟“ عشرت نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔

”یہ ایاز کی تصویر.....؟“ نازلی نے آہستہ سے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے بے اختیار کہا۔

عشرت نے تصویر کی طرف دیکھا اور نازلی کے کان میں بولی۔ ”ابھی بہانے سے پوچھ لیتے ہیں۔“

دونوں گھٹت کے سامنے کھڑی تھیں۔ عشرت کے کہنے پر گھٹت اُن کا بل بنانے لگی تھی۔ عشرت شیشے کے نیچے لگی ماڈلز کی تصاویر دیکھتے ہوئے اچانک ایاز کی تصویر پر اُننگی رکھ کر بولی۔ ”یہ بھی کیا ماڈل لڑکا ہے؟“

گھٹت نے بل بناتے ہوئے اچانک اپنی نگاہ اٹھا کر تصویر کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ”نہیں..... یہ میرا بیٹا ہے۔“

”بیٹا.....؟“ نازلی یک دم چونکی اور اُس نے زیر لب کہا۔

”آپ کا بیٹا؟“ عشرت نے مسکرا کر گھٹت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ تو خود ابھی یلگ لگ رہی ہیں اور ایک نوجوان بیٹا.....؟“

اپنے بارے میں تعریفی الفاظ سن کر گھٹت شرما کر مسکرائی اور بولی۔ ”یہ میرا سگا بیٹا ہے۔ اس کا نام ایاز ہے۔“ گھٹت نے کہہ کر اپنے بال ہاتھ سے ٹھیک کئے۔

یہ سن کر حیرت سے عشرت نے نازلی کی طرف دیکھا۔ نازلی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب سن رہی ہے۔

ایاز کے بارے میں مزید سوال کرنا یا کریدنا مناسب نہیں تھا۔ اُس لئے وہ چپ رہیں۔ سوٹ پیک ہو کر آگئے تھے۔ بل کی ادائیگی ہو گئی تھی۔ کاؤنٹر چھوڑنے سے پہلے نازلی نے ایک اور سوال کر دیا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ یہ ہمارے کالج میں پڑھتے ہیں اور یہ کار میں آتے جاتے ہیں؟“

”ایاز کو کار خریدنے کا بہت شوق ہے لیکن ابھی وہ بے کار ہی ہے۔“ نگہت نے ہنس کر بتایا اور اسی دوران دو خواتین اور کاؤنٹر پر آ گئیں۔ عشرت اور نازلی بونٹیک سے باہر آ گئیں۔ نازلی کے لیے یہ شدید ترین جھک تھا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس نے ایاز کے بارے میں ہی ایسا سنا ہے۔ سارے راستے میں عشرت کے ساتھ اس کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ نازلی گم صم کار میں بیٹھی رہی تھی۔ جیسے ہی گھر قریب آیا تو عشرت نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ”ایاز تو کہہ رہا تھا کہ اس کی ساری فیملی باہر ہے۔ اس کی ماں اور بہن اسلام آباد گئی ہوئی ہیں اور یہ سب.....“

”سب جھوٹ بولا ہے اُس نے۔“ نازلی نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

یہ بات نازلی کے منہ سے سن کر عشرت کو اطمینان ہوا تھا کہ اُس نے ایاز کے بارے میں اپنی رائے قائم کر لی ہے۔ ”وہ جھوٹا ہی ہے۔ تم سے پیار کا چکر چلا کر وہ کچھ اور حاصل کرنا چاہتا تھا شاید.....“

عشرت کی بات سن کر نازلی کو اس کے الفاظ یاد آ گئے۔ جب اُسی نے تیمور کے خلاف بات کی تھی۔ پہلی بار اُسی نے اس کے ذہن میں جائیداد کے بارے میں بات کی تھی۔ اُسی نے بتایا تھا کہ تمہارا بھائی تمہارے ساتھ چکر کھیل رہا ہے۔ بھائی کے خلاف اُسی نے زہر گھولا تھا اور اُسی نے کیس کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ حالانکہ جب اُس نے کاغذات پر دستخط کئے تھے تو اس کے ذہن کے کسی کونے میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس نے ٹھیک کیا ہے کہ غلط کیا ہے؟ اس کے ہاتھ دستخط کرنے کے بعد کیا رہا ہے اور کیا چلا گیا ہے۔ وہ تو پرسکون تھی۔ ایاز نے ہی اُسے مضطرب کیا تھا۔ وہ سب کچھ اپنے لئے کر رہا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ عشرت نے پوچھا۔

نازلی چوکی۔ ”سوچ رہی ہوں یہ دنیا باز میروں کی ہے؟“

”تم اپنے دل پر کوئی بات مت لگاؤ۔ تیمور سے بات کرتے ہیں۔ وہ آگئے ہوں گے۔“ عشرت نے کہا۔

نازلی چپ ہو گئی تھی۔ کار گھر کے سامنے رک گئی تھی۔ جب دونوں گھر میں داخل ہوئے

تو سامنے تیمور بیٹھا ہوا تھا۔ نازلی اپنے کمرے میں جانے لگی تو تیمور نے اُسے روک لیا۔ عشرت نے ساری بات سے آگاہ کر دیا۔ تیمور نے اپنے سامنے پڑے کاغذ کے ٹکڑوں کو ٹٹھی میں بھر کر نازلی کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ اُس کاغذ کے ٹکڑے ہیں جس پر تم نے ساری جائیداد سے سبکدوش ہونے کے دستخط کئے تھے۔ وہ ایک محض ڈرامہ تھا۔“

نازلی نے چونک کر اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ ”ڈرامہ؟“

”ہاں۔“ تیمور نے کہا۔ پھر تیمور نے وہ باتیں جو اُس نے ایاز کو اپنے دوست کے ساتھ کرتے ہوئے سنی تھیں وہ بیان کر دیں۔ پھر وہ بولا۔ ”ہم تمہیں ایاز کے بارے میں سب بتا دینا چاہتے تھے لیکن ہم نے سوچا تمہارے یقین کے لیے ثبوت کا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ تمہارے دل میں کوئی شک نہ ابھرے۔ اس لئے مجھے ایسا کرنا پڑا اور ایاز کھل کر ہمارے سامنے آ گیا۔“

نازلی کے سامنے اب سب کچھ کھل گیا تھا۔ اب کوئی ابہام نہیں رہا تھا کہ ایاز ایک فراڈ ہے اور اُس نے اپنی محبت کی بنیاد لالچ پر رکھی ہے۔ تیمور کے خلاف جائیداد کا کیس دراصل وہ اپنے لئے کرنا چاہتا تھا۔

”تم میری بہن ہو۔ اس جائیداد میں تم جھے دار ہو۔ ایسا کبھی مت سوچنا کہ تمہارا میری کسی چیز پر کوئی حق نہیں ہے۔“ تیمور نے پیار سے کہا۔

تیمور کے لیے جو بھی غلط فہمی نازلی کے دل میں تھی وہ معدوم ہو گئی تھی لیکن ایاز کے لیے نفرت کا زہر اس کے دل میں بھر گیا تھا۔ اُسی وقت اُس نے اپنے دل سے ایاز کا نام کھرچ دیا تھا۔

دوسرے دن نازلی نے خود فون کر کے ایاز کو بلا لیا تھا۔ ایاز کی دانست میں تھا کہ نازلی اب بھائی کے خلاف کیس کرنے کے لیے تیار ہوگی۔

”ایاز... اگر میں بھائی کے خلاف کیس کروں تو مجھے جائیداد میں حصہ ملے گا؟“ نازلی نے اُس سے پوچھا۔

”کیوں نہیں ملے گا۔“ ایاز نے فوراً کہا۔

”ایک بہن اپنے بھائی کو عدالت میں لاتی اچھی لگے گی کیا؟“ اُس نے پوچھا۔

”اپنے حق کے لیے ایسا تو کرنا ہی ہوگا۔“ ایاز نے جواب دیا۔

اچانک نازلی نے اس کی کار کی طرف دیکھا اور غولی۔ ”ایاز تمہارے پاس کتنی کاریں ہیں۔“



”تین۔“ ایاز نے بلاتامل جواب دیا۔ اس سوال پر اُسے حیرت ہوئی تھی۔  
 ”جب تم سب باہر شفٹ ہو جاؤ گے تو ان کاروں کا کیا کرو گے؟“ نازلی نے پوچھا۔  
 ”تم اصل بات سے ہٹ کر میری کاروں کی کیوں فکر کرنے لگی ہو؟“ ایاز نے سسکرا کر کہا۔

”میرے ذہن میں سوال آیا اور میں نے پوچھ لیا۔“ نازلی نے کہا۔ ”بتاؤ تم ان کاروں کا کیا کرو گے؟“

”یہ کھڑی رہیں گی۔ ملازم ہیں ناں ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے۔“ ایاز نے کہا۔  
 ”اگر تم وکیل سے ملنا چاہتی ہو تو آؤ چلیں۔ میں نے وکیل سے وقت لیا ہے۔ اگر وہ اُٹھ گیا تو پھر کل پر بات چلی جائے گی۔“

نازلی نے چپ ہو کر کچھ سوچا اور پھر اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”تمہاری کاروں کی دیکھ بھال تو ملازم کر لیں گے لیکن تم لوگ اپنے بوتیک کا کیا کرو گے؟“

اس سوال نے جیسے ایاز کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔ وہ چونکا۔ اس نے حیرت سے نازلی کی طرف دیکھا۔ نازلی کی نگاہیں اس کے چہرے پر پیوست تھیں۔ نازلی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ ایاز نے کہا۔

”میں نے کہا کہ وہ بوتیک جس سے تم لوگوں کا گھر چلتا ہے اس کا کیا کرو گے؟“ نازلی نے پھر سوال کیا۔ اس بار اس کے کہنے کے انداز میں طنز تھا۔ جس کا نشتر ایاز نے محسوس کیا تھا۔

ایاز نے اپنی آنکھیں چرائیں۔ اُس نے اپنا چہرہ پھیر لیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کے بارے میں اسے کیسے پتہ چل گیا۔ اگر وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان گئی ہے تو اس وقت اس کے منہ سے نکلنے والا جھوٹ کیا نازلی کے رہے سبے اعتماد کو بھی بچانے کی کوشش میں کامیاب ہو سکے گا؟

نازلی اس کے سامنے آگئی اور دانت پیس کر بولی۔ ”میں جان گئی ہوں کہ تم کیا ہو۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میرے اعتماد کو توڑا ہے۔ مجھے جھوٹ کے سہارے حاصل کرنے کی تم نے ایک ناکام کوشش کی ہے۔ تم شاید یہ بھول گئے تھے کہ جھوٹ کبھی بھی چھپ نہیں سکتا۔ جھوٹ کے لیے آج تک کوئی ایسی جگہ بنی ہی نہیں ہے جہاں اسے پناہ مل سکے ایک نہ ایک دن اسے ظاہر ہونا ہی ہوتا ہے۔ مجھے نفرت ہوگئی ہے تم سے۔ نفرت۔“

”نازلی..... تم.....“ ایاز نے کچھ کہنا چاہا۔

”خبردار جو آئندہ تم نے اپنی جھوٹی زبان پر میرا نام لیا۔ آج سے تمہارے اور میرے راتے الگ الگ ہیں۔ جو وقت تمہارے ساتھ گزرا وہ سراب تھا۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔“ نازلی نے کہا۔ غصہ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

”پلیز مجھے کچھ کہنے دو۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ اصل بات کیا ہے۔“ ایاز پانی میں ڈوبتے ہوئے شخص کی طرح ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

”تم مجھے اصل بات کیا بتاؤ گے۔ میں سب کچھ جان چکی ہوں۔ تمہارا پیار میرے بھائی کی دولت کے لیے ہے۔“ نازلی نے کہا۔

”آؤ ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ ایاز بولا۔

”اب تمہارے ساتھ بیٹھنا ناممکن ہے۔“ نازلی نے دو ٹوک کہا۔ ”میں تمہیں یہ ہی کہنے کے لیے آئی تھی۔ میں نے کہہ دیا تم نے سن لیا۔ آئندہ ہم یہ یاد رکھیں گے کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔“

”کیا تم مجھے بولنے کا موقع دوگی۔“ ایاز نے کہا۔

”تم بول چکے جتنا تم نے بولنا تھا۔“ نازلی بولی۔ ”آئندہ مجھے کبھی ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ کبھی بھی۔“

”رک جاؤ نازلی۔“ ایاز نے بے بسی سے اسے روکنا چاہا۔

”میں نے کہا ناں کہ میرا نام کبھی اپنی زبان پر نہ لانا۔“ نازلی نے رک کر اس کی طرف دیکھ کر غصے سے کہا اور پھر وہ آگے چلی گئی۔ ایاز اُسے لاجار جاتا دیکھ رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نازلی کے سامنے اس کی اصلیت کیسے منکشف ہوئی۔ اُس نے تو ہر قدم بہت سنبھل کر رکھا تھا لیکن وہ سب کچھ اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ طارق کا قرض اسے لوٹانا تھا، ورنہ وہ اس کے لیے کوئی بھی مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔

ایاز کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر نازلی کو روک لے اور ایسا جھوٹ بول دے کہ وہ لاجواب ہو کر پھر سے اس پر یقین کر لے۔

ایک جھٹکے سے سب کچھ آدھی میں اڑتے سوکھے چوں کی طرح بکھر گیا تھا۔ جس کی کبھی اُس نے اُمید بھی نہیں کی تھی۔

ایاز نے اپنی ٹانگ غصے سے ہوا میں ماری اور اپنے دانت پیس کر نفرت کے زہر میں ہر لفظ بھگو کر اُس نے کہا۔ ”نازلی تم اتنی آسانی سے مجھے نہیں چھوڑ سکتی۔ تم خواہ راستے جدا کر لو

لیکن میں تمہیں تب تک نہیں چھوڑوں گا جب تک میں تم سے پیسہ نہ وصول لوں۔ مجھے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ اس کے لیے مجھے تمہارا جو بھی حشر کرنا پڑا وہ میں کروں گا۔“

☆=====☆

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

نازلی اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی کا شیشہ کھلا ہونے کی وجہ سے بارش کے چھینٹے اس کے چہرے پر پڑے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے گلاب شبنم کے قطروں میں نہایا ہو۔

نازلی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی اپنے موبائل فون کی سم کو ایک بار غور سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت اُتر آئی تھی۔ نازلی نے ابھی اپنے موبائل کی سم تبدیل کی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب ایاز اس کے ساتھ کوئی رابطہ کرے۔

نازلی نے دراز سے قینچی نکالی اور سم کاٹ کر چار چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم کر دی۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالا اور اپنی بند مٹھی کھول دی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سم کے ٹکڑے اُڑ کر نہ جانے کہاں اور کس طرف بکھر گئے۔ نازلی نے متلاشی نگاہوں سے ایک بار دیکھا، پھر آسمان کی طرف اپنی نگاہیں اٹھائیں، اور کھڑکی بند کر دی۔ اُس نے ایاز کے ساتھ ہر رابطہ توڑ دیا تھا۔

دوسرے دن عام تعطیل تھی۔ دوپہر کے بعد اچانک ایک مہمان نے تیمور کو چونکا دیا تھا۔ اُس کے سامنے سر کے سفید بالوں، چہرے کی چھوٹی چھوٹی داڑھی اور ہونٹوں پر ایک اپنائیت سے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ احسان احمد کھڑا تھا۔

احسان احمد، تیمور کے باپ کا بہت گہرا دوست تھا۔ وہ ایک عرصے سے اپنی فیملی کے ساتھ کراچی میں مقیم تھا۔ وہاں اس کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ اس کی اچانک آمد نے تیمور کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ احسان احمد بڑی گرم جوشی سے تیمور سے ملا۔

”مجھے یقین نہیں ہو رہا کہ آپ میرے سامنے کھڑے ہیں۔“ تیمور نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”بھلے تم ہمیں بھول جاؤ لیکن ہم بھولنے والوں میں سے نہیں ہیں۔“ احسان احمد نے مسکرا کر کہا۔

”آپ مجھے ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔“ تیمور نے کہا۔

”تجہبی تو تم نے مجھے اپنی شادی پر نظر انداز کر دیا تھا۔“ احسان احمد نے ہنستے ہوئے شکوہ

کر دیا۔

”میری شادی تو اچانک اور بڑی مختصر سی ہوئی تھی۔“ تیمور نے ندامت سے کہا۔

”بیٹا شادی اچانک ہی ہوتی ہے۔ خیر مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنا گھر بسالیا۔“ احسان

احمد نے کہا۔ ”میں بھی تم سے ایک اور گھر بسانے کی ہی بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔“

”کس کا گھر بسانا چاہتے ہیں آپ؟“ تیمور نے کہا۔

”دیکھو، بھی تم جانتے ہو کہ تمہاری آنٹی اب اس دنیا میں نہیں ہے ورنہ اس وقت یہ

بات کرنے کے لیے وہ بھی میرے ساتھ ہی ہوتی۔“ احسان احمد کچھ اُداس سا ہو گیا تھا۔

”بہر حال میں اکیلا ہی آ گیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں اپنے بیٹے راجیل کے لیے نازلی کا

رشتہ مانگنے کے لیے آیا ہوں۔“

احسان احمد کی بات سن کر تیمور اور عشرت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ احسان

احمد کی فیملی سے نازلی کے لیے رشتہ آنا، خوش قسمتی کی بات تھی۔

”میرے ابو کی دوستی رشتے داری میں بدل جائے اس سے بڑھ کر میری کیا خوش نصیبی

ہوگی۔“ تیمور نے کہا۔

”تو کیا میں یہ رشتہ پکا سمجھوں؟“ احسان احمد نے خوش ہو کر کہا۔

”میں کیا اب بھی حیات ہوتے تو وہ بھی انکار نہ کرتے۔“ تیمور نے کہا۔

”بھی تم نے تو دل خوش کر دیا۔ ڈیڑھ دو ماہ بعد ہم بچوں کی منگنی کر دیں گے۔ راجیل

سے ملنا چاہو تو وہ اگلے مہینے تمہارے شہر آ رہا ہے۔“ احسان احمد نے کہا۔

”راجیل سے فون پر بات ہوتی رہتی ہے۔“ تیمور نے کہا۔ وہ اس رشتے پر بہت خوش

تھا۔

نازلی سے اس بار اُس نے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ایک موقع اُس نے

نازلی کو دیا تھا اور اب دوسرا موقع اُس نے اپنے اختیار میں رکھ لیا تھا۔

نازلی کو بھی اس رشتے سے کوئی انکار نہیں تھا۔ اس نے راجیل کو دیکھا بھی تھا۔ وہ

خوبصورت اور جاذبِ نظر نوجوان تھا۔ اس طرح سے نازلی کی بات راجیل کے ساتھ کچی

ہوگئی۔ نازلی خوش تھی۔ اُس کے دل پر کوئی بار نہیں تھا۔

نازلی نے اُس لائبریری میں جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اُس نے ایک دوسری لائبریری میں

آنا جانا شروع کر دیا تھا، جو اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ایاز اُس سے

ملنے کے لیے اُس لائبریری میں ضرور آتا ہوگا لیکن اب اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔

تیمور اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ اُسے اطلاع دی گئی کہ سکندر اور ناصر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ تیمور نے انٹرکام پر بات سن کر ششے سے باہر دیکھا، دونوں کھڑے تھے۔  
”میں خود ان سے ملنے کے لیے آتا ہوں۔“ تیمور نے کہا اور انٹرکام رکھ کر اپنے کیمن سے باہر آ گیا۔

ہال نما کمرے میں تیمور کا اسٹاف اپنی اپنی جگہ براجمان کام میں مصروف تھا۔ تیمور کو دیکھتے ہی سکندر نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ تیمور نے مصافحہ کرتے ہی پوچھا۔  
”کیا بات ہے؟“

”بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ سکندر نے کہا۔

”میں مصروف ہوں جو کہنا ہے اسی جگہ اور دو منٹ میں کہہ دو۔“ تیمور نے دو ٹوک کہا۔

”دو منٹ میں بات ہو سکتی ہے اگر آپ چاہو تو۔“ سکندر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”میں نے اُس دن بھی کہا تھا کہ آئندہ میرے آفس میں تم دونوں نے قدم نہیں رکھنا۔ آج پھر تم اسی بات کو لے کر آ گئے ہو۔“ تیمور کے لہجے اور چہرے پر تغیر آ گیا تھا۔

”دیکھو بابو..... میں ایک ہفتہ کے لیے شہر سے باہر چلا گیا تھا۔ تمہیں اس بہانے سوچنے کا موقع مل گیا۔ آج آتے ہی میں سیدھا تمہارے پاس آیا ہوں۔ آج بحث اور ضد کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ سکندر بھی اپنے لہجے میں تغیر لے آیا تھا۔

”میں نے اس دن بھی انکار کیا تھا اور میرا آج بھی انکار ہے۔“ تیمور اس کے سامنے گردن کھڑی کرتے ہوئے بولا۔

”تم ایک بزنس مین ہو، بچوں جیسی باتیں مت کرو۔“ سکندر نے کہا۔

”تم دونوں جاتے ہو کہ نہیں۔“ تیمور نے کہا۔ وہ دونوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”آج اپنی بات منوائے بغیر ہم نہیں جائیں گے۔“ سکندر نے بھی ڈٹ کر کہا۔ سارا اسٹاف دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”مجھے لگتا ہے چار لوگوں کے دلوں میں تمہارا اگر کوئی ڈر یا خوف ہے وہ آج تم رہنے نہیں دو گے۔“ تیمور نے کہا۔

”بابو یہ تمہارا آفس ہے یہاں اپنی عزت کا پاس کرو۔“ سکندر نے دھیمے لہجے میں یوں کہا جیسے وہ اسے سمجھا رہا ہو۔

”عزت کا پاس ہے تو میں تم سے بات کر رہا ہوں ورنہ میرے آدمی تم جیسوں کو دھکے دیتے ہوئے باہر لے جاتے ہیں۔“ تیمور نے کہا۔

”آج پھر بہت بول رہا ہے یہ۔“ ناصر نے آگے بڑھ کر غصے سے کہا۔

”ناصر صرف پانچ منٹ مجھے دے دو۔ اس کے بعد جو تمہاری مرضی آئے وہ کرنا آج میں تجھے نہیں روکوں گا۔“ سکندر کی نگاہیں تیمور کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”یہ سیدھی طرح سے نہیں مانے گا۔“ ناصر نے کہا۔

”بچہ ہے ابھی اسے ہمارا پتہ نہیں ہے۔“ سکندر نے جیسے ناصر کو سمجھایا۔ پھر وہ تیمور سے

بولا۔ ”تیرے سارے اسٹاف کے سامنے تمہاری بے عزتی ہو یہ اچھا نہیں ہے آؤ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

”اب کوئی بات نہیں ہوگی سکندر۔ فیصلہ ہوگا۔“ ناصر پھر بولا۔ اس کی اونچی آواز سن کر

گارڈ آگے بڑھا لیکن تیمور نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

سکندر نے ناصر کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ”دو منٹ صبر کر میرے شیر۔ نہ مانا تو پھر یہ

تیرا ہی شکار ہے۔“

تیمور نے دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”بہتر ہے کہ ہم بات کر لیں۔“

تیمور کی بات سن کر سکندر زعم سے ناصر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”بس اتنی سی بات تھی۔

آ گیا لائن پہ۔“

”کب بات کرنا چاہتے ہو۔“ تیمور نے متانت سے پوچھا۔

”ابھی اور اسی وقت۔“ سکندر نے فوراً کہا۔

”بات ابھی ہوگی لیکن یہاں نہیں۔ میں تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔ تمہاری جگہ پر۔

تمہارے اُس کلب میں۔“ تیمور نے کہا۔

”بات یہاں بھی وہی ہونی ہے، اور ہمارے کلب میں بھی بات میں کوئی تبدیلی نہیں

ہونی۔ پھر یہاں بات کرنے میں کیا حرج ہے؟“ سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔

”تم چلو میں بیس منٹ میں تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔

”ہمیں یہاں سے بھیجے کی چال چل رہے ہو۔“ ناصر پھر آگے بڑھا۔

”اگر میری بات کا یقین نہیں ہے تو میں تم دونوں کے ساتھ چلتا ہوں۔“ تیمور نے کہا

اور باہر جانے کے لیے قدم اٹھالیا۔ دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور

سکندر بولا۔

”اگر تم بات ہمارے کلب میں بیٹھ کر کرنا چاہتے ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، آؤ چلتے ہیں۔“ پھر سکندر نے آہستہ سے ناصر سے کہا۔ ”ڈر گیا ہے۔ بس ایک بزنس مین میں اتنی ہی اکڑ ہوتی ہے۔“

تیمور اُن سے پہلے باہر نکل گیا تھا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے تھے۔ سارا اسٹاف اپنی اپنی جگہ حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تیمور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر اُن کی کار کھڑی تھی، جس میں دو آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ سکندر کی کار آگے جبکہ تیمور اُن کے پیچھے چل رہا تھا۔

کلب کے پاس پہنچتے ہی سکندر اور ناصر ایک ساتھ کار سے باہر نکلے۔ تیمور نے اپنی گاڑی سے باہر نکلنے سے قبل اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور پھر باہر نکلا۔

کلب کے اندر ہال میں اسنوکر کا کھیل ہو رہا تھا۔ نوجوان پورے ہال میں کھیلتے ہوئے ہنس اور باتیں کر رہے تھے۔ ایک شور سا برپا تھا۔ تیمور نے پورے ہال کا جائزہ لیا۔

”آؤ اوپر ہمارا دفتر ہے۔ وہاں بات کرتے ہیں۔“ سکندر نے کہا اور ایک طرف اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا، لیکن تیمور اسی جگہ کھڑا رہا۔ سکندر کے قدم بھی رک گئے۔ اُس نے ناصر کے ساتھ پلٹ کر تیمور کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

”کیا بات ہے اوپر کیوں نہیں آ رہے؟“ سکندر نے پوچھا۔

”بات یہاں ہوگی۔“ تیمور نے کہا۔

دونوں ایک بار پھر تیمور کے پاس آگئے۔ ”یہاں بات نہیں ہو سکتی۔ دیکھ نہیں رہے ہو کہ یہاں کھیل ہو رہا ہے۔“

”اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ یہاں بات کرتے ہیں۔ ذرا سب دیکھیں کہ بات کیسے ہوتی ہے۔“ تیمور نے معنی خیز انداز میں کہا۔

سکندر اور ناصر نے بیک وقت حیرت سے تیمور کی طرف دیکھا۔ سکندر نے کہا۔ ”اب یہ تمہارا دفتر نہیں ہے کہ تمہاری ہی چلے۔ یہ ہماری سلطنت ہے۔ یہاں ہماری چلتی ہے۔ آؤ اوپر ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ سکندر نے آخری فقرہ تحکمانہ انداز میں کہا۔

”تراخ.....“ ایک زوردار تھپڑ سکندر کے منہ پر پڑا۔ تیمور کے بھاری ہاتھ کا تھپڑ اس قدر قوت سے سکندر کے منہ پر پڑا تھا، ناصر ف اس کی آواز سب کو سنائی دی تھی بلکہ سکندر کو لگا تھا جیسے وہ حصہ سو گیا ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کی گال سرخ ہو گئی تھی اس تھپڑ سے جیسے پورے کلب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ تھوڑی دیر قبل جو شور برپا تھا، وہ سکوت میں

بدل گیا تھا۔ اپنا اپنا کھیل روک کر سب تیمور اور سکندر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ تیمور بے خوف ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ناصر تو حیرت سے کبھی سکندر کو اور کبھی تیمور کو دیکھ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا سلوک ان کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ بھی ان کے کلب میں ان کے آدمیوں کے سامنے۔ ایک تنہا آدمی نے ایسی جرأت کا مظاہرہ کر دیا تھا جس کی توقع کبھی انہوں نے نہیں کی تھی۔

”اگر ایسا میں اپنے آفس میں کرتا تو تم کہتے کہ اپنے گھر میں تو سب ہی شیر ہوتے ہیں۔ اس لئے میں نے تمہارے گھر میں کھڑا ہو کر تمہارے منہ پر تھپڑ مارا ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”تمہاری یہ جرأت۔“ ناصر نے کہا اور مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ تیمور نے برق رفتاری سے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کی گرفت اس کے ٹینوے پر پوسٹ کر دی اور ناصر کو لگا جیسے کسی آہنی شے نے اُس کا گلا پکڑ لیا ہو۔ اُسے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی اور آنکھیں جیسے ابھی نکل کر فرش پر جا گریں گی۔ وہ ہاتھ جو تیمور کو مارنے کے لیے اٹھے تھے وہ اب تیمور کے مضبوط بازو کو پکڑے ہوئے تھے اور وہ کانپ سا رہا تھا۔

سکندر کے آدمیوں نے بھی تیمور کی طرف قدم بڑھائے تھے لیکن جیسے ہی اس کی گرفت میں ناصر آیا جیسے ان کے قدم کسی نے باندھ دیئے ہوں۔ سکندر کو ہوش آیا تو اس کے سامنے کا منظر بدلا ہوا تھا۔ ناصر، تیمور کے ہاتھ میں کسی دن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔

”یاد رکھو اگر تم میں سے کسی نے میری طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو میں تم سب کا وہ حال کروں گا جس کا کبھی تم لوگوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔“ اس کے ساتھ ہی تیمور نے ناصر کی پلپل پر لگا پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ وہ سکندر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم نے اگر دوبارہ میرے آفس میں آنے کی جرأت کی تو میں تجھے اسی جگہ دفن کر دوں گا۔“ تیمور کا لہجہ بہت ٹھوس تھا۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ وہ تیمور کی طرف قدم بڑھا کر اس کا مقابلہ کرنے کی غلطی کر سکتا۔ سکندر بھی تیمور کے آگے اپنی گال پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

تڑپتے ہوئے ناصر کو تیمور نے ایک طرف دھکا دے کر چھوڑ دیا۔ وہ سیدھا اسنوکر گیم کے اوپر جا کر اور اپنے گلے پر ہاتھ رکھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ تیمور نے کسی شیر کی نظر سے سب کی طرف دیکھا اور کلب سے باہر جانے کے لیے چل پڑا۔ دروازے کے پاس جا کر اُس نے ناصر کا پستول سکندر کی طرف اُچھال دیا۔ جیسے ہی اُس کے ہاتھ سے پستول نکلا، سکندر کے آدمیوں نے اپنا اپنا ریولور نکال کر اُس کی طرف تان لیا۔ اس اثنا میں تیمور کلب سے باہر

نکل چکا تھا اور پھر سکندر نے بھی اُن کو روک دیا۔  
 ”اس تھپڑ کا بدلہ اس کی موت نہیں ہے۔“ سکندر نے اپنے آدمیوں سے کسی سانپ کی پھنکار میں کہا۔ اُس کی آنکھوں میں زہر اُتر آیا تھا اور غصے سے اس کے ہونٹ تھر تھرا رہے تھے۔ ناصر کی سانس بحال ہو گئی تھی۔ اب وہ اسنو کرگیم کے اوپر بیٹھا ہوا تھا اور لگتا تھا جیسے ابھی وہ طویل دوڑ کے بعد بیٹھا ہو۔

”تم ٹھیک ہو ناصر۔“ سکندر نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔  
 ناصر نے اس کی طرف دیکھا اور گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ”اُسے گولیوں سے بھون کیوں نہیں دیا تم نے؟ اُسے کیوں جانے دیا؟ جاؤ اسے بھون دو۔“  
 ”پاگل مت بنو۔“ سکندر نے کہا۔ ”سب کے سامنے اُس نے ہمارے ہی گھر میں ہماری بے عزتی کی ہے۔ اس کا بدلہ اس کی موت نہیں ہے جس میں نہ کوئی تڑپ ہو اور نہ زہر سے بھر پور سانس ہو۔“ یک دم سکندر کی نگاہ کلب میں اپنا اپنا کھیل روک کر ان کی طرف متوجہ ہو جانوں کی طرف ہوئی تو اُس نے چیخ کر اُن سے کہا۔ ”چلو نکلو یہاں سے، آج کلب بند ہے۔ کوئی کھیل نہیں ہوگا۔“

سب نو جوان تیزی سے باہر نکل گئے۔ کلب خالی ہو گیا۔ اب وہاں ناصر۔ سکندر اور اس کے آدمی رہ گئے تھے۔

”میں اسے چھوڑ دوں گا نہیں۔“ ناصر نے دانت پیس کر کہا۔  
 سکندر نے پھر ایک بار اپنی گال پر ہاتھ رکھا اور درد محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا نہیں ہوا۔ اچھا نہیں ہوا، لیکن اب میں بھی اس کے ساتھ اچھا نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ سوچ رہا تھا کہ اچانک ان کے ساتھ کیا ہو گیا ہے؟ تیمور نے اتنی بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ اُن کے کلب میں ان کے آدمیوں کے سامنے کیسے کر دیا ہے؟ جبکہ یہاں تو کوئی اُن کی مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لیتا ہے۔

ناصر کی حالت مزید بہتر ہوئی تو اُس نے سکندر کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر کہا۔  
 ”سکندر اُس نے اُن لوگوں کے سامنے جو نہ جانے کہاں کہاں سے ہمارے کلب میں آکر موجود تھے، ہمیں آنکھ اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ پورے شہر میں ہماری بات پھیل جائے گی۔ لوگوں کے دلوں میں جو ہمارا ایک خوف ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ تم اُسے اسی جگہ گولیوں سے بھون دیتے۔ تاکہ ہمارا بھرم رہ جاتا۔“ ناصر نے پُر تاسف لہجے میں کہا۔

”تمہاری بات بھی ٹھیک ہے لیکن جب اُس نے میرے منہ پر میرے ہی کلب میں کھڑے ہو کر تھپڑ مارا تو میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ، کون ہے جس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ جس کے بل بوتے پر اس نے اتنی جرأت کی ہے۔ اگر ہم اُسے اسی وقت مار دیتے تو ممکن ہے کہ کوئی طوفان ہمارے آگے کھڑا ہو جائے۔ اس لئے میں نے سب کے سامنے چیخ کر کہہ دیا کہ، اس تھپڑ کا بدلہ اس کی موت نہیں ہے۔ میری یہی بات ہمیں ڈوبنے نہیں دے گی۔“ سکندر نے اسے کہا۔

”تو اب کیا کریں گے؟“ ناصر نے پوچھا۔  
 ”پہلے ہم یہ دیکھیں گے تیمور ہے کیا۔ اس کے بعد چال کے مہرے میں ایسے چلوں گا کہ ایک بار نہیں بلکہ بار بار تیمور کی رگوں میں ڈسنے کا زہر اُترے گا۔“ سکندر نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

☆=====☆=====☆

اُسی شام کو سکندر کا کلب پھر کھیلنے والوں سے بھر گیا تھا۔ اُن میں وہ بھی تھے جو اس وقت موجود تھے جب وہ واقعہ پیش آیا تھا۔ بات سب کے کانوں تک جا پہنچی تھی۔ سکندر نے کچھ چہرے باہر سے بلا کر اپنے کلب کی ایک اسنو کرگیم پر کھڑے کر دیئے تھے جو کھیلنے ہوئے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ، سکندر کی خاموشی کے پیچھے ایک طوفان برپا ہے۔ وہ اس کا ایسا حشر کر دے گا کہ بہت جلدی وہ کسی اخبار کی سُرخ بن جائے گا۔ اُس وقت اُسے اپنے کلب سے جانے دینا بھی سکندر کی ایک چال تھی۔ ورنہ کوئی اس کے کلب سے اس طرح اپنی ناگوں پر چل کر چلا جائے یہ کیسے ممکن ہے؟ ایسی باتوں نے بہت سے نو جوانوں کے ذہن بدل دیئے تھے اور سب کی سوچ اس جگہ رک گئی تھی کہ تیمور نے ایسا کر کے بہت بڑی غلطی کر لی ہے۔

ایک دن میں سکندر نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے سے تیمور کے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کر لی تھی۔ اُسے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ تیمور کا تعلق بزنس کے لوگوں کے علاوہ کسی ایسے شخص سے کوئی واسطہ نہیں ہے جو اندھیری گلیوں کا بادشاہ ہو۔

ناصر اس کے سامنے بیٹھا اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ سکندر نے ناصر کی طرف دیکھا اور سوچتے ہوئے بولا۔ ”وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟“

”اُس نے کر دیا ہے۔ اب ہماری باری ہے۔“ ناصر نے کہا۔  
 ”ناصر..... بھلے اس نے ہمارے کلب میں آکر ہمارے ساتھ کچھ بھی کیا تھا، لیکن یہ ج

ہے کہ وہ ایک بہادر آدمی ہے۔“

”تو پھر اُسے اپنا گردمان لیں کیا؟“ ناصر نے سنج پا ہو کر کہا۔

”بات بات پر بگڑ مت جایا کرو۔ بہت مہینوں کے بعد کسی بہادر آدمی سے واسطہ پڑا ہے۔ اب آئے گا مزا۔“ سکندر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

ناصر نے کھوجی نگاہوں سے سکندر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تم کیا سوچ رہے ہو؟“

”ہم تیمور کو ماریں گے نہیں۔ پہلے تڑپائیں گے۔ اُسے بھگائیں گے۔ اُس سے کچھ حاصل کریں گے۔ اس کے بعد جب وہ ہمارے قدموں میں آکر گر جائے گا، تب ہماری مرضی ہوگی کہ ہم اس کھیل کو کیا فائنل سچ دیں گے۔“ سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”گیم کیا سوچا ہے تم نے؟“ ناصر کی نگاہیں بدستور اس پر مرکوز تھیں۔

”تم ابھی اسی وقت جمال اور نواز کو بلاؤ۔ ویسے بھی اُن کو دیا ہوا وقت پورا ہو گیا ہے۔“

سکندر نے کہا۔

”میں انہیں بلاتا ہوں لیکن پہلے مجھے تم اپنا گیم تو بتاؤ۔“ ناصر نے مضطربانہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سکندر اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا اور پھر اُسے بتانے لگا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اُس کی ساری بات سن کر پہلی بار ناصر کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ پہلی بار ناصر کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہوا تھا جیسے اسے انتقام کی راہ مل گئی ہے۔

”خوب سوچا ہے تم نے۔“ ناصر نے اس کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب تم جمال اور نواز کو میرے سامنے لے آؤ۔“ سکندر نے کہا۔

ناصر نے اپنے آدمیوں کے ذریعے سے نواز اور جمال کو ایک گھنٹے کے اندر کلب کے اوپر والے کمرے میں پیش کر دیا۔ اس وقت کمرے میں وہ چاروں براجمان تھے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔ کسی کو دروازے کے پاس بھی کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ جمال اور نواز پہلے تو یہ سب دیکھ کر پریشان ہوئے تھے کہ ان کے ساتھ بند کمرے میں کیا سلوک ہونے والا ہے۔ پھر وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

”کیا سوچا ہے تم دونوں نے؟“ سکندر نے ان دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بہت سوچنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کوئی بینک لوٹ لیں۔“ جمال نے

جواب دیا۔

”بینک لوٹنا موت کا کھیل ہے اور تم دونوں ابھی بچے ہو۔ یہ کھیل نہیں کھیل سکو گے۔“

سکندر نے جیسے تسخرانہ انداز میں کہا۔

”مارے جاؤ گے۔“ ناصر نے بھی لقمہ دیا۔

”اس کے علاوہ ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔ کسی سے نوٹوں بھرا بیگ چھین لیں لیکن کہاں تلاش کریں کسی بیگ والے کو۔“ نواز بولا۔

سکندر نے کمرے میں ایک قہقہہ چھوڑا۔ جمال نے اس کی طرف براہِ سامنے بنا کر دیکھنے کے بعد کہا۔

”ہمارا مذاق اُڑا رہے ہو سکندر بھائی۔“

”مذاق نہیں اُڑا رہا تمہاری بچوں جیسی باتیں سن کر ہنس رہا ہوں۔“ سکندر نے کہا۔

”پھر تم بتاؤ ہم کیا کریں؟“ جمال نے کہا۔

”ہم بتائیں؟ تم دونوں کی سوچیں بس یہیں تک ہیں۔“ سکندر نے متانت سے کہا۔

”کبھی کبھی انسان کا دماغ کام نہیں بھی کرتا۔“ جمال نے کہا۔

”کچھ کرنا ہے تو پھر دماغ کو ہڈ حرام ہونے کا موقع مت دو۔ میں بتاتا ہوں کہ تم دونوں کیا کرو۔ یہ اس لئے بتا رہا ہوں کہ سیٹھ بہت گرم ہے اور ہم سیٹھ کی بات ماننے کے لیے مجبور ہوتے ہیں کیونکہ وہ ہمارا سیٹھ ہے۔ ہمارے کام کا آدمی ہے۔“ سکندر نے یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”سیٹھ نے تو ہمیں کچھ اور ہی حکم دیا تھا۔ جو کہ تم دونوں کے حق میں بہتر نہیں ہے۔ اس لئے ہم ایک چانس دے رہے ہیں۔ تاکہ تم دونوں کی خلاصی ہو سکے۔“ ناصر نے کہا۔

”ہم کیا کریں؟“ جمال نے سکندر کی طرف دیکھا۔

”جو بھی پلاننگ کرنی ہے وہ تم دونوں نے کرنی ہے۔ کیا کرنا ہے کیسے کرنا ہے، یہ تم دونوں کا مسئلہ ہے۔ ہم ایک پارٹی کا کاتاتے ہیں۔ جس سے تم دونوں کو ڈیڑھ، دو کروڑ روپیہ مل سکتا ہے۔“ سکندر نے کہا۔

”ڈیڑھ، دو کروڑ روپیہ؟“ نواز نے جمال کی طرف دیکھ کر کہا۔ دونوں کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

”اس سے تم سیٹھ کا پیسہ بھی چکا دو گے اور خود کی جیب بھر کر کہیں بھی جاسکو گے۔“ سکندر نے کہا۔

”لیکن ہمیں کرنا کیا ہوگا جس سے اتنے پیسے ملیں گے۔“ نواز نے مضطرب ہو کر

پوچھا۔

”ایک اغوا کرنا ہوگا۔“ سکندر نے کہا۔ ”اس کے عوض میں اتنا پیسہ مل جائے گا۔ کیونکہ وہ اُسے بہت چاہتا ہے۔“

اغوا کا سن کر جمال اور نواز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جمال نے متحیر ہو کر پوچھا۔ ”کس کا اغوا کرنا ہوگا؟“

”دیکھو یہ تم دونوں کی مرضی ہے کہ تم یہ کام کرو یا نہ کرو ہم صرف نشانہ ہی کر رہے ہیں۔ تم دونوں کو راستہ دکھا رہے ہیں۔ آگے تمہاری مرضی، لیکن سیٹھ کا حکم بجالانے کے ہم پابند ہیں۔ اس میں کوئی رعایت نہیں ہوگی۔ کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ سکندر نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سکندر چھپے ہوئے الفاظ میں انہیں دھمکی دے رہا تھا۔

”کون ہے وہ؟“ نواز نے پوچھا۔ اس کی نگاہیں سکندر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”ایک بزنس مین ہے۔ اچھا روپیہ ہے اس کے پاس۔ تم اس کی بہن کو اغوا کر لو۔“

سکندر نے اچانک یوں کہا جیسے اُس نے کسی پر زہر پھینک دیا ہو۔

”وہ بزنس مین کون ہے۔“ جمال نے اطمینان سے پوچھا۔

”اُس کا نام تیمور ہے۔ ٹی ایس اینڈ کمپنی کا مالک۔ اُس کی ایک بہن ہے جس سے وہ بہت پیار کرتا ہے۔ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس کے بارے میں میں تمہیں ساری معلومات دے دوں گا۔“ سکندر نے بتایا۔

تیمور کا نام سن کر کچھ دیر تک نواز اور جمال ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی فیصلہ کر رہے ہوں۔ پھر جمال نے کہا۔

”ہم یہ کام کریں گے لیکن جو پیسہ بھی ہمیں ملے گا وہ ہمارا ہی ہوگا۔ اُس میں سے ہم صرف سیٹھ کا روپیہ واپس کریں گے۔“

”اب تو ہم بھی کچھ حصے کے حقدار بن گئے ہیں۔ زیادہ نہیں لیں گے کچھ تو دے دینا۔“

سکندر نے بلاتامل کہا۔

”نہیں ہم صرف سیٹھ کا پیسہ واپس کریں گے۔“ جمال نے اپنی بات پر اٹک کر کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہم نے راستہ نفٹ میں ہی دکھا دیا؟“ سکندر نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

”ایک صورت میں ہم کچھ تمہیں بھی دے دیں گے۔ اگر تم ہمارا تحفظ کرو تو۔“ نواز نے ایک دم کہا۔

”اس کے لیے ہم حاضر ہیں۔“ سکندر نے جلدی سے کہا۔

”ہم تمہیں تیمور کے بارے میں ساری معلومات دے دیتے ہیں لیکن کیا تم دونوں پلاننگ کر سکو گے؟“ ناصر نے دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”اس کی فکر مت کرو ہمارے پاس ہے ایک ماسٹر مائنڈ۔ شرافت کے لہارے میں دولت مند بننے کا لالچ اس کے سر پر کسی اونچے شیلے کی طرح سجا ہوا ہے۔ پتہ نہیں اس کے دماغ میں ایسا بھوت کیسے سوار ہو گیا ہے۔ ہماری اُس سے علیک سلیک تھی۔ ہم کچھ کھلے تو اُس نے اپنے دل کی بات ہم سے کہہ دی۔“ جمال نے مسکرا کر کہا۔

”پڑھا لکھا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ کوئی بھی پلاننگ کر سکتا ہے۔ ہم اُس سے مدد لیں گے۔“ نواز نے کہا۔

”ایسے سادے لوگ ہمارے بڑے کام کے بن جاتے ہیں۔“ ناصر نے اپنی گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”یہ سادے لوگ گلے کا کاٹنا بھی بن جاتے ہیں۔“ سکندر نے کہا۔

”ایسا کبھی ہی ہوتا ہے ورنہ یہ بہترین قربانی کے بکرے ہوتے ہیں۔“ ناصر نے اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔

”بہر حال تم اس کی پلاننگ کرو اور ہمیں ہمارا روپیہ واپس کر دو۔“ سکندر نے کہا۔

”لیکن تیمور کے بارے میں معلومات.....؟“ جمال نے کہا۔

سکندر اُسے تیمور اور اس کے گھر کے افراد کے بارے میں بتانے لگا۔ کچھ دیر بعد جمال اور نواز اٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد سکندر نے مسکرا کر کہا۔

”سارا کام تم دونوں کرو گے اور پیسہ ہم وصول کریں گے۔“ سکندر اور ناصر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔ ”اب پتہ چلے گا تیمور کو کہ اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ میں نے کہا تھا کہ وقت آنے پر یہ مہرے استعمال کروں گا۔“

جمال اور نواز پیسے کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے پُر تو لے بیٹھے تھے۔ اب جبکہ سکندر نے انہیں راستہ بتا دیا تھا تو دونوں اس کام کو کرنے کے لیے پوری طرح سے رضا مند تھے۔ اپنے ساتھ تیسرا ساتھی ملانے کے لیے انہوں نے الیاس کے بارے میں سوچا تھا۔ وہ اس علاقے کا جیب تراش تھا۔ دونوں کی اس کے ساتھ پرانی جان پہچان تھی۔ جبکہ ساری پلاننگ کے لیے اُن کے ذہن میں تیمور کا نام آتے ہی حماد کا خیال آیا تھا۔

حماد ایک کمپنی میں ملازم تھا۔ اُس کی تنخواہ اچھی تھی اور وہ باعزت طریقے سے کما رہا تھا۔

والے کا خالی مکان ہے اور وہ پتہ نہیں کیا کہہ رہا تھا کہ اس کا مالک کہاں گیا ہوا ہے اور وہ جگہ اس کے اختیار میں ہے۔“ جمال نے بتایا۔ ”ہم اُسی جگہ کو استعمال کریں گے۔“

”تم نے ہر کام بڑی تیزی سے سوچ لیا ہے۔“ نواز نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا۔

”اب نہیں تیزی دکھانی تو پھر کب دکھائیں گے۔“ جمال بھی مسکرایا۔ پھر وہ یک دم متانت سے نواز کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ہم ایک پیسہ بھی سکندر کو نہیں دیں گے۔ ہمارے پاس پیسہ ہوگا تو ہم کہیں بھی بھاگ جائیں گے۔“

نواز نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔“

”یہ بھی کیا یاد کرے گا کہ کوئی ملا تھا۔“ جمال نے کہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر دبایا، جیسے وہ سکندر کا گلا دبا رہے ہوں۔

☆=====☆=====☆

لیکن نہ جانے کہاں سے اُس کے اندر جائز ناجائز طریقے سے دولت مند بننے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ حماد کی پہلی ملاقات نواز سے اچانک مارکیٹ میں ہو گئی تھی۔ پھر نواز نے اُس سے جمال کو بھی ملوایا۔ چند دنوں میں ہی اُن کے درمیان اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور وہ بے تکلف بھی ہو گئے تھے۔ حماد کا وقت اُن کے پاس ہی گزرنے لگا تھا۔ یہ اُس پر عیاں ہو گیا تھا کہ وہ دونوں جرائم پیشہ ہیں۔ نہ جانے کب سے وہ اپنے دل میں ایسے لوگوں سے ملنے کی آس لگائے بیٹھا تھا، اب جبکہ وہ دونوں ملے تو حماد نے اُن کے آگے اپنی کوئی بات مخفی نہیں رکھی تھی لیکن وہ دونوں کسی کھلاڑی کی طرح اُس سے پیش آرہے تھے۔ رفتہ رفتہ کچھ باتیں عیاں ہوئیں تو حماد نے بھی اپنے دل کی بات اُن سے کہہ دی۔ حماد کا دماغ سوچنے میں کتنا ہی تیز کیوں نہ تھا لیکن وہ اُن دونوں کہنہ مشق کھلاڑیوں کے آگے کسی بکری کے بچے کی طرح ہی تھا۔ حماد کے ساتھ اُن دونوں نے تعلق اس لئے جوڑا تھا کہ شاید وہ اس سے کچھ روپیہ حاصل کر سکیں لیکن اُس کے خیالات سن کر دونوں کو مایوسی ہوئی تھی کہ وہ بھی اسی کشتی کا سوار ہے۔

حماد کے خیالات جان کر دونوں نے اُس سے دور ہونے کا سوچ لیا تھا لیکن اچانک سکندر کے راستہ دکھانے سے انہیں پھر سے حماد کے قریب ہونے کا سوچنا پڑا۔

”حماد کے ساتھ کیسے بات کریں گے؟“ نواز نے پوچھا۔

”ہم اُسے پوری بات نہیں بتائیں گے۔ پارٹی کا نام اُس کے آگے نہیں لیں گے اور ساری پلاننگ اُسے اندھیرے میں رکھ کر کرتیں گے۔“ جمال نے کہا۔

”کیا وہ پلاننگ کر سکے گا۔“ نواز نے اپنا اندیشہ بیان کیا۔

”یہی تو اب دیکھنا ہے کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔ ہم کون سا اس سے اصل نام لے کر بات کریں گے۔ اس لئے اگر اُس نے اچھا راستہ تراشا تو ہم اُس کی سنیں گے اور اگر وہ کچھ خاص نہ کہہ سکا تو ہم حساب کتاب سے اُس سے پیچھے ہو جائیں گے۔“ جمال نے بتایا۔

”اگر وہ کچھ نہ کہہ سکا تو پھر؟“ نواز نے پوچھا۔

”تو ہم بھی سوچنا جانتے ہیں۔ پہلے اس کی سن لیں۔ پھر ہم اپنا سوچ لیں گے۔“ جمال نے کہا۔

نواز نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد پھر سوال کیا۔ ”ہم اس کی بہن کو رکھیں گے کہاں؟“

”ہم لڑکی کو حماد کی اُس جگہ پر رکھیں گے۔ یاد نہیں ہمیں وہ ایک بار یہاں سے بچپس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹے سے گاؤں میں لے کر گیا تھا۔ وہاں اس کے کسی جاننے



”ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔ مگرانی یا اغوا“ حماد نے کہا۔  
 ”حماد ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم ایک دم اُس پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔“ جمال نے حماد کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

”بس پہلا کام یہ ہے کہ اُس پر نظر رکھ کر لائبریری سے یہ پتہ کیا جائے کہ وہ کتنے دنوں میں واپس آتی ہے۔ اس کے بعد ہم آگے چلیں گے۔“ حماد نے کہا۔

”یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں ایک دن میں ہی اس کا ریکارڈ دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔“ نواز نے کہا۔ جس لائبریری میں نازی کا آنا جانا تھا۔ اس لائبریری میں الیاس کا ایک جاننے والا کام کرتا تھا۔ نواز نے سوچا کہ وہ الیاس کے ذریعے سے پتہ چلا سکتا ہے۔ اُس کے لیے لائبریری کا رجسٹر چیک کرنا مشکل نہیں تھا۔

”تو ٹھیک ہے آپ پتہ چلائیں۔“ حماد نے کہا۔ ”ایک بات اور.....“

”وہ کیا؟“ نواز اور جمال نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔

”جو کچھ کرنا ہے وہ تم لوگوں کو کرنا ہے۔ میرا کام صرف پلاننگ کرنا ہے اور اس کے عوض میں مجھے صرف بیس لاکھ روپے درکار ہیں۔“ حماد نے کہا۔

”اور اگر ہمیں ٹوٹل بیس لاکھ روپے ملے تو؟“ نواز نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ایسا تو ہو نہیں سکتا۔ جگہ بھی میری استعمال ہوگی اور وہ ایک محفوظ جگہ ہے۔“ حماد نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

”فکر نہیں کرو۔ تمہیں بیس لاکھ روپے مل جائیں گے۔ ہم کل اسی جگہ ملیں گے۔“ جمال نے اس کا کندھا تھپتھا کر کہا۔ حماد وہاں سے چلا گیا۔

”اس کے بغیر ہم کر سکتے ہیں دو اسے۔“ نواز نے بیزار سے کہا۔

”ہم سے وہ کیا لے جائے گا۔ دماغ وہ کھائے گا۔ سوچے گا وہ۔ ہمیں جگہ مل جائے گی۔ پیسہ ہاتھ آئے گا تو ہم اسے لات رسید کر دیں گے۔“ جمال نے لاپرواہی سے کہا۔

”لات کھالے گا ہم سے یہ؟“ نواز نے پوچھا۔

”کیوں نہیں کھائے گا۔ تم جانتے ہو کہ یہ ہم سے کس خطرناک طریقے سے بلیک میل ہو سکتا ہے۔ بیس لاکھ روپیہ لینے کی بات تو دور کی یہ ہمیں بیس لاکھ روپیہ دینے کے لیے تیار ہو جائے گا۔“ جمال کے لہجے میں پُر اسراریت تھی۔ اس کی بات سن کر نواز کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”تم نے جال خوب بچھایا ہوا ہے۔“ نواز نے کہا۔

حماد نے اُن کی ساری بات سن کر اپنی آنکھوں سے سفید چشمہ اُتار کر اپنے منہ کے پاس لے جا کر، منہ کھولا اور شیشوں پر حلق سے ہوا نکال کر شیشے دھندلے کئے اور ایک کپڑے سے صاف کرنے کے بعد پھر اپنی آنکھوں پر چشمہ لگا لیا۔

”ایک بڑے آدمی کی بہن کو اغوا کرنا چاہتے ہو۔“ حماد نے کہا۔

”اس بات کو بار بار مت دہراؤ۔ ایک بار کہہ دیا بس اتنا ہی کافی ہے۔“ نواز نے نرمی سے اُسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ حماد نے کہا۔ ”ہمیں اس طرح سے اُس لڑکی کو اغوا کرنا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور ہم اپنا کام خاموشی سے کر کے اپنی اپنی راہ پر چلے جانا چاہتے ہیں۔“ حماد نے کہا۔

”بالکل۔“ جمال نے مختصر کہا۔

”تم یہ بھی بتا رہے ہو کہ لڑکی گھر سے بہت کم باہر نکلتی ہے۔ پھر اُسے کیسے اغوا کیا جاسکتا ہے۔“ حماد نے باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھا۔ ”ہم اُس پر مسلسل نظر رکھیں گے۔ لڑکی کیونکہ لائبریری آتی جاتی ہے۔ اسی دوران ہمیں اپنا کام کرنا ہوگا۔“

”ہاں ہمارے پاس یہی ایک موقع ہوگا۔“ جمال نے کہا۔

”پلان ہے میرے پاس۔“ حماد نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”لڑکی پر مسلسل نظر رکھ کر ہم پہلے اس لائبریری تک جائیں گے جہاں وہ جاتی ہے۔ اس کے بعد ہم یہ معلوم کریں گے کہ وہ لڑکی کتنے دنوں میں واپس آتی ہے۔“

”ہم انتظار کی بجائے جیسے ہی وہ گھر سے باہر نکلے اُسے گرفت میں کر لیتے ہیں۔“ نواز نے جلدی سے کہا۔

”ایک بات اور وہ لڑکی جس کا نام تم سدرہ لے رہے ہو۔ وہ اس وقت تک ہمارے

بھی دو نمبری آدمی کو میں پہچانتا ہوں اور جانتا ہوں۔ جسے میں نہیں جانتا اس کے بارے میں

مجھے تیرے جیسے دوست آگاہ کر دیتے ہیں۔ کار کس مقصد کے لیے چاہیے؟“ طارق نے کہا۔  
نواز پہلے ہی جانتا تھا کہ طارق اس سے کریدے گا، اور پوچھنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اس سے کوئی بھی بات چھپانا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ اس کے بارے میں سب جانتا تھا۔ ان کی شناسائی پرانی تھی۔ جو جیسا ہوتا ہے اس کے ملنے والے بھی ہر جگہ ویسے ہی ہوتے ہیں۔

”میں نے اپنی گرل فرینڈ کو ملنے جانا ہے۔“ نواز نے شرما کر ایک آنکھ دبا کر کہا۔  
”طارق اب اتنا بھی بے وقوف نہیں ہے کہ تمہاری اس بات پر یقین کر لے۔“ طارق نے کہا۔ وہ ایسے کاموں کی تاک میں رہتا تھا اس لئے جاننے کے لیے وہ بے چین ہو گیا تھا۔  
”ٹھیک ہے تم مت دوکار۔“ نواز اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔  
”پورا شہر تمہیں کار کیا سائیکل نہیں دے گا۔“ طارق نے اطمینان سے کہا۔ ”یہ تم بھی جانتے ہو اور مجھے بھی اس کا علم ہے۔“

نواز کچھ دیر کھڑا ہا پھر یہ سوچ کر بیٹھ گیا کہ طارق ٹھیک کہتا ہے۔ طارق اسے جانتا ہے جبکہ دوسری جگہ اسے ضمانت دینا ہوگی۔ جو کہ اس کے پاس کسی شریف آدمی کی ضمانت نہیں تھی۔

”کیوں خواہ مخواہ سوال کر رہے ہو، مجھے کار دو، بات وہی ہے جو میں نے بتائی ہے۔“ نواز نے ڈھیلا پڑتے ہوئے کہا۔

طارق نے اپنی گردن اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”میں بھی یہاں روپیہ کمانے کے لیے بیٹھا ہوں۔ میں تم سے کار کا کرایہ نہیں لوں گا۔ جس کام کے لیے چاہیے اس میں تمہارا ساتھ بھی دوں گا۔ مجھے کرائے کی مد میں تھوڑا سا حصہ دے دینا۔“

نواز نے متانت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ”کمال کرتے ہو تم۔ میں اپنے کام جارہا ہوں اور تم مجھ سے حصہ مانگنے کی بات کرتے ہو۔“

”طارق اُڑتی چیزیا کے پرگنا بھی جانتا ہے۔ تمہارے پاس کار ہو، اس کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک تم کسی سے کار چھین لو یا پھر تمہیں تمہارے کام کے لیے کار میں دے دوں۔ تمہاری اس مجبوری کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں میں۔ یہ ہے سیدھے اور صاف الفاظ میں میری بات۔ مجھ سے مت چھپاؤ۔ روپے میری جیب میں ڈالو اور کار میں شہر کے بھلے کسی سیٹھ کو اغوا کر کے لے جاؤ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”ایک منٹ۔“ نواز نے سوچا کہ طارق ٹھیک کہہ رہا ہے کار حاصل کرنے کے اس کے

پاس دو ہی راستے ہیں۔ لہذا اس نے موبائل فون سے جمال سے رابطہ کر کے اسے ساری بات سے آگاہ کر دیا۔ اُس نے کچھ ہدایات دیں اور رابطہ بند کر دیا۔  
نواز نے کچھ توقف کے بعد اُس سے کہا۔ ”اگر میں تمہیں صاف بات بتا دوں تو تم میرا کیا ساتھ دو گے؟“

طارق نے اس کی طرف خوش ہو کر دیکھا اور کہا۔ ”اب تم پکی سڑک پر چڑھے ہو۔ دیکھو پہلے مجھے بتاؤ کہ تم کو کار کیوں چاہیے؟“  
”کسی کو اغوا کرنا ہے۔“ نواز نے بتا دیا۔

”ٹھیک ہے، میری کار اگر کسی طرح سے شک میں آ جاتی ہے۔ میں بات کر رہا ہوں شک کی، پکڑی نہ جائے۔ اگر شک میں آ جاتی ہے تو میں کسی صورت نہیں مانوں گا کہ میں نے کار تمہیں دی تھی۔“ طارق نے ایک بار پھر اس کی طرف جھک کر کہا۔  
نواز نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”پکا؟“

”تم جانتے ہو کہ میں اپنا کام کتنی ایمانداری سے کرتا ہوں۔“ طارق نے متانت سے کہا۔

”کیا لو گے۔“ نواز نے پوچھا۔  
”تم کیا دو گے؟“ طارق نے پوچھا۔  
”دس ہزار۔“ نواز نے کہا۔ ”کار دن ایک بجے چاہیے۔ شام سے پہلے تمہیں مل جائے گی۔ تین، چار گھنٹوں کی بات ہے۔“  
”میں ہزار لوں گا۔“ طارق نے کہا۔  
”زیادہ ہیں۔“ نواز نے کہا۔

”پھر کسی کم والے کے پاس چلے جاؤ۔“ طارق نے لاپرواہی سے کہا۔ نواز نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور لاچار کہا۔

”تم بہت کمینے اور مطلبی ہو۔“  
”تعریف کرنی چھوڑو۔ یہ بتاؤ، اوکے ہے کہ نہیں۔“ طارق ڈھٹائی سے مسکرایا۔  
”ٹھیک ہے کار لینے سے پہلے تمہیں پیسے مل جائیں گے۔ پرسوں ایک بجے آؤں گا۔“  
نواز نے کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ طارق مسکرایا اور بڑبڑاتے ہوئے بولا۔  
”تمہارے جیسے گاہک تو مجھے بھلے روز مل جایا کریں۔“  
اگر عین وقت پر نواز نہ آتا تو طارق اٹھ کر ایاز کی طرف جانے والا تھا۔ اس لئے جیسے

ہی وہ گیا، اُس نے اپنی موٹر سائیکل کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ طارق ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اس کی نگاہ ایاز پر پڑ گئی۔

ایاز نے ابھی سڑک عبور کی ہی تھی کہ اس کے سامنے پیچھے سے کسی تیر کی طرح موٹر سائیکل نکل کر سامنے آ گئی اور ایاز کو یک دم اپنے چلتے قدم اسی جگہ پر روکنے پڑے۔ موٹر سائیکل پر طارق کو دیکھ کر ایاز کے منہ میں جیسے کڑوی گولی آ گئی ہو۔

”بیٹھو میرے پیچھے۔“ طارق نے کہا۔

”تم چلو میں ایک کام سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔“ ایاز نے اس کی طرف دیکھ کر متانت سے کہا۔

”میں نے کہا ناں کہ میرے پیچھے بیٹھو۔“ طارق نے اس بار زور اور شدت لہجے میں کہا۔

”میں ابھی تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔ تم چلو میں ایک گھنٹے میں آتا ہوں۔“ ایاز نے کہا۔

”ابھی تم پیدل چلنے کے قابل ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پیدل چلنے کے بھی قابل نہ رہو۔

چپ چاپ میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔“ طارق کے لہجے میں زہر تھا۔

ایاز نے ایک لمحے کے لیے بائیں دیکھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔

طارق واپس اپنے دفتر میں آ گیا تھا۔ ایاز اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”تمہارا کھیل تو ختم ہو چکا ہے۔ اب میرا پیسہ کب دے رہے ہو تم۔“ طارق نے پوچھا۔

”یہ تمہیں کس نے کہا کہ میرا کھیل ختم ہو چکا ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”میں اس شہر کا اڑتا پرندہ ہوں۔ جو کبھی بھی ایک جگہ تک کر نہیں بیٹھتا۔ مجھے سب پتہ ہے کہ اب تازہ صورت حال کیا ہے۔ اس لئے وقت ضائع مت کرو۔“ طارق نے کہا۔

ایاز نے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملے اور پھر اٹھ کر ایک طرف رکھے پانی کے جگ سے تھوڑا سا پانی گلاس میں ڈالا، جیسے محض اپنا حلق تر کرنا چاہتا ہو۔

”میں اس سے ملنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ لائبریری بھی نہیں آتی۔ رابطہ نمبر بھی بند ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”آخر میں کیا ہوا تھا۔ میں تمہارے منہ سے تفصیل سننا چاہتا ہوں۔“ طارق نے کہا۔

ایاز نے اس کی طرف دیکھا اور پھر ساری بات اسے اختصار سے بتادی۔ جسے سن کر طارق نے کہا۔ ”اچھا تو یہ تک ہو گیا ہے۔ میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا لیکن تمہاری

صورت دیکھ کر میں یہ بھانپ گیا تھا کہ تمہارے ہاتھ سے سونے کی چڑیا نکل چکی ہے۔“

”کیا تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو۔ دیکھو اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہے جہاں سے میں پیسہ حاصل کر سکوں۔“ ایاز نے لا چاری سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ جانتے ہو جس کی بہن سے تم محبت کا کھیل کھیل رہے تھے اس نے چند دن قبل کیا کیا ہے۔“ طارق نے کہا۔

”کیا کیا ہے؟“ ایاز نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

”سکندر کو اس کے اسٹار کلب میں اس کے آدمیوں کے سامنے تھپڑ مار کر ٹھٹھا ہوا چلا گیا تھا وہ۔“ طارق نے بتایا۔

ایاز کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ ”کیا کہہ رہے ہو تم۔“

”یہ سچ ہے۔ تم کسی سے بھی پوچھ لو۔ میرا مشورہ ہے تمہیں، بالکل مفت۔ جو ہوا وہ ہو گیا تم شیر کے منہ میں اب ہاتھ مت دو۔ ورنہ تمہارا ہاتھ نہیں رہے گا اور میرا پیسہ واپس کرنے کے لیے کچھ اور کروا دو وہ بھی دو دنوں میں۔“ طارق نے کہا۔

ایاز یک دم چونکا۔ ”دو دنوں میں؟“

”ہاں دو دنوں میں۔ اب کوئی مہلت نہیں ہے۔“ طارق نے دو ٹوک کہا۔

”میں دو دنوں میں تمہارے پیسے کیسے دے سکتا ہوں۔“ ایاز نے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ میں نہیں جانتا۔ پرسوں چار بجے تک اگر مجھے میرے پیسے نہ ملے تو یاد رکھو میں تمہارا برا حال کر دوں گا۔ یہ تم جانتے ہو کہ میں جو کہتا ہوں وہ کر دیتا ہوں۔“ طارق کا رویہ درشت ہو گیا تھا۔

ایاز نے اس کی طرف بے بسی اور ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کوئی کسی سے رحم کی اپیل آنکھوں ہی آنکھوں میں کر رہا ہو اور اُس نے کہا۔ ”یہ تو بہت کم وقت ہے۔ اتنے کم وقت میں میں بھلا کیسے اتنی رقم کا بندوبست کر سکوں گا۔“

”میں نے کہا تھا ناں کہ جب میں لینے پہ آؤں گا تو پھر کوئی مہلت نہیں دوں گا۔ اب کوئی مہلت نہیں ہے۔ جو میں نے کہہ دیا ہے وہ پتھر پر لکیر ہے۔“ طارق نے یوں کہا جیسے کوئی نچ اپنا آخری فیصلہ سن رہا ہو۔

ایاز نے سوچا کہ طارق نے اب جو کہہ دیا ہے وہ اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔ اسے جاننے والے یہ بات جانتے تھے کہ وہ جو کہہ دیتا تھا پھر وہ اپنی کبھی بات کو واپس نہیں لیتا تھا۔ اس کے باوجود ایاز نے آخری کوشش کی۔

یہ بھی سوچا تھا کہ وہ کم از کم طارق کو دینے کے لیے رقم اپنی ماں سے مانگ لے لیکن پھر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں تو اُسے جیب خرچ احسان کر کے دیتی ہے۔ اتنی رقم کا سنتے ہی وہ اسے گھر میں رہنے نہیں دے گی۔

اچانک وہ چونکا۔ ایک خیال نے اس کی سوچ میں تغیر پیدا کر دیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ دو دنوں میں طارق کی رقم کا بندوبست کہیں سے نہیں ہو سکتا۔ کیوں نہ وہ اس گھر سے کہیں چلا جائے۔ طارق اور گھروالوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

اس خیال کے آتے ہی وہ سوچنے لگا کہ وہ کہاں جائے؟ اس شہر سے باہر اس کا کوئی ایسا عزیز رشتہ دار نہیں تھا کہ جس کے پاس جا کر وہ کچھ دن گزار سکے۔ کسی دوست کے گھر جا کر بھی وہ چھپ نہیں سکتا تھا۔ پھر اچانک اُسے چچا نواب کا خیال آیا۔

نواب دین اس کا رشتے میں بچا تھا۔ اس کے باوجود کہ ایاز کی ماں اور اس کے باپ کی علیحدگی ہو چکی تھی کہ لیکن نواب دین شروع سے ہی ایاز کو پسند کرتا تھا۔ وہ دل کا اچھا انسان تھا۔ وہ کئی بار ایاز سے کہہ چکا تھا کہ وہ اس کے پاس آجائے، کام پر بھی لگ جائے گا، اور رہنے کے لیے بھی کھلی جگہ مل جائے گی۔ نواب دین ایک بڑا زمین دار تھا۔ اس کی دوسرے قریبی شہروں کے علاوہ اس شہر کے پاس گاؤں میں بھی زمین تھی۔

یہاں بھی ایاز کی سوچ منفی ہی رہی تھی۔ اس نے نواب دین کا اس سے پیار اور چاہت کو ایک طرف رکھ کر اپنے مطلب کا سوچ لیا تھا کہ موقع ملے ہی اُسے نواب دین کو کیسے لوٹ کر طارق کے پیسوں کا انتظام کرنا ہے۔

ایاز جانتا تھا کہ نواب دین ایک اصول پسند شخص ہے۔ پورے خاندان میں ہی نہیں بلکہ اس سے ملنے والے بھی یہ بات جانتے تھے کہ وہ اول تو کسی کو پیسہ اُدھار دیتا نہیں ہے اور اگر دے تو جب تک بات کی تہہ میں نہیں پہنچ جاتا، بات سے مطمئن نہیں ہو جاتا، اپنی جیب کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ اس لئے نواب دین سے پیسہ لینا ناممکن ہی تھا۔ اس کے آگے کوئی جھوٹ نہیں چل سکتا تھا۔

اُسے وہ واقعہ بھی یاد تھا جب ایک بار کسی عزیز کو پیسوں کی اشد ضرورت پڑی تھی اور وہ تنگ تھا تو اس کی ساری بات سن کر نواب دین نے اُسے پیسے دینے کی بجائے، اسے ساتھ لے جا کر اپنے ہاتھ سے روپے دیئے تھے۔ ایاز کے لیے پیسہ لینا مشکل تھا۔ اس لئے اس نے منفی راستہ ہی سوچا تھا۔

ایاز نے اٹھ کر بیک نکالا اور اپنے کپڑے اس میں ڈالنے لگا۔ اُسے احساس ہی نہ ہوا

”طارق بھائی تم مجھے ایک ہفتہ دے دو۔ میں سات دنوں میں تمہارے سارے پیسے واپس کر دوں گا۔ سات دنوں کے بعد آٹھواں دن نہیں آئے گا۔“

”اب تم جاؤ، مجھے اور کام بھی کرنے ہیں۔ پرسوں ملاقات ہوگی۔“ طارق نے لاپرواہی سے کہا۔ ایاز نے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ بھنسن گیا تھا۔ طارق کی رقم اور پھر یہ بات کہ نازی کے بھائی نے سکندر جیسے آدمی کے منہ پر اسی کے کلب میں اسی کے آدمیوں کے سامنے چھتر مار کر اُسے بھی خبردار کر دیا تھا کہ وہ قدم اٹھانے سے پہلے سو بار سوچے اور پھر کچھ کرے۔

ایاز کسی تھکے آدمی کی طرح جو طویل مسافت کر کے آیا ہو، اپنی جگہ سے اٹھا۔ دروازے تک گیا اور پھر واپس آکر بولا۔ ”ایک چانس دے دو۔ صرف ایک چانس۔“

”ایک بار نہیں تم سو بار بھی میری منت کرو گے تو میرا جواب نہ میں ہی ہوگا۔“ طارق نے کہا۔ اُس کی آنکھوں اور لہجے میں کوئی نرمی نہیں تھی۔ ایاز باہر نکل گیا۔

ایاز سڑکوں پر پیدل ہی پھرتا رہا۔ وہ سوچتا رہا کہ پرسوں تک وہ کیسے طارق کی رقم کا بندوبست کرے گا۔ نازی سے محبت کا ڈرامہ رچاتے ہوئے اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کا بھائی اس کی سوچ سے بھی کہیں زیادہ دلیر ہے اور وہ خود اتنا بہادر نہیں تھا کہ نازی کے بھائی کے بارے میں یہ جان کر کہ اس نے سکندر کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا، وہ اس کے گھر کی طرف جائے۔ جب طارق اسے ملتا تھا تو وہ نازی کے گھر کی طرف ہی جا رہا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ خود نازی کے گھر جا کر اس سے ملے گا اور اگر اس کا بھائی بھی موجود ہوا تو وہ بلیک میل کرنے کی دھمکی دے گا۔ اپنی عزت بچانے کے لیے ایک ڈرپوک بزنس مین اس بات پر راضی ہو جائے گا کہ وہ اسے کچھ دے دلا کر چپ کرادے۔ اس طرح جاتے چور کی لنگوٹی کے مصداق اُسے اپنے مطالبے سے اتنا تو مل ہی جائے گا کہ وہ طارق کا قرض اتارنے کے ساتھ ساتھ کچھ دن خود بھی آسودگی سے گزار سکے۔ اس دوران اگر کوئی نیا شکار اس کے ہاتھ آتا ہے تو وہ اپنا رخ اس طرف موڑ لے گا۔

لیکن سب کچھ اس کی سوچ کے برعکس ہو گیا تھا۔ اب اس نے سمجھ لیا تھا کہ سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

وہ آوارہ سڑکوں پر پھرتا سوچتا رہا کہ وہ طارق کی رقم کا بندوبست کیسے اور کہاں سے کرے۔ اس کی سوچ کا محور اب یہ ہی رہ گیا تھا۔ آخر تھک ہار کر وہ واپس اپنے گھر چلا گیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اپنے کمرے میں جا کر بھی وہ ان ہی سوچوں میں مستغرق رہا تھا۔ اس نے

کہ اس کے پیچھے دبے پاؤں آکر اس کی ماں کھڑی ہو گئی ہے۔  
 ”کہیں جا رہے ہو؟“ اچانک پوچھنے پر اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔  
 ”ہاں۔“ اس نے کہہ کر پھر کپڑے رکھنے شروع کر دیے۔  
 ”کہاں جا رہے ہو؟“ نگہت نے پوچھا۔  
 ”کہیں بھی۔“ ایاز نے اپنے کام میں مصروف جواب دیا۔  
 ”یہ گھر کیا چھوٹا ہو گیا ہے۔“ نگہت نے پھر پوچھا۔  
 ”میں نے تو ایسا نہیں کہا۔“ ایاز نے کچھ اور سامان بیگ میں ڈالا اور اس کی زپ بند کرنے کے بعد کہا۔  
 ”میری باتیں اچھی نہیں لگی تھیں۔ غصہ آ گیا ہے۔ اس وجہ سے یہ گھر چھوڑ کر جا رہے ہو۔“ نگہت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے شفقت سے پوچھا۔  
 ”نہیں مجھے آپ کی کوئی بات بھی بری نہیں لگی تھی۔ کیونکہ جو حقیقت ہوتی ہے، وہ زبان پر آ کر رہتی ہے۔“ ایاز نے کہا۔  
 ”دیکھو تم بھی وہ بات کر دیتے ہو جو میں نہیں کرنا چاہتی۔ جو باب ہماری زندگی سے ختم ہو چکا ہے، اسے بار بار کھولنے سے سوائے تلخیوں کے ہمیں کچھ نہیں ملتا۔“ نگہت نے اس کے پاس ہو کر سمجھانے کے انداز میں کہا۔  
 ایاز نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”جو باب ختم ہو چکا ہے وہ یا جو ہمارے ساتھ کھلا ہے، سوائے تلخیوں کے اور کچھ نہیں ہے۔“  
 ”تم ایسا مت سوچا کرو۔ میں تمہارا ہر طرح سے خیال رکھتی ہوں اور تمہیں کیا چاہیے۔“ نگہت نے کہا۔  
 ”میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔“ ایاز نے بلا تامل کہا۔  
 ”ہاں یہ تو اچھی بات ہے۔ تمہیں اب عملی زندگی میں آ جانا چاہیے۔ یہ بات میں تم سے پہلے بھی کر چکی ہوں۔“ نگہت نے خوش ہو کر کہا۔  
 ”تو دیجئے پھر سرمایہ۔“ ایاز نے جاتے جاتے پتہ پچینک دیا۔  
 اس کی بات سن کر جیسے نگہت کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس نے متانت سے ایاز کی طرف دیکھتے ہوئے ایک دو بار اپنا منہ بنایا اور کہا۔ ”جب تمہارے باپ نے مجھے چھوڑا تھا تو میرے پاس سوائے میرے زیورات کے اور کچھ نہیں تھا۔ انہیں بیچ کر میں نے بوتیک کھولا تھا۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا تھا۔“

ایاز نے پھر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور ایک ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجا کر کہا۔ ”بیڈ لک..... کہ میرے پاس زیورات یا کوئی بھاری کنگن نہیں ہے کہ آپ سے مانگنے کی نوبت نہ آتی۔“  
 ”تم کہیں نوکری کیوں نہیں کر لیتے۔“ نگہت نے کہا۔  
 ایاز نے اپنا بیگ کندھے پر لٹکایا اور کہا۔ ”میں کچھ دنوں کے لیے جا رہا ہوں۔ اگر کہیں میرا کام بن گیا تو شاید وہ جیب خرچ جو آپ مجھے دیتی ہیں، وہ مستقل آپ کا بیج جائے گا۔ خدا حافظ۔“  
 ”لیکن جا کہاں رہے ہو؟“ نگہت نے پوچھا۔  
 ”اس سے آپ کو کیا فرق پڑے گا۔“ ایاز نے رک کر کہا اور جانے لگا تو نگہت یک دم سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔  
 ”تمہاری کمائی کھانے کے دن آئے تو تم یہ گھر چھوڑ کر جا رہے ہو۔“ نگہت نے کہا۔  
 ”جو بھی کرنا ہے وہ تمہیں میرے سامنے یہاں رہ کر کرنا ہو گا۔“  
 ”آپ کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہی رویہ جو کبھی میرے باپ کے سامنے آپ کا ہوتا تھا۔“ ایاز نے کہا۔  
 ”باپ..... باپ..... باپ..... تم کیا ہر وقت اپنے باپ کو یاد کرتے رہتے ہو۔ وہ ہماری زندگیوں سے دور چلا گیا ہے۔ تمہیں میں نے پالا ہے۔“ نگہت سبک پا ہو کر دھاڑی۔  
 ”شاید وہ ہماری زندگیوں سے دور نہ جاتے۔ آپ کی ضد تھی کہ وہ اپنی ساری جائیداد آپ کے نام لگا دیں۔ بینک اکاؤنٹ بھی آپ کے نام ہو۔ انہیں ضرورت ہو تو وہ آپ سے مانگیں۔“ ایاز نے کہا۔  
 ”کون ہے.....؟ کون ہے جو تمہارے کان بھرتا ہے؟“ نگہت نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”دن بھر جو تم گھر سے باہر رہتے ہو کیا اپنے باپ کے پاس جاتے ہو؟ وہ تمہیں یہ ساری جھوٹی باتیں بتاتا ہے۔ میری زندگی میں وہ زہر گھولنا چاہتا ہے۔“  
 ”اسے کان بھرنا نہیں کہتے۔ یہ حقیقت ہے جو میرے کانوں تک پہنچتی ہے، اور جس دن میں اپنے باپ سے ملوں گا آپ سے چھپاؤں گا نہیں۔“ ایاز نے کہا اور باہر جانے کے لیے قدم بڑھایا۔ نگہت نے اس کی آستین پکڑ کر روک لیا اور پھر تیز لہجے میں بولی۔  
 ”وہ دوسری عورت کے چکر میں تھا۔ بھول رہا تھا وہ ہم سب کو۔ نظر انداز کر رہا تھا وہ ہمیں۔ اسی لئے میں نے اپنی اولاد کے لیے اس سے تحفظ مانگا تھا لیکن وہ شخص ہم سب کو

اسے مل جائیں لیکن نگہت بہت زیرک تھی۔ وہ بچوں کے حصے میں آنے والے پیسے کو بھی اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کرنا چاہتی تھی۔ جو کہ اس نے کیا۔ ایسا وہ ایاز کو بتاتا رہتا تھا۔ ماضی کو نظروں میں منقسم کر کے وہ ایاز کے کان میں ڈالتا رہتا تھا۔

نواب دین کو جب بھی موقع ملتا تھا وہ ماضی کے اوراق ایاز کے سامنے پلٹنے لگ جاتا تھا تاکہ ایاز کا رجحان اپنے باپ کی طرف ہو۔ ایک دن تو اس کے باپ کو اس ملک میں مستقل واپس آنا تھا۔ نواب دین اُسے بتاتا تھا کہ، تمہارا باپ تمہارے اور ارم کے بارے میں اکثر پوچھتا ہے۔

ڈیڑھ گھنٹہ کی طویل مسافت کے بعد جب ایاز کو بس نے نواب دین کے گاؤں کے سامنے اتارا تو اُس نے اپنے سامنے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو دیکھا، ہوا میں جھومتے ہوئے وہ ایسے لگ رہے تھے جیسے وہ اس کا استقبال کر رہے ہوں۔ طارق کے سائے سے دور آ کر اس کے سرے جیسے بھاری بوجھ اُتر گیا ہو۔

ایاز نے ایک طویل انگڑائی لی اور اپنے شہر کے ہر فکر کو ہوا میں اُڑا دیا۔ نواب دین کی حویلی تک تاکہ جاتا تھا۔ وہ آگے بیٹھا ہوا تھا۔ گھوڑا بھاگ رہا تھا۔ مٹی کی دھول گھوڑے کے پیروں سے اُڑ رہی تھی۔ ایاز کو سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

تاکہ نواب دین کی حویلی کے سامنے رکا تو اسی وقت حویلی کا گیٹ کھلا اور جیپ باہر نکلی۔ جیپ میں نواب دین بیٹھا ہوا تھا۔ یک دم اس نے ایاز کو دیکھا تو اس نے جیپ روکنے کے لیے کہا اور خوشگوار حیرت سے باہر نکل آیا۔

”اوئے تم۔“ نواب دین نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اُس نے ایاز کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ ”کوئی اطلاع نہیں کوئی آنے کی خبر نہیں۔“

”میں نے کہا اچانک جا کر آپ کو سر پرانز دوں گا۔“ ایاز نے کہا۔

”اگر تو دومنٹ دیر سے آتا تو میں یہاں سے نکل گیا ہوتا۔“ نواب دین نے کہا۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ۔“ اس نے پوچھا۔

”تیرے شہر کے پاس ہی جا رہا تھا۔ اپنی دوسری زمینوں کی طرف۔ بہت دن سے نہیں گیا تھا۔ سوچا وہاں کا چکر لگا آؤں لیکن اب نہیں جاؤں گا۔ کل چلیں گے ایک ساتھ۔ ابھی تم اندر آؤ۔“ نواب دین بہت خوش تھا۔

ایاز سے سب مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ ایاز بھی اس جگہ آ کر بہت خوش تھا۔ اب اس کے اندر کوئی ڈر یا خوف نہیں تھا۔ اس کی خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی۔

بھول کر کسی اور کا ہو گیا۔ غلط کیا تھا میں نے؟“

ایاز نے اپنی ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”علیحدگی کے بعد جو آپ نے عدالت کا دروازہ کھٹکنا کر ہمارے لئے بہت ساتھ حفظ وصول کیا تھا، اس کی تو ایک بوند بھی مجھے دیکھنے کو نہیں ملی۔ اس گھر میں آپ ہیں یا پھر ارم ہے۔ میں تو اس گھر میں کسی فضول چیز کی طرح رہتا ہوں۔“

”ارم میرے ساتھ کام کرتی ہے۔ تیری طرح نہیں ہے۔“ وہ جھٹ سے بولی۔

”میں نے کب کہا ہے کہ وہ میری طرح سے ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”تم پہلے میری اس بات کا جواب دو کہ تم کس سے ملتے ہو جو تمہیں اتنی باتیں بتاتا ہے۔“ نگہت نے پوچھا۔

”مجھے جانا ہے۔ آپ سے پھر کبھی بات ہوگی۔“ ایاز نے کہا۔

”بات ابھی ہوگی۔“ نگہت نے اپنی بات کے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اُس نے اس کی آستین ابھی تک پکڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر سب باتیں سن کر آگ جل رہی ہو۔ جیسے اس کی باتوں نے سانپ کا روپ دھار کر ڈسا ہو اور نہ ہراس کی خون کی نالیوں میں رفتہ رفتہ اُتر رہا ہو۔

ایاز نے پہلے نرمی سے اپنی آستین چھڑائی اور پھر کہا۔ ”حقیقت سمندر کے اس پانی کی طرح ہوتی ہے جو اپنی ہر چھل کے ساتھ پہاڑ میں راستہ بناتی رہتی ہے اور ایک دن پہاڑ میں چھید ہو جاتا ہے اور پانی کو اس طرف سے بھی گزرنے کے لیے راستہ مل جاتا ہے۔ میں آؤں گا بہت جلد۔ کچھ بن کر۔“

نگہت اس کی طرف حیرت سے دیکھے جا رہی تھی۔ ایاز نے جانے کے لیے دو قدم اٹھائے اور پھر رک گیا۔ وہ واپس پلٹا۔ اُس نے اپنی ماں کا ماتھا چوما اور دل میں کہا۔ ”کاش آپ اتنی ضدی نہ ہوتیں۔“

ایاز کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ سب باتیں اُسے نواب دین نے بتائی تھیں۔ ایاز کا باپ نواب دین کا کزن تھا۔ اُس نے نگہت سے الگ ہونے کے بعد دوسری شادی کر لی تھی اور آسٹریلیا میں رہائش پذیر ہو گیا تھا۔ نواب دین سب جانتا تھا، نگہت نے کس طرح سے جائیداد کے لیے ناک میں دم کیا ہوا تھا، اور پھر جب اس کی علیحدگی ہوئی تھی تو تب بھی اس نے ایاز کے باپ کو عدالت میں گھسیٹ لیا تھا اور اس سے اچھی خاصی جائیداد اور پیسے کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اس میں سے اسے بہت کچھ دینا پڑا تھا۔ ایاز کا باپ چاہتا تھا کہ اس کے بچے

جب ایاز اپنے کمرے میں سو رہا تھا تو اس وقت نواب دین دوسرے کمرے میں اکیلا بیٹھا اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

”مجھے تمہاری ہی ضرورت تھی۔ تمہارے آنے کا انتظار تھا۔ کئی سالوں سے انتقام کا جو زہر میں اپنے دل میں بھر کر بیٹھا ہوں۔ وہ میں نے تم میں منتقل کرنا ہے۔ تاکہ تم زندگی بھر کے لیے مفلوج ہو جاؤ، اپناج بن کر زندگی کی سانسیں لو۔ تمہارے باپ نے مجھے بہت دکھ دیا ہے۔“ نواب دین نے اپنے ہونٹ بھیجھ لئے تھے۔ اس کی آنکھیں یک دم سرخ ہو گئی تھیں۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پیوست کر لئے تھے۔ جیسے وہ کسی کا گلا دبا رہا ہو۔ ایاز کا باپ شجاعت احمد اپنے خاندان میں سب سے زیادہ بڑھا لکھا تھا۔ وہ عاشق مزاج تھا۔ خوبصورت تھا، اور خوبصورتی کو دیکھ کر اپنا اختیار کھودیتا تھا۔ وہ نواب دین کی بہن سے پیار کرتا تھا۔ وہ بھی اُسے چاہتی تھی۔ اس بات کا جب نواب دین کو علم ہوا تو جیسے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو لیکن جب شجاعت احمد نے بتایا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو یہ بات خاندان تک جا پہنچی اور دونوں کی منگنی ہو گئی۔

اسی دوران شجاعت احمد کی ملاقات نگہت سے ہو گئی۔ نگہت نواب دین کی بہن سے زیادہ خوبصورت تھی۔ شجاعت احمد اسے دیکھتے ہی سب کچھ بھول گیا۔ جب شجاعت احمد اور نواب دین کی بہن کی شادی میں ایک دن رہتا تھا، شجاعت احمد نے نگہت سے شادی کر لی اور شہر کے ہجوم میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

نگہت بہت چالاک اور ہوشیار تھی۔ اس نے اپنی شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی یہ جان لیا تھا کہ شجاعت احمد کس نظر اور دل کا مالک ہے۔ اس نے ہوشیاری سے پہلے تو کچھ روپیہ اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کیا اور پھر اسے اس طرف راضی کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ جس گھر میں رہتے ہیں اس کے نام لگوا دے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ خود بھی گھر کی چار دیواری کے اندر نہیں بیٹھنا چاہتی تھی۔ بیوٹی پارلر اور بوتیک کھولنے کی خواہش اس کی پرانی تھی۔ اُس کا مزاج بھی آزاد نہ تھا لیکن شجاعت بھی کچی گولیاں کھیلنے کا عادی نہیں تھا۔ جب نگہت کا اصرار جاںبداد کو نام لگوانے کے لیے بڑھنے لگا تو گھر میں کچھڑی پکنے لگی تھی۔

نواب دین کی بہن دہن بننے سے قبل ہی ایک ایسے انتظار کی سولی پر لٹک گئی تھی کہ جس میں صرف تڑپ تھی۔ شجاعت احمد کو بہت تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملا۔ اس بات کو مہینے گزر گئے۔ نواب دین جو اپنے خاندان میں ہٹ دھرم اور غصیل مشہور تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جاننے والے یہ بھی جانتے تھے کہ اس کے اندر سفاکی بھی اس انداز میں ہے کہ دشمن بھی اس سے بے

خبر رہتا ہے۔ اس نے شجاعت احمد کو کبھی بھی معاف نہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اس کی بہن کو چھوڑنے کی سزا اس نے اپنے دل میں اس کے لیے تجویز کر لی تھی۔

نواب دین اب اپنی بہن کی شادی کہیں اور کرنا چاہتا تھا لیکن گاؤں میں یہ بات عام ہو گئی کہ نہ جانے اس کی بہن میں کیا ہے کہ چاہتے ہوئے بھی شجاعت احمد اسے چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا ہے۔ سب ہی نواب دین کی بہن میں قصور تلاش کرنے لگے تھے۔ بہت سے اس کے بارے میں مشکوک تھے۔ اس کی شادی کہیں نہ ہوئی۔ اسی غم میں نواب دین کی بہن دنوں میں اس روگ کی نذر ہو کر موت کی آغوش میں چلی گئی۔

پھر نواب دین کو ایک دن اس کے وکیل نے شجاعت احمد کے بارے میں بتایا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد نان نفقے کے چکر میں عدالت میں پیش ہو رہا ہے۔ شجاعت اور نگہت کی علیحدگی کے بارے میں سب کچھ نواب دین کو اسی کے وکیل نے بتایا تھا۔ کیونکہ شجاعت احمد کا وکیل اس کا بھائی تھا۔

عدالتی فیصلہ ہو گیا تو اس سے پہلے کہ نواب دین، شجاعت احمد کو اپنی گرفت میں کرتا، وہ پھر غائب ہو گیا۔ پتہ چلا کہ وہ آسٹریلیا چلا گیا ہے۔ نواب دین نے مسلسل نگہت اور اس کے بچوں پر نظر رکھنا شروع کر دی اور جب ایاز بڑا ہوا تو وہ ایک دن اس سے جاملے۔

وہ ایاز کو اس کے باپ کے بارے میں بتاتا، اور وہ یہ بات ایاز کے دل میں بٹھانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اپنے چچا زاد بھائی کی اولاد سے پیار کرتا ہے۔ پیار کا احساس اس نے جگا دیا تھا لیکن کبھی ایک روپیہ بھی ایاز پر اس صورت میں خرچ نہیں کیا تھا کہ ایاز کو وہ استعمال کرنے کے لیے دے دیتا۔

نواب دین اپنی بہن اور اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ باپ نہیں ملا تو بیٹا ہاتھ آ گیا تھا۔ اُسے اپنے انتقام سے مطلب تھا۔ باپ اور بیٹے میں اس کی نظر کے سامنے کوئی فرق نہیں تھا۔

دوسرے دن نواب دین اُسے اپنی اُن زمینوں میں لے گیا جو اس کے شہر کے پاس ہی تھیں۔ ایاز نے سوچا کہ اس جگہ کا شہر سے تیس کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ کہیں طارق اس کی تلاش میں یہاں تک تو نہیں آجائے گا؟ لیکن پھر اُس نے اپنی اس سوچ کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔ تیس کلومیٹر کا بڑا فاصلہ ہوتا ہے اور پھر جو جگہ کسی کے ذہن میں ہی نہ ہو، جس کے بارے میں یہ گمان ہی نہ ہو کہ وہ اس جگہ جا کر بیٹھا ہے تو بھلا اس کا پیچھا کرتا ہوا طارق کیسے یہاں تک آئے گا۔



وہ جگہ بھی بڑی خوبصورت تھی۔ بڑی سڑک سے گاؤں کے اندر جاتی، کھیتوں میں بل کھاتی ہوئی اینٹوں کی بنی سڑک تھی۔ اس سڑک کے ساتھ نواب دین کی پھیلی ہوئی زمین تھی۔ اس زمین کے ارد گرد خاردار تاریکی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ پھل دار باغ تھے اور اس کے بیچ میں ایک بڑی حویلی سی بنی ہوئی تھی۔ اس کے مین گیٹ کے سامنے سڑک بنائی ہوئی تھی جو کہ سیدھی اینٹوں کی بنی سڑک سے جالتی تھی۔

ایاز نے دیکھا تو اس کی آنکھیں خیرہ رہ گئی تھیں۔ ایسی خوبصورت جگہ وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ باغوں میں گھری ہوئی حویلی کی مصور کی تصویر لگ رہی تھی۔

”بہت نظارے ہیں اس گاؤں میں۔ گاؤں چھوٹا ہے لیکن خوبصورت ہے۔ اس گاؤں کے پاس ہی کیونکہ شہر ہے اور پھر کچھ فاصلے پر فیکٹریاں ہیں۔ اس لئے اس گاؤں کے مرد شہر میں یا فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔ دن اور رات میں مردم ہی دکھائی دیتے ہیں۔“ نواب دین نے بتایا۔

نواب دین اُسے حویلی کے اندر لے گیا۔ حویلی میں صرف ملازم تھے۔ اندر ہر چیز قرینے سے لگی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے نواب دین کی غیر موجودگی میں بھی اس حویلی کا خیال پوری سے رکھا جاتا ہے۔

”اب تم اس حویلی میں جتنے دن چاہو رہو۔ اس جگہ کا جو کمرہ پسند ہو وہ اپنے لئے منتخب کر لو۔ کھاؤ پیو اور عیش کرو۔“ نواب دین نے کہا۔

”میں پہلے یہ حویلی اچھی طرح سے دیکھ لوں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں کسی اور ہی دنیا میں آ گیا ہوں۔“ ایاز نے کہا۔

”یہ اور ہی دنیا ہے پیارے۔“ نواب دین نے معنی خیز انداز میں کہا۔

ایاز اکیلا ہی حویلی دیکھنے لگا۔ اوپر جا کر اُس نے پورے گاؤں کا جائزہ لیا۔ سامنے بنی اینٹوں کی سڑک کے ساتھ آبادی تھی۔ بہت سے کچے اور کچے گھر بنے ہوئے تھے۔ ہوا چل رہی تھی۔ اس جگہ کھڑے ہو کر پورے گاؤں کا نظارہ خوب ہوتا تھا۔ ایاز نے فیصلہ کیا کہ وہ اوپر والا کمرہ لے گا۔

”اس حویلی میں کھانا پکانے والا ہے۔ نوکر ہیں۔ تم بڑے آرام سے رہو گے۔“ نواب دین نے اس سے کہا۔

”مجھے لگتا ہے اس جگہ میں سکون سے رہوں گا۔“ ایاز نے کہا۔

”ایک بات اور۔ ابھی باغوں سے پھل اُترنے والے ہیں۔ میں کیونکہ کچھ مصروف

ہوں۔ اس لئے تم دس پندرہ دنوں کے لیے یہاں ہی رہو گے۔“ نواب دین نے کہا۔

”میں اسی جگہ رہوں گا۔“ ایاز نے کہا۔

”جو بھی ضرورت ہوگی کرم دین سے کہنا۔ یہ میرا منشی ہے جو یہاں رہتا ہے۔“ نواب

دین نے ایک دبلے پتلے سے آدمی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”منشی۔“ ایاز نے اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

نواب دین نے اپنے ایک خاص آدمی سے ایاز پر نظر رکھنے کے لیے کہا اور شام کو واپس چلا گیا۔

ایاز نے ایک بار پھر ساری حویلی کا چکر لگایا، باہر نکل کر باغ میں ٹہلا اور پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں موجود بیڈ کے سامنے بڑی کھڑکی کھلتی تھی۔ بیڈ پر لیٹ کر بھی اس جگہ سے باہر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ ایاز اس بات سے لاعلم تھا کہ اس کھڑکی کے عین سامنے اینٹوں کی بنی سڑک کے ساتھ جو دو منزلہ کچا اور پکا مکان بنا ہوا ہے، وہ وہی ہے جہاں نواز اور جمال نے نازلی کو اغوا کر کے رکھا ہے۔

☆=====☆=====☆

وہ تینوں ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔

تیور رات کا کھانا کھانے کے لیے عشرت اور نازلی کو باہر لے آیا تھا۔ اپنے کام کی مصروفیت کی وجہ سے تیور انہیں اپنے ساتھ باہر لانا جیسے بھول ہی گیا ہو۔ وہ تو عشرت نے تیور سے کہا تھا کہ نازلی کا ذہن تر و تازہ کرنے کے لیے انہیں چاہیے کہ وہ انہیں کہیں باہر گھمانے کے لیے لے جائیں۔

تیور بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ وہ بات بات میں کوئی ہنسی کی بات نکال لیتا تھا۔ عشرت اور نازلی اس کی باتوں سے محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ خوشگوار حیرت میں بھی تھے کہ تیور کو بہت دنوں کے بعد وہ اس روپ میں دیکھ رہے ہیں۔

نازلی اپنے چہرے سے خوش دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کی متلاشی نگاہوں میں ایک خوف تھا اور وہ خوف ایاز کا تھا۔ اُسے ہر پل یوں لگتا تھا جیسے ابھی ایاز اس ریسٹورنٹ میں آجائے گا، اور سب لوگوں کی موجودگی میں کچھ بھی کر دے گا۔ اُسے یہ بھی لگتا تھا کہ جیسے ابھی وہ کہیں سے نمودار ہو جائے گا۔ جیسے وہ اس جگہ کہیں کسی میز پر بیٹھا اُن کی طرف ہی دیکھ رہا ہے۔ جیسے ابھی اس ریسٹورنٹ میں وہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ ایک پارے ہوئے اور شکستہ دل سے کوئی بھی اُمید کی جاسکتی ہے۔

”کیا بات ہے؟ تم کچھ گھبرائی سی لگ رہی ہو؟“ اچانک تیمور نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

تیمور کے اس سوال سے نازی مزید گھبرا گئی۔ ”نن..... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”مجھے لگ رہا ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”آپ کو بھوک کی وجہ سے ایسا لگ رہا ہوگا۔ بیٹھ کر گپ شپ بھی ہوگئی۔ کھانے سے پہلے جوس بھی پی لیا اب کچھ کھانے کے لیے لے کر آتے ہیں۔“ عشرت نے جلدی سے کہا۔

”ہاں۔ آجاؤ۔“ تیمور کو جیسے اچانک یاد آیا ہو کہ انہیں کچھ کھانا بھی ہے۔ تیمور اور نازی اٹھ کر اس کاؤنٹر کی طرف چل پڑے جہاں آرڈر سپلائی کرتے اور بل کاٹنے نو جوانوں کے سامنے خواتین اور حضرات کھڑے تھے۔ تیمور اور عشرت ان میں جا کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ میں مینو پکڑ کر اُسے دیکھتے ہوئے اپنی باری کا انتظار بھی کرنے لگے۔ نازی اکیلی ہی اپنی میز پر بیٹھی تھی۔ یک دم اس کی گھبراہٹ میں دو چند اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بار بار دائیں بائیں دیکھنے لگی تھی۔ اسے ڈر بھی لگنے لگا تھا۔ ایاز کا چہرہ اُسے بار بار دکھائی دینے لگا تھا۔

تیمور اور عشرت ابھی اسی جگہ کھڑے تھے کہ ایک نو جوان بڑی شائستگی سے تیمور کے پاس جا کر بولا۔ ”ایکسیکوز می سر۔“

تیمور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”لیں۔“

”اف یو ڈونٹ مائنڈ..... آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔ دراصل ہم دوست اس میز پر بیٹھے ہیں اور میری اُن میں ایک دوست سے شرط لگ گئی ہے۔“ نو جوان نے اسی لہجے میں کہا۔ وہ کچھ ڈر بھی رہا تھا۔

تیمور نے گردن گھما کر اس میز کی طرف دیکھا جہاں تین نو جوان اور بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ عشرت بھی نو جوان کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”کیا پوچھنا ہے آپ کو؟“ تیمور نے مسکرا کر نو جوان کی طرف دیکھا۔

”آپ سربراہ محسوس تو نہیں کریں گے۔ میرے دوست نے جو بتایا ہے وہ میں ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ نو جوان نے کہا۔

”میں سربراہ محسوس نہیں کروں گا آپ پوچھیں کیا پوچھنا ہے۔“ تیمور نے اس کی طرف

دیکھا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے کوئی بکری کا بچہ اس کے سامنے کھڑا ہے۔

نو جوان نے ایک بار گردن گھما کر اپنے دوست کی طرف دیکھا اور تیمور کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”سر..... وہ خطرناک شخص سکندر کے منہ پر آپ نے اسی کے کلب میں جا کر تھپڑ مار دیا تھا کیا؟“

نو جوان کا سوال سن کر تیمور کے چہرے پر یک دم متانت آ گئی تھی۔ اُس نے ایک نظر عشرت کی طرف دیکھا، جو خود یہ بات سن کر اپنی جگہ دم بخود کھڑی تھی۔ چند دن قبل جب وہ اخبار پڑھ رہی تھی تو سکندر کے حوالے سے ایک خبر شائع ہوئی تھی۔ کسی نے انتظامیہ سے پُر زور اپیل کی تھی کہ سکندر کے کلب میں ناجائز کام ہوتے ہیں، وہ ایک خطرناک آدمی ہے، پولیس کو چاہیے کہ وہ اس شخص کو حراست میں لے کر پوری طرح سے تفتیش کرے۔ اس خبر میں سکندر کے بارے میں اور بھی بہت سے انکشافات ہوئے تھے۔ عشرت کی آنکھوں کے سامنے وہ خبر آ گئی تھی۔

”شاید انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ تیمور نے بات کو ختم کر دینا چاہا۔

”میرا دوست کہتا ہے کہ میں اس وقت اس کلب میں بلیر ڈکھیل رہا تھا۔“ نو جوان نے کہا۔

تیمور نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ ”بہتر ہے کہ آپ اپنے دوستوں کے ساتھ انجوائے کریں۔ ہم بھی یہاں کچھ کھانے کے لیے آئے ہیں۔ ان فضول باتوں میں ہم دونوں کا وقت ضائع ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔“

نو جوان نے شاید تیمور کے لہجے میں تغیر محسوس کر لیا تھا۔ وہ مزید آگے سے کچھ نہیں بولا، وہ ہچکچایا اور وہاں سے چلا گیا۔

تیمور اور عشرت ایک ایک ٹرے اٹھا کر واپس نازی کے پاس آ گئے تھے۔ انہوں نے کھانے کے دوران کوئی خاص بات نہیں کی تھی۔ واپس جاتے ہوئے بھی گاڑی میں زیادہ خاموشی ہی ان کے درمیان حائل رہی تھی۔

نازی اپنے کمرے میں چلی گئی جبکہ عشرت اور تیمور نے کچھ دیر بعد اپنے کمرے کا رخ کر لیا تھا۔

”وہ لڑکا کچ کہہ رہا تھا کیا؟“ عشرت نے کمرے میں جاتے ہی سوال کیا۔

”وہ کہہ نہیں رہا تھا، مجھ سے پوچھ رہا تھا۔“ تیمور نے اپنی مسکراہٹ میں چاہا کہ اس کی بات کو دبا دے۔

”چلیں میں سوال اس طرح سے کر لیتی ہوں کہ کیا وہ لڑکا ٹھیک پوچھ رہا تھا؟ تمہارا کوئی اس سے جھگڑا ہوا تھا۔“ عشرت نے متانت سے پوچھا۔

تیمور نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔“  
”یہ چھوٹی بات ہے تیمور؟“ عشرت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے اس کے بارے میں اخبار میں پڑھا تھا کہ وہ ایک خطرناک آدمی ہے۔ وہ کئی جرائم میں ملوث ہے۔ اپنے تعلقات کی وجہ سے ابھی تک پولیس کی گرفت سے دور ہے۔“

تیمور نے اس کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ”تو کیا ہوا؟ کوئی آدمی جب دوسرے کے ساتھ زیادتی کرے تو کیا وہ اس کی زیادتی برداشت کرنے کے سوا کچھ نہ کرے؟ دراصل ان جیسے لوگوں پر بروقت ہاتھ نہیں اٹھتا ورنہ یہ خطرناک لوگ نہ بنیں۔“

”کیا زیادتی کی تھی اس نے تمہارے ساتھ؟“ عشرت نے پوچھا۔  
”میرے کاروبار میں دخل اندازی کر رہا تھا۔ سبق سکھا دیا ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”تم اس کی شکایت پولیس سے کر سکتے تھے۔“ عشرت نے کہا۔  
تیمور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”پولیس سے؟ اگر پولیس اپنے فرائض ایمانداری سے ادا کرے تو شاید جرائم کا خاتمہ بہت پہلے ہو چکا ہوتا۔ تمہیں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی کسی سے مت ڈرو۔“  
”لیکن.....“ عشرت نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن یہ کہ تم اب اس بارے میں کوئی اور سوال مت کرو۔ ایک بہادر انسان کی بیوی بن کر جینا سیکھو۔“ تیمور نے اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔ تیمور تو اُسے تھپڑ مار کر بھول بھی گیا تھا، لیکن عشرت کے دل میں اپنے شوہر کے لیے فکر ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ وہ پھر بولی۔  
”ہمیں ایسے خطرناک لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے۔“

”اب نہ وہ میرے منہ لگے گا ورنہ میں اس کے۔“ تیمور نے اطمینان سے کہا۔  
”لیکن ایسے لوگ انتقام لینے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ عشرت نے نظر آمیز لہجے میں کہا۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اب خاموش ہو گیا ہے۔“ تیمور نے کہا۔  
”خاموشی کے پیچھے ایک طوفان چھپا ہوتا ہے تیمور۔“ عشرت نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے متانت سے کہا۔

تیمور نے اس کی آنکھوں میں خوف محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کسی بھی طوفان کا

زخ بد لے کی طاقت رکھتا ہوں۔ کوئی طوفان میری طرف بڑھ کر تو دیکھے۔“  
عشرت کو تیمور کے لہجے میں مضبوطی دکھائی دی۔ اُس نے مزید اپنا کوئی اندیشہ بیان کرنے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

نازلی اپنے کمرے میں براجمان اس بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ کب تک ایاز کے خوف میں رہے گی۔ اُسے اپنے ذہن سے اس کا خیال نکال دینا ہوگا ورنہ وہ اسی طرح اس سے ڈرتی رہے گی۔ اُس نے یہ بھی سوچا کہ وہ اس بارے میں تیمور سے بات کرے، لیکن پھر خود ہی اُس نے اپنا یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دیا اور کمرے کی کھڑکی کھول کر اپنی ناک سے سانس اندر کھینچ کر منہ سے چھوڑنے لگی۔ اس عمل کو کرتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد جب اُس نے اپنے آپ کو پہلے سے بہتر پایا، اور اُسے لگا کہ اس کا خوف معدوم ہو گیا ہے تو اُس نے آنکھیں آہستہ آہستہ کھول دیں۔ یک دم وہ چونک پڑی۔ سڑک کی دوسری طرف ایاز اپنے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا اس کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔ نازلی کے چہرے پر پھر خوف نمودار ہو گیا تھا لیکن اس نے دوسرے ہی لمحے اپنی آنکھیں بند کر کے جلدی سے کھول دیں۔ اب اس جگہ کوئی بھی نہیں تھا۔ نازلی نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا، وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ نازلی نے اطمینان سے کھڑکی بند کر دی اور سونے کے لئے اپنے بستر پر چلی گئی۔

☆=====☆=====☆

سکندر نے اپنی نگاہیں ناصر کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔  
”اس کا مطلب تیاری مکمل ہے۔“

”ہاں۔“ ناصر نے کہا۔ ”میں نے اپنی آنکھیں ان پر لگا رکھی ہیں۔ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ کہاں جاتے ہیں، آتے ہیں، سب میری نگاہ میں ہے۔“

”اس کام میں انہوں نے آدمی زیادہ اکٹھے کر لئے ہیں کیا خیال ہے؟“ سکندر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اس سے گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔“

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ دونوں اپنی طرف آتی ہوئی گولی کو روکنے کے لیے اپنے ساتھ ملائے ہوئے ساتھیوں کا استعمال کرنا چاہتے ہیں۔“ ناصر نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ڈھال کی سب کو ضرورت ہوتی ہے لیکن ہمیں کیا۔ یہ بتاؤ کہ لڑکی کو کہاں رکھنے کا

ارادہ ہے؟“ سکندر نے پوچھا۔

”اس بات کا پتہ نہیں چل سکا۔ یہ جاننے کی میں بھی کوشش کر رہا ہوں۔“ ناصر نے کہا۔  
”یہ جانتا تو بہت ضروری ہے۔ سارا کھیل ہماری نظر کے سامنے ہوگا تو ہمیں پتہ چلتا رہے گا کہ کیا ہو رہا ہے۔“ سکندر نے کہا۔

”ان سے ہی پوچھنا پڑے گا۔“ ناصر نے کہا۔

”وہ نہیں بتائیں گے۔ تم کہہ رہے تھے کہ کارا انہوں نے طارق سے لی ہے، ہم اس سے اس بارے میں پوچھو۔“ سکندر نے کہا۔

”تم جانتے ہی ہو کہ شکل و صورت سے عام سادکھائی دینے والا، اندر سے کتنا کمینہ اور خطرناک ہے۔ اس سے بات کرنا اپنے آپ پر شک کروانا ہے۔ اس لئے میں دوسرے طریقوں سے ہی پتہ کرتا ہوں۔ ویسے اس کو بھی انہوں نے بتایا نہیں ہوگا۔“ ناصر نے کہا۔  
”تم ابھی جمال کو یہاں بلاؤ۔ وہ اکیلا ہی آئے۔ اکیلا باتوں میں آجائے گا۔“ سکندر نے جلدی سے کہا۔

ناصر نے فوراً اسے فون کر دیا۔ جمال اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ جلد ہی ان کے پاس آ گیا۔

”سب ٹھیک ہو رہا ہے۔“ ناصر نے اس سے پوچھا۔

”ابھی ہو کہاں رہا ہے۔ جب ہوگا، تب اس سوال کی باری آئے گی۔“ جمال نے کہا۔  
”میرا مطلب ہے کہ جو تم منصوبہ بنا رہے ہو وہ ٹھیک ہے نا؟“ ناصر نے جلدی سے کہا۔

”مجھ سے یہی پوچھنے کے لیے یہاں بلایا ہے؟“ جمال نے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔

ناصر نے سکندر کی طرف دیکھا، تو سکندر بولا۔ ”دراصل بات یہ ہے کہ اگر تم لوگوں کو ہماری کوئی ضرورت ہے تو بتاؤ۔ ہم نے کہا تھا کہ ہم تم لوگوں کا ساتھ دیں گے۔“  
”ابھی ضرورت نہیں ہے۔“ جمال نے کہا۔

”ہمارے پاس ایک محفوظ جگہ بھی ہے۔ اگر تم اسے استعمال کرنا چاہو تو....“ ناصر نے کہا۔

ہمارے پاس اس کا بندوبست ہے۔“ جمال نے اس کی بات کاٹ کر جواب دیا۔

”کہاں بندوبست ہے؟“ سکندر نے بلا تامل پوچھا اور اس کی طرف سوالیہ نگاہوں

سے دیکھنے لگا۔

”اسی زمین پر ہے۔“ جمال نے مسکرا کر کہا۔ اس کا یہ جواب ان دونوں کو ہی اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ خار چبا کر اس معاملے میں چپ رہے۔

”ہم سے شاید تم چھپا رہے ہو۔ حالانکہ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔“ ناصر نے کہا۔  
”آپ کو اپنے پیسے سے مطلب ہونا چاہئے۔ اس کا انتظام ہم کر رہے ہیں۔“ جمال نے کہا۔ اس کے لہجے میں جیسے اب ان کا کوئی ڈر یا خوف نہیں تھا۔ ”جب آپ لوگوں کی ہمیں کوئی مدد درکار ہوگی تو ہم بتا دیں گے۔“

”ٹھیک ہے ہم تم لوگوں کے کسی معاملے میں نہیں آتے۔ اب ہم اپنے پیسے سے ہی مطلب رکھیں گے۔“ سکندر کو غصہ آ گیا تھا لیکن اس نے ایک بار پھر اپنے غصے کو دبا کر کہا۔  
”جلدی کام کرو اور ہمیں ہمارا پیسہ واپس دے دو۔“

”فکر کی ضرورت نہیں ہے ایک ایک پائی واپس کریں گے۔“ جمال نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور دل میں اس نے کہا۔ ”اسی لالی پوپ سے گزارہ کرو۔“  
”ہو شیار رہنا۔“ ناصر نے کہا۔

”اب میں جاؤں؟“ جمال نے اجازت طلب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔“ ناصر نے ہولے سے کہا۔

جمال باہر نکل گیا۔ سکندر اور ناصر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سکندر بولا۔  
”راستہ ملتے ہی اس نے اپنی نگاہیں بدل لی ہیں۔ تم نے اس کا لہجہ دیکھا، کیا تھا؟“  
”سب دیکھا۔ لڑکی کو کہاں رکھنا ہے اور کس جگہ یہ اس سے پیسہ منگوائیں گے۔ مجھے یہ پتہ چل جائے۔ جیسے ہی کھیل ختم ہوگا۔ اس کی کھوپڑی میں ایک ایک بات کا حساب لے کر گولی ماروں گا۔“ ناصر نے دانت پیس کر غصے سے کہا۔

☆=====☆=====☆

ٹھیک ایک بجے نواز، طارق کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے طارق کے سامنے پیسے یوں پھینک دیئے جیسے کتے کے آگے کوئی ہڈی ڈال رہا ہو۔ طارق نے پیسے اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”پیسے پورے ہیں؟“

”گن لو۔“ نواز نے کہا۔

”تم گن کر ہی لائے ہو گے۔“ طارق نے خوش ہو کر پیسے اپنی میز کی دراز میں رکھ

”پھر پوچھا کیوں تھا۔“ نواز نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
”پوچھ لینے میں کیا ہے۔ برا لگا تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔“ طارق نے لاپرواہی سے کہا۔

”کار کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میری جیب میں۔“ طارق کہہ کر بے ڈھنگے انداز میں ہنسا۔ ”ظاہر ہے کہ وہ باہر کھڑی ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔“

طارق نے کار کی نمبر پلیٹ بدل دی تھی۔ اُس نے کار کی سیٹوں کے کور کارنگ بھی بدل دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس سے جو تبدیلیاں ہو سکتی تھیں وہ بھی کر دی تھیں۔

”کار میں کوئی خرابی تو نہیں ہے۔“ نواز نے پوچھا۔

”اس میں ایک خرابی ہے۔ یہ پٹرول سے چلتی ہے اور تم یاد سے اس میں پٹرول ڈلو لینا۔“ طارق نے کہہ کر ایک بار پھر اسی انداز میں ہنسی چھوڑی۔ ایک ساتھ بہت سے پیسے وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے، آجانے سے اس کی باجھیں خود بخود کھل رہی تھیں۔ نواز کو اس وقت وہ بہت برا لگ رہا تھا۔

”پیسہ جیب میں آتے ہی پھلجڑی بن گئے ہو۔“

”پیسہ چیز ہی ایسی ہے۔ نہ ہو تو منہ لٹک جاتا ہے، ہو تو ہر چیز لپک کر آجاتی ہے۔“ طارق نے کہا۔ ”جب تمہیں روپیہ ملے گا تو تم بھی میری طرح پھلجڑی ہی دکھائی دو گے۔“  
نواز نے اس سے کار کی چابی لی اور جیسے ہی وہ کار میں بیٹھا کار کے سائیڈ شیشے پر اچانک اس کی نگاہ پڑی اُسے ناصر دکھائی دے گیا، جو پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا اور اچانک وہاں سے دوسری طرف تیزی سے گیا تھا۔

نواز نے دیکھتے ہی اپنے دانت پیسے اور طارق کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں یہ کار تمہیں یہاں واپس نہیں کرنے آؤں گا۔“

”تو کیا ساتھ بیٹھ جاؤں، کام ہوتے ہی میں واپس لے آؤں گا؟“ اس نے پوچھا۔

”ایسی بھی ضرورت نہیں ہے، کہ تم میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔“ نواز نے کہا۔

”تو پھر.....؟“ اس نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”پیچھے جو پارک ہے، وہاں آکر میں تمہیں فون کروں گا۔ وہاں سے تم کار لے لینا۔“ نواز نے کہا۔

”یہ کار تمہیں دے کر میں بہت بڑا رسک لے رہا ہوں۔ احتیاط رکھنا۔“ طارق نے

کہا۔ ”ایسا رسک تم پہلی بار نہیں لے رہے ہو۔“ نواز نے کہا اور ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا

دی۔

”کسی ریس میں حصہ لے رہے ہو؟“ طارق نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کار کو تیر سے

نکلے مکان کی طرح جاتی ہوئی دیکھ کر کہا۔

ناصر موٹر سائیکل پر ہیلمٹ پہنے ایک بڑی گاڑی کے پیچھے کھڑا تھا۔ جیسے ہی کار آگے بڑی اُس نے بھی موٹر سائیکل اس کے پیچھے لگا دی۔ نواز نے پہلے پٹرول ڈلوایا، اور پھر کار مختلف سڑکوں سے لے جاتا ہوا وہ جی ٹی روڈ پر لے آیا، وہاں جاتے ہی اس نے کار کی رفتار اس قدر تیز کر دی کہ ناصر اس کا تعاقب نہ کر سکا، جلد ہی نواز اس کی نظروں سے بچا کر کار گھما کر پھر شہر کی طرف آگیا اور جمال کے پاس پہنچ گیا۔

”اتنی دیر لگا دی تم نے۔“ جمال نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

نواز نے اسے ناصر کے بارے بتایا اور کہا۔ ”یہاں سے جلدی نکلو، وہ ہماری تلاش میں اس جگہ بھی آ سکتا ہے۔“

جمال اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سدرہ مقررہ جگہ پر اُن کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس کی عمر چالیس سال سے زیادہ تھی۔ خوبصورت تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ سدرہ ایک عرصے سے جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ملوث تھی۔ وہ پیسے کے لیے کام کر کے اپنی زبان بند رکھنا خوب جانتی تھی۔ وہ ایک نڈر اور بے خوف عورت تھی۔ وہ سدرہ کو لے کر لائبریری کے پاس جا پہنچے۔ سدرہ کو کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے، اس بارے میں حماد نے اسے سب سمجھا دیا تھا۔ حماد ایک کمرے میں بیٹھا مسلسل ان کے ساتھ فون پر رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ جمال اور نواز نے ہر سوچنے کا کام اسی کے سپرد کر رکھا تھا۔ ان کی دانست میں اس کی بات ماننے میں ہی عافیت تھی۔ کیونکہ حماد نے جو منصوبہ انہیں دیا تھا، ایسا وہ شاید نہ سوچ پاتے۔

نواز اور جمال کار سے اتر گئے تھے۔ سدرہ نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر کار و لائبریری کے ایک طرف اس جگہ کھڑی کر دیا تھا کہ اس کی نگاہ مسلسل دروازے پر تھی۔ کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے سب اس کی نگاہ میں تھے۔ نواز آگے چلا گیا تھا، جبکہ جمال بھی ایک طرف اخبار لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ بظاہر وہ اخبار پڑھ رہا تھا لیکن اس کی نگاہ بھی ہر آنے جانے

والے پر تھی۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ اچانک ایک رکشہ لائبریری کے سامنے آکر رکھا اس کے اندر سے نازلی باہر نکلی۔ جمال نے فوراً اپنے موبائل فون سے سدرہ کو اطلاع دی کہ ”یہ وہ نازلی ہے۔“

سدرہ نے نازلی کی طرف غور سے دیکھا اور اس کی شکل اپنے ذہن میں محفوظ کر لی۔ نازلی لائبریری کے اندر چلی گئی تھی۔ جمال نے اخبار تہہ کیا اور کار کے پاس سے گزرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”مارگٹ آگیا ہے۔ ہوشیاری سے۔“ جمال یہ کہہ کر آگے چلا گیا۔ سدرہ ہوشیار ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ یہ کام اس کے لیے کوئی نیا نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ کوئی خوف نہیں تھا اور ہاتھوں میں کوئی لرزش نہیں تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد نازلی ایک ضخیم کتاب پکڑے باہر نکلی اور اس طرف اپنے قدم بڑھا دیئے جہاں رکشہ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہاں سے وہ چوک کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ نازلی رفتہ رفتہ اس طرف جا رہی تھی۔ سدرہ نے کار اس کے برابر میں روک کر بڑے شائستہ لہجے میں کہا۔

”نازلی رک گئی۔ اس نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔“ ”یس۔“

سدرہ نے ایک پرچی اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”یہ پتہ پوچھنا تھا۔“

نازلی نے اس کے ہاتھ سے پرچی لے لی اور پڑھنے لگی۔ پھر اس نے سمجھانا شروع کر دیا۔

”دراصل میں اس شہر میں نئی ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی، کیا آپ اسی طرف جا رہی ہیں؟“ سدرہ نے کہا۔

”میں جاتو اسی طرف رہی ہوں۔“ نازلی نے کہا۔ وہ کچھ جھجک سی رہی تھی۔

”اگر آپ میرے ساتھ بیٹھ جائیں تو میرے لئے آسانی ہو جائے گی۔“ سدرہ نے درخواست کی۔

”لیکن.....“ نازلی نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ سدرہ نے اسکارف سے اپنا سر اور ماتھا اچھی طرح سے باندھ رکھا تھا۔ جس سے اس کی شکل و صورت دیکھ کر کوئی بھی شک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک شریف عورت نہیں ہے۔ اس کا تعلق جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ہے اور اس وقت اس کے ارادے بھی ٹھیک نہیں ہیں۔

”شاید آپ ڈر رہی ہیں لیکن میں بھی آپ کی طرح ہوں۔“ سدرہ نے مسکرا کر کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن..... میں آپ کو پھر سمجھا دیتی ہوں۔“ نازلی نے کہا اور اسے ایک بار پھر سمجھانے لگی۔ سدرہ اس سے بغور پتہ سمجھتی رہی۔ سدرہ نے اس کے ہاتھ سے پرچی لے لی اور معصوم چہرے کے ساتھ کہا۔

”دراصل میرا بیٹا گھر میں بیمار ہے۔ ہم اس شہر میں نئے شفٹ ہوئے ہیں۔ میرے میاں شہر سے باہر ہیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے گھر کا پتہ ہے جو میرے میاں کے دوست کے والد ہیں۔ میں انہیں لینے کے لیے آئی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی گاڑی خراب ہے ورنہ وہ خود ہی آجاتے۔ میں نے اپنا وقت بچانے کے لیے کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ بیٹھ جاتیں۔ بہر حال کوئی بات نہیں شکریہ۔“ سدرہ نے کہہ کر کار کو جیسے ہی آگے بڑھانا چاہا نازلی نے روک لیا۔

”ٹھیک ہے میں اس چوک تک آپ کے ساتھ بیٹھ جاتی ہوں۔“ نازلی نے کہا اور وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ سدرہ نے کار آگے بڑھادی۔ اس نے کاری رفتار آہستہ ہی رکھی تھی۔ باہر دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنا مطلوبہ پتہ تلاش کر رہی ہو۔

”اب میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ اطمینان سے گاڑی چلا سکتی ہیں۔“ اس کی صورت حال دیکھ کر نازلی نے کہا۔

سدرہ مسکرائی۔ ”اوہ..... دراصل میرا ذہن اب بھی گھر میں ہی ہے۔ اپنا بیٹا میں اپنی ملازمہ کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔ بہت تیز بخار ہے اس کو۔“

نازلی نے اچانک سوچ کر کہا۔ ”آپ ڈاکٹر صاحب کو لینے کے لیے آگئی ہیں، اپنا بیٹا کیوں اپنے ساتھ نہیں لے کر آئیں؟“

نازلی کے اس سوال سے سدرہ گڑبگڑ گئی لیکن اسے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ یہ سوال اس کے ذہن میں کار میں سوار ہونے سے قبل آجاتا تو پھر وہ شاید کار میں نہ بیٹھتی۔

”دراصل بات یہ ہے کہ.....“ سدرہ نے اپنا جملہ مکمل کرنے کی بجائے کار روک دی۔

بجلی سی تیزی سے کار کے دونوں دروازے ایک ساتھ کھلے، نواز اور جمال جو نبی کار کی سیٹوں پر بیٹھے، جمال نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پستول کی نال نازلی کی پہلی پر رکھ دی اور سدرہ نے کار کی ایک دم رفتار بڑھانے کی بجائے آہستہ رفتار میں ہی کار کو آگے بڑھایا اور پھر اس کی رفتار میں اضافہ کیا۔ ارد گرد آتے جاتے لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلا کہ اس جگہ کیا ہو گیا ہے۔

نازلی یک دم پریشان اور خوفزدہ ہو گئی۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھنا چاہا لیکن

جمال نے کرخت لیکن آہستہ آواز میں تحسانہ انداز میں کہا۔

”خبردار جو تم نے پیچھے کی طرف دیکھا، ورنہ گولی مار دوں گا۔“

نازلی جو پہلے ہی ڈر گئی تھی اس دھمکی نے یہ کام کیا کہ اس نے اپنی گردن سیدھی کر لی اور خوف میں ڈوبی آواز میں کہا۔

”کک..... کون ہو تم..... لو..... گ۔“

”ہم کوئی بھی ہیں، تم کوئی سوال مت کرو۔“ جمال نے پھر اسی لہجے میں کہا۔

”رفار بڑھا دو۔“ نواز نے کہا۔

سدرہ نے کاری رفتار بڑھا دی۔ وہ مین سڑک پر آ گئے تھے۔ ان کی کار ڈیفنک کے جوم میں گم ہو گئی تھی۔ پھر وہ اس سڑک پر چلنے لگے جو اس گاؤں کی طرف جاتی تھی۔

نازلی کا خوف سے برا حال ہو رہا تھا۔ وہ اتنے مضبوط اعصاب کی مالک نہیں تھی کہ اس صورت حال کو اپنے دل و دماغ پر غالب نہ آنے دیتی۔ پستول کی نال اس کی پبلی سے لگی ہوئی تھی۔ اس کے سانس اور دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ اس کے اندر کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ایک خیال جو اس خوف میں بھی اس کے ذہن میں کسی بجلی کی طرح سے آیا تھا، وہ یہ تھا کہ ”یہ لوگ ایاز کے بھیجے ہوئے ہیں۔“

”آگے آبادی آرہی ہے۔ یاد رکھنا اگر تم نے کوئی حرکت کی، کوئی شور مچایا، تو اس پستول کی چھ گولیاں میں تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔ بالکل چپ رہنا۔“ جمال کی سانپ کی پھنکار جیسی آواز میں دھمکی، نازلی کی رگوں میں خون جمادینے کے لیے کافی تھی۔ اس کے اندر پہلے ہی کچھ کہنے کی قوت نہیں رہی تھی۔ اب تو وہ مزید کچھ کہنے یا بولنے کی سکت کھو بیٹھی تھی۔

کار سڑک سے اتر کر اس اینٹوں کے بنے راستے پر چل پڑی تھی، جو گاؤں کے اندر جاتا تھا۔ اس مکان کے پاس پہنچتے ہی نواز نے سدرہ کو بتانا شروع کر دیا تھا کہ اب اسے کس طرف کار موڑنی ہے۔ اس مکان کے دو مین دروازے تھے۔ ایک اینٹوں کی بنی سڑک کی طرف کھلتا تھا جبکہ دوسرا دروازہ اندر گلی کی طرف تھا۔

کار جیسے ہی گلی میں رکی، نواز نے اتر کر دروازے کا تالہ کھولا، اس کے ساتھ ہی جمال نے ایک بار پھر نازلی سے کہا۔

”چپ چاپ نیچے اترو اور اس گھر کے اندر چلی جاؤ۔ کوئی حرکت نہیں، کوئی ہوشیاری نہیں۔“

نازلی کو لگ رہا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان ہی نہیں ہے۔ جیسے اس کا جسم بے جان

ہو گیا ہے۔ وہ بمشکل کار سے باہر نکلی، اسی اثنا میں سدرہ بھی باہر نکل آئی تھی۔ اس نے نازلی کا بازو پکڑا اور اُسے اندر لے گئی۔ اس کے پیچھے ہی جمال اس کا پرس، وہ کتاب پکڑے اس طرح اندر گیا کہ کسی کو پرس نظر نہ آئے۔ اگر کسی کی نظر پڑے تو یہ ہی لگے کہ اس نے کتاب پکڑی ہوئی ہے۔ جمال نے اندر جا کر اس کا موبائل بند کر دیا تھا۔

ارد گرد کے گھر والوں کی خواتین نے ان کی طرف دیکھا اور پھر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ مکان شہر کے کسی سینٹھ کا ہے۔ وہ اکثر اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں آتا جاتا رہتا ہے اور اگر وہ نہیں آتا تو گاؤں کی ہواؤں سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کے دوست وغیرہ آتے رہتے ہیں۔ چند دن رہتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

نواز اور سدرہ نے نازلی کو ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے۔ نازلی خوف اور گھبراہٹ سے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے وحشت مترشح تھی۔ اس کے ہونٹ تھر تھرا رہے تھے۔

”دیکھو گھبرانے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تمہاری جان لینے سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ تم بے خوف رہو۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ایک دو دن بعد ہم تمہیں آزاد کر دیں گے۔ یہ اس صورت میں ہوگا اگر تم بھی ہمارے ساتھ تعاون کرو اور کوئی شور شرابہ نہ کرو۔“ نواز نے اسے اچھے انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

نواز کے لہجے میں نرمی دیکھ کر دوسری بار نازلی نے زبان کھولی۔ ”مجھے کیوں..... لائے..... ہو یہاں؟“

”وہ بھی بتا دیں گے لیکن تم کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس سے ہم مجبور ہو جائیں کہ تمہیں گولی مار دیں۔“ اس بار بھی اس کا لہجہ نرم ہی تھا۔

”مجھے ابھی..... گھر جانا..... ہے۔“ نازلی کی آنکھوں میں آنسو بہہ نکلے۔

”ہمیں بھی شوق نہیں ہے کہ ہم تمہیں یہاں رکھیں۔“ نواز نے کہا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی سدرہ نے نازلی کے منہ پر پکڑا باندھ دیا۔ دونوں اس کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکل گئے۔ اس کمرے میں ایک چھوٹا سا روشن دان تھا۔ جس سے روشنی اندر آرہی تھی اور ایک ہی دروازہ تھا، جہاں سے وہ اس کمرے میں آئے تھے۔

ایک دوسرے کمرے میں جمال ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر براجمان تھا۔ ”سمجھا دیا اُسے؟“

”ہاں سمجھا دیا ہے۔ اُمید ہے کہ کوئی گڑبڑ نہیں کرے گی۔ وہ ڈری اور سہی ہوئی ہے۔“

نواز نے کہا۔ ”ہمارا کام آسان ہی رہے گا۔“

”کار واپس کر آؤ۔“ جمال نے کہا اور چابی اس کی طرف اُچھال دی۔  
 ”مجھے بھی پیسے دو، میں بھی اسی کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔“ سدرہ نے کہا۔  
 ”تم کہاں جا رہی ہو؟“ جمال نے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”کام ختم۔“ سدرہ نے کندھے ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس لئے میرا اب یہاں کیا کام۔“

”ابھی تم نہیں جاؤ گی۔“ جمال نے کہا۔  
 ”کیوں؟“ سدرہ نے پوچھا۔

”دو تین دن کا کام ہے۔ تم ہمارے ساتھ ہی رہو گی۔“ جمال نے کہا۔  
 ”یہ بات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے میرا پیسہ دو میں اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔“ سدرہ نے دو ٹوک کہا۔

”میں نے کہا ناں کہ تم نہیں جا رہی ہو۔“ جمال نے کہا۔

”میں جاؤں گی۔ میرا اتنا ہی کام تھا۔“ سدرہ اس کے سامنے کھڑی ہو کر بولی۔

نواز نے جلدی سے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو سدرہ ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ جتنے دن تم یہاں رہو گی۔ ہم تمہیں فی دن کے حساب سے پیسے دیں گے۔ تم اس لڑکی کے پاس رہو گی۔ اس کا خیال رکھو گی۔“

”پیسے ملے گا تو رہوں گی۔“ سدرہ نے کہا۔

”پیسہ کیوں نہیں ملے گا۔“ نواز نے مسکرا کر کہا۔ ”بس تم اس لڑکی کی دیکھ بھال کرو گی۔“

ایک دو دن کا کام ہے۔ پھر ہم سب اپنی اپنی راہ پر ہوں گے۔“

”آتے ہوئے کھانا لے آنا۔ مجھے بھوک لگی ہے۔“ سدرہ نے کہا اور ایک طرف چار پائی پر بیٹھ گئی۔

نواز نے اس جگہ سے کار نکالی اور جانے کے لیے جیسے ہی وہ اینٹوں کی سڑک پر آیا، سامنے سے ایاز ٹہکتا ہوا آ رہا تھا۔ جونہی کار اس کے پاس سے گزری وہ اسی جگہ رک گیا۔ اس نے اپنی گردن گھمائی اور اس کار کی طرف دیکھا، اُس لگا کہ یہ کار جیسے طارق کی ہے۔ اس نے اس کے پاس موجود ہر کار کو استعمال کیا تھا۔ کار کی نمبر پلیٹ سے وہ طارق کی کار نہیں لگتی تھی۔ دور جاتی کار پر ایاز کی مشکوک نگاہیں بدستور رہی تھیں۔

نواز نے کار کی چابی جیسے ہی طارق کے حوالے کی، اس نے کار کو اچھی طرح سے چیک کیا اور پوچھا۔ ”کوئی گڑبڑ؟“

”کوئی نہیں۔“ نواز نے کہا اور جانے کے لیے پلٹا۔  
 ”ایک منٹ بات تو سنو، کہاں جا رہے ہو۔“ طارق نے کہا۔  
 ”اب میرا یہاں کیا کام؟“ اس نے پلٹ کر کہا۔  
 ”پیسے تو دیتے جاؤ۔ ایسے ہی چلے جاؤ گے کیا۔“ طارق نے کہا۔  
 نواز نے اس کی طرف تمحیرنگا ہوں سے دیکھا اور کہا۔ ”سارے پیسے میں نے تمہیں کار لیتے ہی دے دیئے تھے۔“

”وہ تو کار کا کرایہ تھا۔“ طارق نے کہا۔

”تو اور کیا چاہیے؟ کار کا کرایہ ہی تو دینا تھا۔“ نواز نے کہا۔

”منہ بند رکھنے کی میری فیس الگ ہوتی ہے۔“ طارق نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس کی بات سن کر جیسے نواز کو ایک جھٹکا لگا ہو۔ ”کیا کہہ رہے ہو۔ کون سی منہ بند کرنے کی فیس؟“

”زیادہ نہیں بس دس ہزار روپے۔ اب میں اتنا بھی لالچی نہیں ہوں کہ پچاس ہزار کی ڈیمانڈ کروں۔“ طارق نے کہا۔

نواز اس کی بات سن کر حیران ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ ”میں نے تمہاری کار میں کون سا جرم کیا ہے کہ تم مجھ سے منہ بند رکھنے کی فیس مانگو۔ میں نے تم سے کار لی، اس شہر کی سیر کی اور کار تمہیں واپس کر دی ہے۔“

”تم نے اس کار میں ایک اغوا کیا ہے۔“ طارق نے کہا۔

نواز اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ ”اچھا..... میں کہہ دیتا ہوں کہ تم نے اس آفس میں کسی کو گولی مار کر مار دیا ہے تو کیسا رہے گا؟“

”تمہاری اس بات کا ثبوت ہے؟“ اس نے متانت سے کہا۔

”جیسا تم نے کہہ دیا میں نے بھی کہہ دیا۔“ نواز نے لاپرواہی سے کہا۔

طارق نے کچھ ٹھاننے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”میں نا صبر نہیں ہوں کہ تم مجھے چکمہ دے

کر نکل جاؤ۔ کس کو کہاں سے تم نے اغوا کیا ہے اس کا ثبوت دو؟“

طارق ایسی باتوں کا ماہر تھا۔ وہ اس پُر اعتماد انداز سے بات کرنا جانتا تھا کہ دوسرے کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک جاتی تھی۔ ایسا ہی کامیاب وار اُس نے نواز پر بھی کر دیا تھا اور نواز خیرہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ جا رہا تھا۔ طارق کو یہ تو پتہ تھا کہ اس کار میں ان کا ارادہ کسی کو اغوا کرنے کا ہے۔ اس لئے اس نے پُر اعتماد لہجے میں کہہ دیا تھا۔ نواز نے



سوچا کہ جو یہ جانتا ہے کہ اس کے تعاقب میں ناصر تھا اور اُس نے اسے چمکے بھی دیا ہے، تو وہ اور بھی کچھ جانتا ہوگا۔

”دکھاؤ کہاں ہے ثبوت؟“ نواز نے کہا۔

”تم جاؤ۔ تمہارا کام ختم۔ منہ بند رکھنے کی فیس نہیں ملی۔ منہ کھولنا اب میرا حق ہے۔“ طارق نے مشاق لہجے میں کہا۔

”اور کیا جانتے ہو تم؟“ نواز نے پوچھا۔

”پیارے کیوں سوال اور جواب میں الجھ رہے ہو۔ دس ہزار کی بات ہے۔ منہ میل ہو جائے گا۔“ طارق نے کہا۔

نواز نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”مجھے وہ ثبوت دو۔ میں تمہیں دس ہزار روپے دیتا ہوں۔“

طارق نے اس کی بات سن کر اپنے دراز سے چابیاں نکالیں اور اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ ”مجھے ایک کام جانا ہے۔ ورنہ ہم بیٹھ کر ایک ساتھ چائے بھی پیتے اور کچھ باتیں بھی کرتے۔ مجھے اجازت دو گے؟“

”میں نے تم سے ثبوت مانگا ہے اور تم.....“ نواز نے اسے گھور کر کہا۔

”ثبوت ایک گھنٹے میں تمہیں مل جائے گا۔ جب پولیس تم لوگوں کی تلاش میں ہوگی۔“ طارق نے کہا۔

”تم واقعی ایک کمینے آدمی ہو۔“ نواز دانت پیس کر بولا۔

”ابھی تم نے میرا کمینہ پن دیکھا نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”اور کتنا دکھاؤ گے۔“

”یہ تو ایک جھلک ہے۔“

”میرے پاس وقت نہیں ہے ورنہ میں..... یہ بتاؤ کیا گارنٹی ہے کہ تم اپنی زبان بند رکھو گے۔“ نواز جو کہنا چاہتا تھا وہ الفاظ اس نے اپنی زبان پر آنے سے پہلے ہی روک لئے تھے۔

”ہم کام دو نمبر ضرور کرتے ہیں لیکن زبان کے کپکے ہیں۔“ طارق نے کہا۔

نواز نے جیب سے دس ہزار روپے نکال کر اس کے منہ پر دے مارے۔ نوٹ فرش پر بکھر گئے تھے۔ نواز جانے لگا تو طارق نے کہا۔ ”ایسا بھی چلے گا۔ کوئی بات نہیں۔ میں ایک ایک کر کے نوٹ اٹھا لوں گا۔“

نواز دروازے کے پاس جا کر رک گیا۔ اُس نے سوچا کہ وہ اب اس کی قیمت ادا کر چکا

ہے وہ اس سے ثبوت واپس لے لے لیکن پھر وہ چل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ طارق اسے ثبوت واپس نہیں کرے گا۔ وہ ایک نئی بحث چھیڑ کر بیٹھ جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ کسی نئی بات کو نکال کر اس کی بھی قیمت وصول کرنے کا مطالبہ کر دے گا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا کام ختم کر کے اس شہر کو چھوڑنے سے پہلے اس کا کام کر کے جائے گا۔

☆=====☆=====☆

نازلی کو گھر سے گئے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔

عشرت کو اب اس کی فکر ہونے لگی تھی۔ اس نے اس کے موبائل فون پر رابطہ کیا۔ موبائل فون بند تھا۔ عشرت نے وقفے وقفے سے کوشش کی لیکن کوئی رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی فکر بڑھ گئی تھی۔ اسی طرح ایک گھنٹہ اور گزر گیا تھا۔

عشرت نے تیمور کو فون کیا اور نازلی کے گھر نہ آنے اور اس کے موبائل فون بند ہونے کی اطلاع اُسے دی۔ یہ سنتے ہی تیمور کا خیال فوراً ایاز کی طرف چلا گیا۔

”اس کی وہ دوست کیا نام ہے اس کا.....“ تیمور نے سوچتے ہوئے کہا۔

”فوزیہ نام ہے اس کا۔“ عشرت نے جلدی سے کہا۔

”تم اُسے فون کرو اور پوچھو لیکن بات ذرا سوچ سمجھ کر کرنا۔ پھر مجھے بتاؤ۔“ تیمور نے کہا۔

عشرت نے فوزیہ کو فون کر کے باتوں باتوں میں نازلی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اس طرف نہیں آئی۔ جب دوبارہ عشرت نے تیمور کو فون کیا تو اس بار اس کی تشویش بڑھ گئی۔ اُس نے اپنا کام اسی جگہ روکا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر جانے سے قبل تیمور اس لائبریری میں چلا گیا جہاں اب نازلی جاتی تھی۔ کلرک اُسے جانتا تھا۔ جب تیمور نے اس سے نازلی کے بارے میں پوچھا تو کلرک نے رجسٹر دیکھ کر بتایا کہ وہ ایک کتاب لے کر جا چکی ہے۔ کلرک نے نازلی کے جانے کا وقت بھی بتا دیا تھا۔ وہ سب جان کر تیمور کی تشویش میں مزید دو چند اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ نئے دوسرے اور خیالات اس کے ذہن میں جگہ پانے لگے تھے۔ اس کی سوچ کا محور کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ وہ لائبریری سے باہر نکل آیا تھا۔ اُس نے دائیں اور پھر بائیں دیکھا۔ کچھ دیر وہ لائبریری کی بیڑھیوں میں ہی کھڑا رہا تھا۔

راستے میں جہاں اسے ایاز کا خیال آتا رہا، وہاں یہ خیال بھی اس کے دماغ میں گردش کرنے لگا تھا کہ سکندر نے تو نہیں کوئی ایسی حرکت کر دی؟ اس کی خاموشی کے پیچھے یہی طوفان

تو نہیں چھپا ہوا تھا؟ اگر ان دونوں میں سے کسی نے نازی کو نقصان پہنچائے کی کوشش کی تو اس کی قیمت ان کو ایسی ادا کرنی پڑے گی جو ان جیسے لوگوں کے لیے عبرت ہوگی۔ تیمور نے دانت پیس کر اپنے دل میں اپنے آپ سے عہد کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان ہی سوچوں میں اپنے گھر پہنچ گیا۔

”مجھے یہ ایاز یا پھر اس بدمعاش کا کام لگتا ہے۔“ عشرت نے بھی اپنا خیال اس کے آگے عیاں کر دیا۔

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی کسی اور دوست کی طرف چلی گئی ہو۔“ تیمور نے کہا۔

”اگر ایسا ہے تو اس نے اپنا موبائل کیوں بند کیا ہے؟“ عشرت نے پوچھا۔

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے موبائل کی بیٹری ختم ہو گئی ہو۔“ تیمور نے سوچتے ہوئے کہا۔

دونوں چپ ہو کر سوچنے لگے۔ تیمور کا بار بار دھیان اپنے موبائل فون کی طرف جارہا تھا۔ جیسے اسے انتظار ہو کہ ابھی کوئی فون کال آئے گی۔ جو شاید نازی کی ہو.....

اس طرح کچھ وقت مزید گزر گیا تھا۔ تیمور یک دم جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ عشرت نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

”پہلے ایاز کی طرف... اگر اس نے کوئی حرکت کی ہو تو میں اسے اسی جگہ فن کر دوں گا۔“ اگر اس کا ہاتھ نہ ہوا تو میں پھر سکندر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ تیمور نے کہا۔ غصہ اس کے چہرے سے مترشح ہو رہا تھا۔

”کیا پوچھو گے ایاز کے پاس جا کر اور پھر کیا کہو گے اس بدمعاش سے؟“ عشرت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عشرت کے ان سوالوں کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ تیمور خاموش ہو گیا۔ بغیر کسی ثبوت کے وہ ان سے نازی کے بارے میں بھلا کیا پوچھ سکتا ہے۔ اس طرح نازی کی گمشدگی کی اطلاع ان تک جا پہنچے گی۔ اس نے سوچا کہ یہ وقت جذبات میں بہنے کا نہیں ہے۔ اسے جو بھی سوچنا ہوگا، دل اور دماغ کو حاضر رکھ کر سوچنا پڑے گا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ تیمور نے کہا۔

”ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔“ عشرت حوصلہ دینے کے انداز میں کہا۔

تیمور نے اپنا موبائل فون اپنے کونٹ کی جیب سے نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔ باہر

سورج اپنی روشنی سمیٹ کر رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ اندھیرا اس کی جگہ لینے کے لیے اپنے چھوٹے چھوٹے قدم بڑھا رہا تھا۔

کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے تیمور سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں جا کر نازی کو تلاش کرے۔ عشرت نے اس کے پاس جا کر گہری متانت سے کہا۔ ”بہت دیر ہو گئی ہے۔ کیا ہم پولیس کو اطلاع کریں؟“

تیمور نے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں..... میں پولیس کو اطلاع نہیں دوں گا۔“

”کیوں؟“ عشرت نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اپنے گھر کی چار دیواری کا معاملہ کسی بھی قیمت میں باہر نہیں لے کر جاؤں گا۔“ تیمور کے لہجے میں کوئی لرزش نہیں تھی۔

”پھر کیا کرو گے تم؟“ عشرت نے پوچھا۔

”فی الحال مجھے انتظار کرنا ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”رات کا اندھیرا پھیل گیا ہے۔ اب اور کتنا انتظار کریں۔“ عشرت نے مضطرب ہو کر

کہا۔ ”میرا ایک اندیشہ ہے۔ کہیں ایاز نے نازی کا ذہن نہ بدل دیا ہو اور.....“

”اور.....؟“ تیمور نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اور وہ دونوں کہیں چلے گئے ہوں۔“ عشرت نے بے یقینی سی کیفیت میں اپنا جملہ نہ

چاہتے ہوئے بھی پورا کر دیا۔

تیمور کھڑکی سے ایک طرف ہٹ گیا اور اس نے عشرت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اندھیرے میں کھڑا شخص دوسوں میں گھرا ہوتا ہے۔ یہ سوچ میرے ذہن میں بھی آئی تھی

لیکن مجھے نازی پر بھروسہ ہے وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ ہمیں اس زاویے سے ہرگز نہیں سوچنا

چاہئے۔“

”میرا یہ اندیشہ تھا..... دل کی بات نہیں تھی۔“ عشرت نے کہا۔

اچانک تیمور کے موبائل فون کی گھنٹی نے دونوں کو ایک ساتھ اس طرف اپنی توجہ مبذول

کرنے پر مجبور کر دیا۔ تیمور میز سے موبائل اٹھانے کے لئے آگے بڑھا تو اس کے ساتھ ہی

عشرت نے بھی اپنے قدم بڑھا دیئے۔

موبائل فون پر جو نمبر عیاں تھا، وہ انجانا تھا۔ تیمور نے موبائل کا اسپیکر آن کر کے کہا۔

”ہیلو۔“

”مسٹر تیمور؟“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”بول رہا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔

”میری بات غور سے سنیں۔ میں جو کہنے جا رہا ہوں۔ اس کے بعد اگر آپ نے پولیس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی یا میرا یہ نمبر ٹریس کرنا چاہا تو اس کا نقصان آپ کو یہ ہوگا کہ آپ کی بہن زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔“ دوسری طرف کہا گیا۔

”کون ہوتم اور.....“ تیمور نے جلدی سے کہا۔

”ہم کون ہیں، یہ جان کر تم کیا کرو گے۔ بس اتنا جان لو کہ تمہاری بہن ہمارے پاس حفاظت سے ہے اور اس وقت تک رہے گی جب تک تم کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤ گے جو ہمیں پسند نہیں ہوگا۔“ دوسری طرف سے بڑے اطمینان سے اور کچھ توقف کے بعد کہا گیا۔

”میری بات میری بہن سے کراؤ۔“ تیمور نے کہا۔

”وہ بھی کرا دیتا ہوں۔ ہمیں کچھ رقم درکار ہے۔ تم وہ رقم دے کر اپنی بہن کو ہم سے چھڑا سکتے ہو۔“ وہ بولا۔

”میری بات میری بہن سے کراؤ۔“ تیمور نے زور دے کر چیختے ہوئے کہا۔

”ایک بات اور۔“ اس نے تیمور کے زور دینے اور چیخ کر بولنے کو خاطر میں لائے بغیر کہا۔ ”حکم صرف ہمارا چلے گا۔ ہمارا کام نہیں کرو گے تو تم پر چیخنے چلانے کا حق بھی ہمارا ہے لیکن ہم زیادہ نہیں چیخیں گے۔ ایک دوبار ہوشیار کرنے کے لیے ایسا کریں گے اس کے بعد پنجرے میں قید بلب کو ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیں گے۔“

اس کی بات سن کر تیمور نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔ ”میں پہلے اپنی بہن سے بات کرنا چاہوں گا۔“

”ہاں اب تمہارا لہجہ ٹھیک ہے۔ لو بات کرو۔“ اس نے کہا۔ اس کے بعد قدموں کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ لگتا تھا جیسے وہ موبائل فون پکڑے اس کی طرف جا رہا ہے۔ پھر دروازہ کھلا اور اس کی ہلکی آواز آئی۔ ”یہ لو اپنے بھائی سے بات کرلو۔“

”ہیلو بھائی..... ان لوگوں نے مجھے باندھ رکھا ہے۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ مجھے یہاں سے لے جائیں۔“ نازی نے چیخ کر کہنا شروع کر دیا۔ تیمور کو بولنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

نازی کے کان سے لگایا ہوا فون اس نے ہٹا لیا اور بولا۔

”ہوگئی بات۔“

”کیا چاہتے ہوتم؟“ تیمور نے کہا۔

”میں نے کہا تھا کہ ہمیں پیسہ درکار ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کتنا؟“ تیمور نے کہا۔

”دو کروڑ۔“ اس نے بلاتامل کہا۔

”کہاں؟“ تیمور نے دانت پیس کر فوراً پوچھا۔

”ارے واہ..... بہت پیار ہے بہن سے۔ کوئی رعایت نہیں کوئی چوں جہاں نہیں۔ خیر

اچھی بات ہے۔ اس سے وقت ضائع ہونے سے بچتا ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”میں نے پوچھا کہاں پیسہ چاہئے۔“ تیمور نے چیخ کر کہا۔

”وہ ہم اپنی اگلی کال میں تمہیں بتائیں گے۔“ اس نے کچھ خاموشی اختیار کر کے

جواب دیا۔

”ایک بات یاد رکھنا۔ اگر میری بہن کو کچھ ہوا تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا جس کا کبھی تم

نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔“ تیمور کے لہجے میں پھنکا تھی۔

”اگر تم ہمارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرو گے اور ہمارے ساتھ سیدھی طرح سے

چلو گے تو ہم تمہاری بہن کے خراش بھی آنے دیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔“ اس نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ ختم کر دیا۔

”یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“ عشرت نے پوچھا۔

”اس کا بھی میں پتہ چلا لوں گا۔“ تیمور نے کہا۔ اضطراب اس کے چہرے سے عیاں

ہونے لگا تھا۔

”دو کروڑ..... تم نے فوراً ہاں کر دی۔ اس سے ان کی ڈیمانڈ اور بھی بڑھ سکتی ہے۔“

عشرت نے کہا۔

”مجھے ہر حال میں پہلے نازی کو ان کے قبضے سے چھڑانا ہے۔ پھر ایک ایک پائی کا

حساب ہوگا۔“ تیمور نے گہری متانت سے کہا۔

”یہ یقیناً اس بد معاش کا کام ہے۔“ عشرت نے کہا۔

”کسی کا بھی کام ہے۔ وہ میرے ہاتھ سے نہیں بچے گا۔ برائی کے راستے میں چل کر

کیسی تباہی اس کی منتظر ہوتی ہے، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔“ تیمور نے کہا۔ اس کے

لہجے میں نفرت تھی اور آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ وہ تیمور جو کاروباری شخص کا روپ دھار چکا

تھا، اس کی جگہ ایک ایسا تیمور، عشرت کو دکھائی دے رہا تھا، جو رُخ اس سے قبل کبھی بھی عشرت

نے نہیں دیکھا تھا۔

”تم اُن سے لڑو گے؟“ عشرت نے پوچھا۔  
 ”اب یہ جنگ شروع ہو گئی ہے۔ اُن کو اندازہ نہیں ہے کہ انہوں نے کس کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیا ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”ہمیں کسی سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نازی کو ان کے چنگل سے چھڑائیں گے اور بس۔“ عشرت نے کہا۔ ”ہم اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دیں گے۔“  
 ”ایک بات یاد رکھنا عشرت۔ اگر تم نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نکالا کہ نازی کہاں ہے اور ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اس بات کو ہم دونوں جانتے ہیں۔ تیسرے تک بات نہیں جائے گی۔ اگر اس معاملے کو حل ہونے میں ایک دو دن لگ گئے تو کل سے تم میری جگہ آفس جاؤ گی۔ سارے کام معمول کے مطابق کرو گی۔ یہ معاملہ میرا ہے۔ اسے میں حل کروں گا۔“ تیمور نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔ اس گھر کی عزت کا خیال میں اپنی جان دے کر بھی کروں گی۔ میں کسی کو محسوس بھی نہیں ہونے دوں گی لیکن میں تمہیں بھی یہ اجازت نہیں دوں گی کہ تم ان کے ساتھ لڑو۔ یا اُن کو مارو۔ یا اس کشمکش میں تمہیں کچھ ہو۔“ عشرت نے کہا۔

”میں ایک بہادر فوجی کا بیٹا ہوں۔ ڈر میرے اندر نہیں ہے۔ خوف مجھ سے خوف کھاتا ہے۔ کچھ بھی ہے۔ برائی کے اس راستے پر چل کر دوسروں کو رنج اور تکلیف دینے والوں کو، مجھے یہ بتانا ہوگا کہ اس کا انجام کتنا ہیبت ناک ہے۔“ تیمور نے اُسی لہجے میں کہا۔  
 ”یہ کام قانون کا ہے۔“ عشرت نے کہا۔

”قانون اگر اپنا کام ایمانداری سے کرے تو ان جیسے لوگ اس رستے پر چلنے سے پہلے اپنے سے پہلے انجام کو پہنچنے والوں کا حال یاد کر کے اپنے قدم آگے بڑھنے سے روک لیں۔ جیسا میں نے کہا ہے تم ویسا ہی کرو گی۔ کوئی گھبراہٹ اور کوئی خوف میں تمہارے چہرے پر نہ دیکھوں۔“ تیمور نے کہا۔

”میں بھی تمہاری بیوی ہوں۔ کسی خوف کو اپنے پاس نہیں آنے دوں گی لیکن... میں پھر کہتی ہوں کہ ہم صرف اپنی نازی کو ان سے چھڑالیں۔“ عشرت نے بضدی ہو کر کہا۔  
 ”نہیں..... ایک ایک کو ڈھونڈ کر اس کا انجام دکھاؤں گا۔“ تیمور نے مصمم ارادے سے کہا۔

”اور تم خود قانون کے ہاتھوں میں چلے جاؤ گے۔“ عشرت نے تیز لہجے میں کہا۔

تیمور نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں پیوست کر کے کہا۔ ”میرا وعدہ کہ میں کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑوں گا کہ قانون میری گرد کو بھی پہنچ سکے لیکن میں کسی قیمت پر ان کو نہیں چھوڑو گا۔ نہیں ہرگز نہیں۔“

تیمور جو ٹھان لیتا تھا پھر وہ اس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔ اس کے باپ نے اپنی زندگی میں اُسے بہت کچھ بتایا تھا بہت کچھ سکھایا تھا۔ نازی کو کس نے اغوا کیا ہے؟ اُن کا مقصد محض پیسہ حاصل کرنا ہے یا اس سے کوئی دشمنی ہے، جس کا وہ انتقام لینا چاہتے ہیں۔ عشرت شاید ٹھیک کہتی ہے کہ یہ کام سکندر کا ہی ہوگا۔ کاروباری دنیا میں تو اس نے ہمیشہ دوستیاں ہی بنائی ہیں۔ دشمن اس کا ایک ہی ہو سکتا ہے، اور وہ سکندر کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ رہا معاملہ ایاز کا..... وہ بھی دولت حاصل کرنے کے لیے نازی سے پیار کا کھیل کھیل رہا تھا۔ دونوں میں سے جو بھی ہوا، اپنے انجام سے نہیں بچ پائے گا۔ تیمور نے سوچا۔

تیمور نے ایک کاغذ پر پہلے سکندر کا نام لکھا اور اس کے بعد ایاز کا..... پھر اُس نے دونوں ناموں کے اوپر کراس کا نشان بنا دیا۔

☆=====☆=====☆

جمال اور نواز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جمال کے ہاتھ میں موبائل فون پکڑا ہوا تھا۔ بات ختم کرتے ہی اس نے اپنا موبائل فون آف کر دیا تھا۔ اس وقت کمرے میں وہ دونوں ہی تھے۔ ایک فون نواز نے اپنے کان سے لگا رکھا تھا۔ جس کا رابطہ حماد سے تھا۔ جو بات ادھر ہو رہی تھی وہ حماد کو بتاتا تھا اور حماد اس کا جیسے ہی جواب دیتا، نواز وہ موبائل جمال کے کان سے لگا دیتا تھا۔ اس دوران جمال اپنا موبائل اپنے کان سے ہٹا لیتا تھا تاکہ اس کی آواز دوسری طرف نہ جائے۔

جمال اور نواز نے کیونکہ دوسروں کو چکر دیئے تھے۔ اپنی دانست اور ہوشیاری کے مطابق لوٹا تھا۔ پہلی بار انہوں نے اغوا کیا تھا۔ اس لئے کیا بات سن کر کیا کہنا ہے، اس کے لیے وہ حماد کے محتاج تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ غیر محتاط طریقے سے اُن سے کوئی چوک ہو جائے۔ حماد نے جرائم پر مبنی بہت سے انگریزی فلمیں دیکھ رکھی تھیں۔ اُسے بہت کچھ یاد تھا۔

”کمال ہے..... ہم نے دو کروڑ مانگے اور اُس نے فوراً مان لے۔“ جمال نے کہا۔  
 ”اس کا مطلب ہے کہ بہت پیسے والا ہے۔“ نواز نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اپنی ڈیماٹ بڑھالیں؟“

”حماد سے بات کریں۔“ جمال نے اس کی رائے لی۔

”ہاں۔“ نواز نے اثبات میں سر ہلایا۔

جمال نے جلدی سے اپنے دوسرے فون سے حماد سے رابطہ کیا اور اُسے بتایا۔ ”دو کروڑ مانگے تو اس نے اپنے ماتھے پر شکن ڈالے بغیر مان لئے۔ کیا خیال ہے اپنی ڈیمانڈ بڑھا دیں؟ بہت پیسہ ہے اس کے پاس۔“

”بات پیسے کی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ بہت عزت دار ہے۔ اس لئے اپنی ڈیمانڈ مت بڑھانا۔“ حماد نے دوسری طرف سے کہا۔

”پھر ہمیں زیادہ پیسہ مل جائے گا۔ وہ اپنی عزت کے لیے تین کروڑ بھی دے گا۔“ جمال نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

”بہتر ہے اتنی ہی ڈیمانڈ رکھو۔ ورنہ کوئی مشکل کھڑی ہو سکتی ہے۔“ حماد نے اُسے مشورہ دیا۔

”اگلا فون کب کروں؟“ اُس نے پوچھا۔

”ایک گھنٹے کے بعد۔“ جواب ملا۔

”ٹھیک ہے۔“ جمال نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

”ٹھیک کہتا ہے۔ ہمیں اور ڈیمانڈ نہیں کرنی چاہیے۔“ نواز نے بھی اس کی بات سے اتفاق کیا۔ اسی اثنا میں سدرہ بھی اس کمرے میں آگئی۔

”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ جمال نے اسے گھورا۔

”ایک ہی کمرے میں بیٹھی رہوں؟“ وہ تنک کر بولی۔

”جاؤ ہم ابھی کوئی بات کر رہے ہیں۔“ جمال نے کہا۔

”میں یہاں اس طرح سے نہیں رہ سکتی۔ جو بات بھی کرنی ہے وہ میرے سامنے کرو۔“

ورنہ مجھے اس جگہ سے جانے دو۔“ سدرہ نے کہا اور ایک چار پائی پر بیٹھ گئی۔ ”ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے میں بور ہونے لگی ہوں۔“

”دیکھو سدرہ..... تمہیں اپنے پیسے سے تعلق رکھنا چاہیے۔ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اس سے تمہیں سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ تم جاؤ ہم اپنی بات ختم کر کے آتے ہیں۔“ نواز نے اُسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ مجھے یہاں رکھا ہی کیوں ہے۔ میں یہاں رہ کر کیا کر رہی ہوں۔ مجھے میرے اتنے ہی پیسے دو میں یہاں سے جاؤں۔ مجھے اور پیسہ نہیں چاہیے۔“ سدرہ

ایک دم پھٹ پڑی۔ اُسے ایک جگہ تنک کر بیٹھ رہنے کی قطعاً عادت نہیں تھی۔ پھر شہر سے دور اس گاؤں میں ایک ہی مکان میں چند گھنٹوں میں اُسے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ کوئی شہر جیسا شور شرابہ نہیں تھا۔

جمال کو نہ جانے کیوں اس سے بات کرتے ہی غصہ آنے لگتا تھا۔ وہ چیخ کر بولا۔ ”میں نے کہا ناں کہ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ بار بار ایک ہی بات کرنے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ کبھی۔“ سدرہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ”میں نے کہا تھا کہ میرے ساتھ بات کرنی ہو تو تمیز سے کیا کرو۔ اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رکوں گی۔“

”اگر تم نے ایک قدم بھی بڑھایا میں گولی چلا دوں گا۔“ جمال نے فوراً پستول نکال لیا اور سدرہ پر تان لیا۔

”ہمت ہے تو چلاؤ گولی۔“ سدرہ چیخی۔

نواز جلدی سے اُن دونوں کے درمیان میں آ کر جمال سے بولا۔ ”کیا ہو جاتا ہے تمہیں۔ کیوں تم اس پر بگڑنے لگتے ہو۔ تم دونوں کی آوازیں اگر ارد گرد کے لوگوں کے کانوں تک چلی گئیں تو جانے ہو کیا ہو گا۔“

جمال نے پستول پھر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ سدرہ اسی طرح اپنی جگہ کھڑی رہی۔ جمال نے ڈھیلے لہجے میں کہا۔ ”اُسے کہہ دو کہ یہ آئندہ ایسی بات نہ کیا کرے۔ دو تین دن بعد کام ہوتے ہی یہ جانے لگی۔ ابھی نہیں۔“

”سدرہ تم بھی سمجھو۔ کام ختم ہو گا تو تم چلی جانا۔“ نواز نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے اُسے سمجھایا۔

”اُسے کہہ دو کہ یہ میرے منہ نہ لگا کرے۔“ سدرہ نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ واپس کمرے میں چلی گئی۔

اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ جب جمال نے چیخ کر کہا تھا کہ اگر تم نے ایک قدم بھی بڑھایا میں گولی چلا دوں گا، اس وقت اپنے کمرے میں یوریت سے زچ ایاز باہر نکل کر ٹہلتا ہوا اس مکان کے پاس سے گزر رہا تھا کہ وہ تیز جملہ اس کے کانوں میں پڑ گیا۔ اس کے قدم اسی جگہ رک گئے۔ اُس نے مکان کی طرف دیکھا۔ ارد گرد کوئی بھی نہیں تھا۔ ساتھ والے مکان میں ٹوکا چل رہا تھا۔ اس طرف اس مکان کی آواز نہیں گئی ہو گی۔

ایاز نے ارد گرد دیکھا اور اس مکان کے گلی والے مین دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ باہر اندھیرا تھا۔ جب وہ دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوا تو باہر کوئی بھی نہیں دیکھ

سکتا تھا کہ کوئی اس مکان کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے۔ ایاز لندھیرے کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اس کے بعد جو اندر باتیں ہوئی اُس نے وہ سن لی تھیں۔  
سدرہ کے دوسرے کمرے میں جانے سے اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ کچھ دیر بعد نواز نے کہا۔

”تم پاگل ہو جاتے ہو۔“

”پتہ نہیں کیوں، جب بھی یہ میرے سامنے آتی ہے مجھے یک دم غصہ آ جاتا ہے۔ میں اپنی اس صورت حال کو سمجھ نہیں سکتا۔“  
”مجھے لگتا ہے کہ تم اندر سے پرسکون نہیں ہو۔ اپنی پریشانی اس پر نکال رہے ہو۔“ نواز نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ جمال نے کہا۔

”کیا تم یہ کام کر کے ڈر گئے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔“ جمال نے کہا۔

”اس کے سامنے ٹھنڈا رہنے کی کوشش کیا کرو۔ کام بگڑ بھی سکتا ہے۔ وہ ایک چالاک عورت ہے۔“ نواز نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اور کچھ کھانے کے لیے لے آؤ اور دیکھو لڑکی نے کچھ کھانا ہے کہ نہیں۔“ جمال نے کہا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا جیسے وہ خود بھی اپنے اس رویے پر کچھ ندامت محسوس کر رہا ہے۔

اس کے بعد اندر مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ ایاز کچھ دیر اور بھی کان لگائے کھڑا رہا تھا، لیکن کوئی آواز نہ آئی تو وہ دروازے سے ہٹ کر ایک طرف کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد اس مکان کا دروازہ کھلا اور نواز باہر نکلا۔ اُس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اینٹوں کی بنی سڑک کی طرف چل پڑا۔ دور تک اندھیرا تھا۔ روشنی کسی گھر کے اندر ہی دکھائی دے رہی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ نواز آگے چلا گیا۔ ایاز نے اُسے اندھیرے میں اچھی طرح سے دیکھنے کی کوشش کی، اس کا کچھ چہرہ دکھائی دیا اور کچھ ٹھیک سے پتہ نہیں چلا۔

ایاز کچھ دیر مزید اسی جگہ کھڑا رہا۔ واپس اپنے کمرے میں جا کر وہ ٹہلنے ہوئے سوچتا رہا کہ اس مکان میں کون لوگ رہتے ہیں اور اندر کیا معاملہ چل رہا۔ ان کی باتوں سے کچھ گڑبڑ کی تو آرہی تھی۔

ایاز نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر اس مکان کی طرف دیکھا۔ وہ مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا لیکن ایاز نے اندازہ کیا کہ اس جگہ سے وہ اس مکان کے دونوں دروازے۔ بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ اُس نے ملازم کو بلا کر پوچھا کہ، گھر میں دور بین ہے۔ ملازم نے بتایا کہ چھوٹے صاحب نے دوسرے کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔ ایاز نے دور بین منگوا کر اُسے اپنی آنکھوں سے لگایا، وہ مکان اُسے اندھیرے میں بھی اپنی نگاہوں کے عین سامنے لگا۔

ایاز نے دور بین آنکھوں سے ہٹا کر معنی خیز انداز میں سوچا اور ایک بار پھر ملازم کو بلا کر کر کہا۔ ”تم کب سے ہو یہاں۔“

”میری زندگی کا ہر پل اسی گاؤں میں گزرا ہے۔“ ملازم نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم بہت پرانے ہو۔ یہاں رہنے والے ہر ایک کو جانتے ہو گے۔“ ایاز نے کہا۔

”اس گاؤں کا ہر فرد مجھے اور میں ہر ایک کو جانتا ہوں۔“ ملازم نے سینہ چوڑا کر کے کہا۔

”اچھا..... بھلا وہ جو سامنے مکان ہے، وہاں کون رہتا ہے۔“ ایاز نے ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس مکان میں۔“ ملازم نے اس سمت دیکھ کر کہا۔ ”اس میں ماسٹر رحمت اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے۔ شریف اور سمجھ دار.....“

ملازم شاید مزید ان کے بارے میں بتاتا، ایاز نے اُسی مکان کی طرف اشارہ کر دیا اور پوچھا۔ ”اس مکان میں کون رہتا ہے؟“

”آپ تو باؤجی میرا امتحان لے رہے ہیں۔“ ملازم نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا، اس بہانے ذرا میرا دل بھی لگ جائے گا اور تعارف بھی ہو جائے گا۔ آخر مجھے کچھ دن یہاں رہنا ہے۔“ ایاز بھی مسکرایا اور اُس نے ایک کرسی کھینچ کر کھڑکی کے پاس کر لی اور اُس پر براجمان ہو گیا۔ کھڑکی سے دور تک سب دکھائی رہا تھا۔

”بات تو ٹھیک ہے باؤجی۔“ ملازم بولا۔ ”وہ مکان شہر میں آدمی رہتا ہے اس کا ہے۔ اس بڑے آدمی کا نام ارشد ہے۔ اسی گاؤں میں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ ان ہی گلیوں میں اسی مٹی میں کھیل کر وہ بڑا ہوا تھا۔ پڑھ لکھ کر وہ شہر آباد ہو گیا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ شہر جا کر اُس نے اپنے ماں باپ سے بہت کہا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر شہر اس کے پاس آ جائیں۔ وہاں

دنیا جہان کی ہر چیز اس کے پاس ہے لیکن اس کے ماں باپ نہیں مانتے۔ وہ اس مٹی کو، ان کھیتوں کو، وہ لوگ جو ہمیشہ ان کے دکھ سکھ میں شریک رہے تھے انہیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔“

”اب کون اس میں رہتا ہے۔“ ایاز نے وہ بات جاننا چاہی جو وہ جانا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ جلدی سے بولا۔

”بتاتا ہوں باؤ جی۔“ ملازم نے کہہ کر پھر سلسلہ اس جگہ سے جوڑا۔ ”پہلے اس کی ماں مر گئی، باپ اٹکیلا رہ گیا۔ بیٹے نے پھر بہت زور لگایا لیکن اس بار تو باپ نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس مٹی کو نہیں چھوڑ سکتا اور پھر ایک دن وہ بھی اس دنیا سے چلا گیا۔ آج ان دونوں میاں بیوی کی قبریں ایک ساتھ اسی گاؤں کی زمین پر ہیں۔“ ملازم اُداس سا ہو گیا تھا۔

ایاز کے لیے ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے پہلو بدل کر کہا۔ ”اب کون رہتا ہے اس مکان میں۔“

اپنی عادت سے مجبور ملازم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا۔ ”اپنی مٹی تو اپنی ہوتی ہے باؤ جی۔ اپنی مٹی سے پیار ہو تو اولاد کی محبت آڑے آئے یا کوئی اور..... وہ مٹی بیروں تلے سے چھوٹی نہیں ہے۔ رشید کے ماں باپ نے اس مٹی کو مرتے دم تک نہیں چھوڑا۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ اب یہ مکان تو خالی ہو گیا ہوگا۔“ ایاز نے کہا۔

”یہ مکان خالی ہے لیکن کبھی کبھی جب دل کرتا ہے رشید اپنے دوستوں کے ساتھ ایک دو رات رہنے کے لیے یہاں آ جاتا ہے۔ اس مکان میں قرآن پڑھتا ہے۔ اپنے ماں باپ کی نشانی رکھی ہوئی ہے اس نے۔ ورنہ مکان کو تالا لگا رہتا ہے۔“ ملازم نے بتایا۔

”اب بھی خالی ہے یا کوئی ہے اس میں؟“ ایاز نے پوچھا۔

”پتہ چلا ہے کہ کوئی اس مکان میں آئے ہیں۔ مجھے دیتو بتا رہا تھا۔ ایک دو لڑکیاں اور دو مرد آئے ہیں۔ بڑی کار میں۔ رشید کے دوست ہوں گے۔“ ملازم نے بتایا۔ ”دو چار دن رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے۔ رشید کا ایک دوست ہے اس کی بیوی کو کوئی بیماری بھی ہے۔ اس کے لیے ایسی تازہ ہوا ضروری ہے۔ وہ بھی آتا جاتا رہتا ہے۔ شاید وہی ہو۔“

دو مرد اور دو لڑکیاں۔ ایاز نے سوچا اور پھر پوچھا۔ ”یہ رشید کیا کرتا ہے؟“

”شہر میں بڑا کاروبار ہے۔ کبھی اس ملک جاتا ہے تو کبھی اس ملک آتا ہے۔ بڑا پیسہ والا ہے۔“ ملازم نے بتایا۔

”کیسا آدمی ہے رشید؟“ ایاز نے پوچھا۔

”وہ بھلا اور شریف لڑکا ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ گاؤں آتا ہے تو بچے بچے مل کر جاتا ہے۔ کسی کو نہیں بھولا۔“ ملازم نے کہا۔ ”بچپلی بار آیا تھا تو میرے لئے شہر سے گرم چادر لے کر آیا تھا۔ مہنگی ہے۔ ساری سردیاں میں نے پرانی چادر کے ساتھ نکال لیں لیکن وہ مہنگی چادر میں نے ایک بار بھی نہیں لی۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ ایاز نے کہا۔ دور تک سناٹا تھا اور سناٹے کوکتوں کے بھونکنے کی آوازیں بیچ میں توڑ دیتی تھیں۔

”کچھ تو ہے..... کچھ تو ہے۔ جانا پڑے گا۔ وہ کون لوگ ہیں۔ معاملہ کیا ہے؟“ کچھ دیر بعد اُس نے اپنے آپ سے کہا اور کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔

☆=====☆=====☆

تیمور کو فون کرنے سے قبل حماد پہلے اس جگہ گیا تھا اور اُس نے ہر طرف سے اچھی طرح سے جائزہ لیا، کاغذ پر کچھ لکھا اور اس کے بعد واپس جا کر اُس نے ساری صورتِ حال جمال کو بتائی۔

وہ چھوٹا پل کہلاتا تھا۔ طویل اور چوڑی شہر کے بیچوں بیچ گزرتی نہر پر وہ پل ریلوے پٹری کے پاس تھا۔ اس پل سے گزر کر لوگ دوسری طرف ریلوے کالونی کی طرف جاتے تھے جو اس سے فاصلے پر تھی۔

اس نہر کے ساتھ ایک سڑک تھی۔ جہاں سے بھاری ٹریفک ہی آتی جاتی تھی۔ پل کے ساتھ مچھلی بازار تھا۔ اس جگہ تازہ مچھلی کے انبار آتے جاتے رہتے تھے۔ کیونکہ شہر کے قریب جگہ تھی اس لئے عام لوگوں کا مچھلی کی خریداری کے لیے بھی رش رہتا تھا۔ اس جگہ تھوک اور پرچون مال فروخت ہوتا تھا۔ منداں دھیرے سے لے کر رات گئے تک یہاں رونق رہتی تھی۔

مچھلی کے آڑھتیوں کے ساتھ ساتھ اس جگہ پھل فروٹ کی ریڑھیاں بھی بڑی تعداد میں کھڑی ہوتی تھیں۔ جو لوگ مچھلی کی خریداری کے لئے آتے تھے، وہ ساتھ پھل بھی خرید لیتے تھے۔

حماد نے پُر رونق جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ جمال اور نواز نے سن کر کہا بھی تھا کہ اس سے بہتر ہوتا کہ کسی ویران جگہ پر پیسہ منگوا لیا جاتا لیکن حماد نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ، اس رش میں کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ کسی ویران جگہ پر انتظار کرتے یا لین دین کرتے ہوئے کسی کی نظروں میں بھی آ جانا زیادہ آسان تھا۔ اس کے علاوہ حماد اپنی بات منوا کر انہیں

چلانے میں اپنے اندر زعمِ سامحوس بھی کرتا تھا۔ اس کے دل میں یہ بات بھی بیٹھ گئی تھی کہ وہ ان پر غالب ہے، اور انہیں اپنی مرضی سے چلا رہا ہے۔

تیور کو جمال نے اپنے ہاتھ میں پرچہ پکڑ کر فون کیا تھا۔ وہ پرچہ حماد نے لکھ کر دیا تھا۔ حماد پہلی بار رات کے اندھیرے میں اس جگہ آیا تھا۔ اُس نے پرچہ دیا اور وہاں سے چلا گیا تھا۔ لڑکی کس کمرے میں بند ہے۔ اس نے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

”مسٹر تیور.....“ فون ملتے ہی جمال نے کہنا شروع کیا۔ ”دو کروڑ روپیہ چمڑے کے بیک میں ڈال کر اس کی زپ کو لاک لگا کر صبح بچے چھوٹے پل پر لے کر پہنچو۔“

”صبح چھ بجے؟“ تیور نے کہا۔

”کیا تم میری بات غور سے نہیں سن رہے ہو کہ مجھے اپنی بات دھرانے کا موقع دے رہے ہو؟“ جمال نے درشت لہجے میں کہا۔

”لگتا ہے کہ تم سوچ کر بات نہیں کر رہے ہو۔“ تیور نے کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ جمال نے پوچھا۔

”بینک صبح نو بجے کھلتے ہیں۔“ تیور نے کہا۔

”تمہارا روپیہ کیا بینک میں ہے؟“ جمال نے نوازی کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

”ظاہر ہے۔ میں بینک کے ذریعے سے لین دین کرتا ہوں۔ بینک میں ہی اپنا روپیہ رکھتا ہوں۔“ تیور نے کہا۔ ”کچھ روپیہ مجھے اپنے دوستوں سے بھی مانگنا ہوگا۔“

”اتنے پیسے تو تمہارے گھر میں موجود ہونے چاہئیں۔“ جمال نے کہا۔

”میں کاروبار کرتا ہوں نوٹ چھاپتا نہیں ہوں۔“ تیور نے جواب دیا۔

جمال نے سوچا اور پھر کہا۔ ”میں دوبارہ فون کرتا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کر کے نوازی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”پھر حماد سے پوچھنا پڑے گا؟“ نوازی نے منہ بنا کر کہا۔

”اپنی طرف سے کہہ دیتا؟ جس کے ذمے سوچنے کا کام ہے، اسی کے ذمے رہے تو اچھا ہے۔“ جمال نے کہہ کر حماد سے رابطہ کیا۔

”تم اُسے کہو کہ وہ نو بجے بینک سے روپیہ نکال کر تیاری رکھے، ہم پھر فون کریں گے۔“ حماد نے سوچ کر کہا۔ ”پوری رقم کا بندوبست کر لے۔ زیادہ انتظار نہیں ہوگا۔“

”یہ کہہ کر ساتھ ہی وقت بھی دے دیتے ہیں۔“ جمال نے کہا۔

”مجھے کچھ سوچنے کا مزید موقع دو۔“ حماد نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

حماد سے رابطہ کاٹ کر اُس نے تیور کو فون کر کے کہا۔ ”تم نو بجے بینک سے اپنا روپیہ ہال کر تیاری رکھو، ہم بعد میں فون کریں گے۔“

”بعد میں کب؟“ تیور نے پوچھا۔

”جب ہمارا دل چاہے گا۔“ جمال نے جواب دیا اور فون کاٹ کر بند کر دیا۔ جمال نے

ن ایک طرف چار پائی پر اچھالا اور خود ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

”اب حماد سوچے گا اور اس کے بعد ہم کچھ کریں گے۔“ جمال نے کہا۔

”اس کی جگہ میں ہوتا تو اب تک کچھ بھی کر گزرتا۔“ نوازی نے کہا۔

”شکر ہے کہ تم اس کی جگہ نہیں ہو۔ ورنہ اتنی سوچ بچار کے بعد کوئی فیصلہ نہ ہوتا۔“

جمال نے کہا۔ ”اور یہ بھی شکر ہے کہ ہم نے الیاس کو بھی راستے میں ہی فارغ کر دیا۔ یہاں تک نہیں سنبھالی جا رہی، اُسے کیسے سنبھالتے۔“

”کتنی خاموشی ہے یہاں۔ لگتا ہے جیسے کوئی بھی نہیں رہ رہا۔ یہ گاؤں خالی ہے۔ صرف مکان بنے ہوئے ہیں۔“ نوازی نے کچھ سننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”بینک گراؤنڈ میوزک کا کام اس گاؤں کے کتے دے تو رہے ہیں۔“ جمال پہلی بار مسکرا کر بولا۔

”بے سرا میوزک۔“ نوازی بھی ہنسا۔

سدرہ اُن کی باتیں دروازے سے کان لگا کر سن رہی تھی۔ نازی کرسی پر اُسی طرح بندھی ہوئی تھی۔ اس کے منہ پر بھی کپڑا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں بول سکتی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے چہرے پر خشک ہو گئے تھے۔ کمرے میں زیر و کابلبل روشن تھا۔ اس مدہم روشنی میں نازی اپنی آنکھیں گھما کر سدرہ کو کمرے میں ٹہلتے اور سوچتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”حماد.....“ اُس نے زیر لب دہرایا۔ ”یہ حماد کون ہے۔ جو ان کو مشورے دے رہا ہے۔ میں پہلی بار اس کا نام سن رہی ہوں۔“ سدرہ اپنے ذہن پر زور دینے لگی، لیکن اُس کی

آنکھوں کے سامنے کوئی ایسا چہرہ نہیں آیا جسے وہ حماد کے نام سے جانتی ہو۔ اُس نے ایک بار پھر دروازے کے ساتھ اپنی آنکھ لگا کر باہر دیکھا، دونوں اس جگہ موجود تھے۔ موبائل فون چار پائی پر پڑا تھا۔

اُس نے ایک بار پھر زیر لب کہا۔ ”کاش روپیہ لینے کے لیے مجھے اس جگہ بھیج دیں۔ روپے سمیت غائب نہ ہو جاؤں تو میرا نام بھی سدرہ نہیں.... کاش ایسا ہو جائے۔“ دوسری بار اس نے دانت پیس کر کہا۔



☆=====☆

غجر کی نماز کے بعد دن کا اُجالا، رات کے غلاف کو ہٹا کر نمودار ہو گیا تھا۔  
 گلیوں، محلوں اور سڑکوں میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ سڑکوں پر جھاڑو دیتے  
 خاکروب دن کے آغاز کے ساتھ ہی گرد کو ہوا کا حصہ بنا رہے تھے۔  
 تیمور نے رات کچھ جاگ کر اور باقی کرسی پر نیند کے خمار میں گزاری تھی۔ اُسے ان کی  
 فون کال کا انتظار تھا۔ ایسی ہی صورت حال عشرت کی بھی تھی۔ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد تیمور  
 مسلسل اسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا موبائل فون، کاغذ اور پنل اس کے سامنے پڑی ہوئی  
 تھی۔ دن کا اُجالا پوری طرح سے ہر طرف پھیل گیا تھا۔  
 عشرت ہاتھ میں دو بڑے چائے کے گک پکڑے اندر آئی اور ایک گک تیمور کی طرف  
 بڑھاتی ہوئی بولی۔ ”چائے پی لو۔ جسم کی سستی دور ہو جائے گی۔“  
 تیمور نے چونک کر چائے کی طرف دیکھا اور گک پکڑتے ہوئے کہا۔ ”ہاں مجھے اس کی  
 طلب ہو رہی تھی۔“

سے نازلی کے بارے میں فون آیا تھا۔ اس بار بھی تیمور نے فون کا آپیکر آن کر دیا تھا۔  
 ”ہیلو۔“ تیمور نے کہا۔  
 ”مسٹر تیمور؟“ دوسری طرف سے آواز آئی۔  
 ”ہاں بول رہا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔  
 ”میں آپ کا دوست بول رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔  
 ”ہاں بولو۔“ تیمور نے کہا۔  
 ”آپ کے ساتھ ایک کام ہے۔“ اس نے کہا۔  
 ”مطلب کی بات کرو۔“ تیمور نے کہا۔  
 وہ ہنسا۔ ”بے چین ہو؟“  
 ”بولو کیا کہتے ہو۔“ تیمور اس کی ہنسی نظر انداز کر کے بولا۔  
 ”مجھے لگ رہا ہے کہ تم بالکل سنجیدہ ہو۔ تو کیا مجھے بھی سنجیدگی سے ہی بات کرنی ہوگی۔“  
 اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہو۔  
 ”مجھے تمہاری یہ بک بک بالکل اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ کام کی بات کرو۔“ تیمور نے  
 اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔  
 ”تم بھول رہے ہو مسٹر تیمور۔ میں نے کہا تھا کہ تم ہمارے ساتھ اس لہجے میں بات  
 نہیں کرو گے۔“ یک دم وہ متانت سے بولا۔  
 ”تمہیں بھی وہ بات کہنے میں کسی ہنسی مذاق سے کام نہیں لینا چاہئے۔“ تیمور نے کہا۔  
 ”تو سنو۔ ٹھیک گیارہ بجے چھوٹے پل کے پاس ہی ایک لیٹر بکس ہے۔ کسی زمانے میں  
 وہ لیٹر بکس کا ہی کام دیا کرتا تھا لیکن اب اس کے اندر نہ جانے کیا ٹھونسا ہوا ہے۔ اس کے  
 پاس بیگ لے کر پہنچ جاؤ۔“ دوسری طرف سے تحکمانہ انداز میں کہا۔  
 ”گیارہ بجے؟ یہ وقت کم ہے۔ مجھے کچھ رقم باہر سے بھی اکٹھی کرنی ہے۔“ تیمور نے  
 جان بوجھ کر کہا۔

”یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔  
 ”اس طرح میں لیٹ بھی ہو سکتا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔  
 ”تمہارے لیٹ ہو جانے سے تم کیا کھو دو گے، اس کا اندازہ ہے تمہیں؟“ اس نے  
 درشت لہجے میں کہا۔  
 ”میں رقم ایسے ہی نہیں دوں گا۔“ تیمور نے کہا۔ ”میری بہن تم میرے حوالے کرو گے تو

”تم اس کے بارے میں زیادہ مت سوچو۔ اس کے بارے میں سوچنا اب میرا کام  
 ہے۔ میں اُسے ہر حال میں سلامت لے کر آؤں گا۔“ تیمور نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔  
 ”لیکن تم وعدہ کرو کہ تم قانون کو ہاتھ میں نہیں لو گے۔“ عشرت نے کہا۔  
 ”یہ وعدہ میں کر چکا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔

عشرت نے کچھ دیر اس جگہ کھڑی رہنے کے بعد اپنے کمرے کا رخ کر لیا۔ جب وہ  
 تیار ہو کر باہر نکلی تو ٹھیک اس وقت تیمور کا فون بج اٹھا۔ فون کی اسکرین پر وہی نمبر تھا جہاں

بیک تمہیں ملے گا۔“

”میری بات غور سے سنو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ایک بات اچھی طرح سے یاد رکھنا۔ تم اکیلے آؤ گے۔ ہم نے پولیس کا ایک آدمی بھی دیکھ لیا تو تمہاری بہن نہیں بیچے گی۔ جب تم لیٹر بکس کے پاس کھڑے ہو گے تو ایک خاتون تمہارے پاس جائے گی۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ پل کر اس کر کے کچھ ہی فاصلے پر لے آئے گی۔ وہاں تمہاری بہن ہوگی اور ہم ہوں گے۔ تم بیک دو گے اور تمہاری بہن تمہارے حوالے ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں گیارہ بجے اسی جگہ ہوں گا۔“ تیمور نے کہا۔

”ایک بار پھر کوئی ہوشیاری اور چالاکی نہیں۔“ اس نے کہا۔

”میرے ساتھ بھی کوئی چالاکی نہیں ہوگی۔“ تیمور نے خبردار کرنے کے انداز میں اپنے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ ہمارے دھندے کا اصول نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”اوکے۔“ تیمور نے کہا۔

”وقت دیکھو کیا ہوا ہے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”آٹھ بجکر پچاس منٹ ہو گئے ہیں۔“ تیمور نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تمہارا وقت شروع ہوتا ہے۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ میں کوئی بھی اپنی جان سے جاسکتا ہے۔“ اس نے کہا اور رابطہ کٹ گیا۔

تیمور اور عشرت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عشرت نے پوچھا۔ ”کیا سوچا ہے تم نے؟“

”سوچنا کیا ہے۔ رقم لے کر جاؤں گا۔ وہاں پتہ چلے گا کہ کون ہے اس کھیل کے پیچھے۔“ تیمور نے کہا۔

”کیسے پتہ چلاؤ گے۔“ عشرت نے پوچھا۔

”کوئی تو سراغ ملے گا۔“ تیمور بولا۔

”میں چلوں تمہارے ساتھ؟“ عشرت نے کچھ سوچ کر کہا۔

”کیا مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔“ تیمور نے اس کی طرف دیکھا۔

”بات یہ نہیں ہے۔ جب یہ جنگ ہم نے ہی لڑنی ہے تو پھر ہم دونوں کیوں نہیں؟“

عشرت نے کہا۔

”تم ہو میرے ساتھ۔ اس معاملے کی پردہ داری رکھ کر میرے ساتھ لڑ رہی ہو تم بھی۔“

تیمور نے کہا۔

”میں آج آفس نہیں جاتی۔“ عشرت نے کہا۔

”گھر میں رہ کر انتظار کی سولی پر لٹکنے سے بہتر ہے کہ تم کام میں مصروف ہو جاؤ۔“

تیمور نے کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ تم حوصلے اور ہمت سے کام لے کر اپنا ہر قدم اٹھاؤ اور

کہیں بھی اپنے آپ کو کمزور ہونے مت دو۔“

تیمور نے کہا اور اُسے کچھ اپنے کام کے بارے میں سمجھانے لگا۔ پھر اس نے اپنا بریف

کیس اس کے ہاتھ میں دیا اور دروازے تک چھوڑنے کے لیے قدم برہائے ہی تھے کہ ایک

بار پھر اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے جلدی سے فون اٹھایا۔ اسکرین پر وہ نمبر نہیں تھا۔ اس نے

فون آن کر کے کان کو لگاتے ہی کہا۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو بیٹا..... میں بول رہا ہوں احسان احمد۔“ دوسری طرف سے خوشگوار سی آواز اس

کے کان میں پڑی۔

”ارے احسان انکل..... کیسے ہیں آپ؟“ تیمور نے مسکرا کر کہا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ صبح فون کرنے کی معذرت دراصل بات یہ ہے کہ میری بڑی بیٹی

برطانیہ سے آئی ہوئی ہے، اگلے ہفتے اس کی واپسی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک بار نازلی بیٹی سے

مل لے۔“ احسان احمد نے کہا۔

”ہا..... ہاں کیوں نہیں۔“ تیمور نے کہا۔

”تو شام کی ٹکٹ اگر ہمیں مل جاتی ہیں۔ اُڑ کر ہم آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔“

احسان احمد نے کہا اور ہنس پڑا۔

”بات یہ ہے کہ نازلی اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔ وہاں ہماری آنٹی رہتی ہے۔“ تیمور نے

بہانہ کیا۔

”نازلی اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔“ احسان احمد نے دہرایا۔

”ہاں..... ابھی کل ہی گئی ہے۔ سات آٹھ دن رہنے کا پروگرام ہے اس کا۔ میں اس

سے رابطہ کرتا ہوں کہ وہ واپس آجائے۔“ تیمور نے کہا اور عشرت کی طرف دیکھا۔

”نہیں..... نہیں تم اسے مت بلانا۔ یہ تو اچھا ہے کہ وہ اسلام آباد میں ہے۔ میری بیٹی

کے سسرال بھی اسی شہر میں ہیں۔ تمہارے پاس سے ہو کر ہم نے اسلام آباد ہی جانا تھا۔ اب

ہم سیدھے اسی جگہ چلے جاتے ہیں۔ وہاں ہی ملاقات ہو جائے گی۔“ احسان احمد نے کہا۔

”ہاں..... ٹھیک ہے۔“ تیمور نے کہا۔ یہ سن کر وہ مزید الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

”لو پھر میں تمہیں پروگرام بنا کر فون کرتا ہوں۔“ احسان احمد نے کہا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔ تیمور نے ساری بات عشرت کو بتائی تو وہ پریشان ہو گئی۔

”اب کیا ہو گا؟“ اس نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

”یہ بھی سوچنا ہو گا۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”یہ ایک نئی پریشانی پیدا ہو گئی ہے۔“ عشرت نے اپنے ہاتھ سے بیک میز پر رکھ دیا۔

”کوئی پریشانی نہیں ہے۔ کسی بات کو اپنے اوپر سوار مت کرو۔ تم آفس جاؤ، اور دماغ حاضر رکھنا۔“ تیمور نے کہا اور آفس بیک پھر اسے پکڑوا دیا۔ ناچاہتے ہوئے بھی عشرت بیک پکڑ کر آفس چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد تیمور نے الماری سے ایک بیک نکالا اور اُس میں پرانے اخبارات رکھنے کے بعد سیف بے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اس طرح سے اس کے اوپر رکھ دیں کہ لگتا تھا جیسے ان روپوں کے نیچے بھی اسی طرح کی گڈیاں ہیں اور بیک نوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ زپ کو بند کرنے کے بعد اس نے اپنا ریوالور نکالا، اس کا میگزین لوڈ کیا، اس پر سالنسر چڑھایا، چیک کیا اور اپنا کوٹ اتار کر چڑے کی جیکٹ پہن لی۔ ریوالور اُس نے جیکٹ کے اندر رکھ لیا۔ وقت دیکھا، ساڑھے نو بج گئے تھے۔

”ایک ایک کو نہیں چھوڑوں گا۔“ تیمور نے کہا۔ اس کے لہجے میں تپش تھی۔

☆=====☆

جیسے ہی بس رکی کندھے پر بیک لٹکائے ایک لمبا چوڑا جوان، جس کے بالوں کی تراش خراش دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے وہ کوئی فوجی ہو، بس سے باہر نکلا اور پہلا قدم زمین پر رکھتے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے، ایک طویل سانس اپنی ناک سے اپنے جسم کے اندر کھینچ کر منتقل کی اور اپنی آنکھیں کھول کر گردن گھما کر اس شہر کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ جیسے سرشار سا تھا، آنکھوں کی چمک جیسے کسی خوشی سے اور بڑھ گئی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بس سے باہر نکلتے ہی ہلکا پھلکا سا ہو گیا ہے۔ چہرے کے تاثرات ایسے ہو گئے تھے جیسے کوئی پرند اپنے ساتھیوں سے پھڑک پھران سے مل گیا ہو۔

اُس نے ایک انگڑائی لی اور پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔ وہ اس سڑک پر واقع دکانوں اور آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ پیدل چلنے کے بعد اُس نے ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا، جیسے ہی ٹیکسی پاس جا کر رکی اُس نے بیٹھتے ہی اُسے پتہ بتایا اور جونہی ٹیکسی چلنے کے لیے آگے بڑھی یک دم اُس نے کہا۔

”نہیں..... پہلے کالج کی طرف چلو.....“ اُس نے کالج کا نام بتایا اور ٹیکسی ڈرائیور نے رخ اس طرف کر لیا۔

ٹیکسی کالج کے آہنی گیٹ کے پاس جا کر رک گئی۔ کچھ لڑکے گیٹ کے پاس کھڑے ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور ایسے بھی تھے جو کالج کے اندر جا رہے تھے یا پھر باہر نکل رہے تھے۔

کرایہ ادا کرنے کے بعد اُس نے اسی جگہ کھڑے ہو کر کالج کو باہر سے دیکھا اور پھر خراماں خراماں چلتا اندر چلا گیا۔ وہ اپنی گردن گھما کر چاروں طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کمرہ مناظر محفوظ کر رہا ہو۔ جیسے وہ کچھ محسوس کر رہا ہو۔ کالج کے کمروں کے سامنے سے ہوتا ہوا وہ لاہریری کی طرف چلا گیا، پھر کنکین میں اور اس کے بعد اس کے قدم کالج گراؤنڈ کی طرف اُٹھ گئے۔

اس وقت بھی گراؤنڈ میں بہت سے لڑکے تھے۔ وہ ایک چوڑے اور پرانے درخت کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے درخت کو غور سے دیکھا اور پھر اپنے بائیں بازو کی طرف نگاہیں مرکوز کر دیں۔ اُس بازو میں ہلکا سا خم تھا۔ جب وہ ٹوٹا تھا تو اس کے بعد اپریشن کے باوجود اس کا جوڑا اس طرح سے نہیں لگا تھا کہ اس میں خم نہ رہتا۔

وقت چند سال پیچھے چلا گیا۔ اسے لگا کہ وہ اب بھی اسی کالج میں پڑھتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ایک جھٹکے سے اس کا بازو ٹوٹا تھا۔ ایک بار پھر اُس کی سماعت سے وہی شور مگرانے لگا۔ جب اسی جگہ کالج کے لڑکے کھڑے تھے۔ ان دونوں میں پندرہ منٹ سے لڑائی ہو رہی تھی۔ دونوں کے دوست ایک دوسرے کی طرف کھڑے تھے۔ اسی نے منع کیا تھا کہ کوئی ہمارے بیچ میں نہیں آئے گا۔ یہ ہم دونوں کی لڑائی ہے۔ پھر کوئی ان کے بیچ نہیں آیا تھا۔ سب تماشائی بن گئے تھے۔ کالج کے اور بھی لڑکے اس جگہ جمع ہو گئے تھے۔ ایک شور برپا ہو گیا تھا۔ مکوں اور گھونٹوں کی ایک دوسرے پر بارش ہو رہی تھی۔ ایک دوسرے پر اپنا غصہ پوری طرح سے اُتر رہا تھا۔ دونوں ہی نہ بھاگنے والوں میں تھے اور نہ ڈرنے والوں میں تھے۔ تب ایک آواز آئی تھی۔ جیسے سوکھی لکڑی کسی نے توڑ دی ہو۔ اس کے منہ سے ایک کراہ نکلی تھی۔ تکلیف کی شدت سے وہ اسی جگہ اپنے ٹوٹے ہوئے بازو پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا تھا۔ لڑائی رک گئی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے فوراً آگے بڑھ کر اسے سہارہ دے دیا تھا۔ دیکھنے والوں میں ایک ہلچل کی برپا ہو گئی تھی۔ آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ ایک دوسرے سے کہا جا رہا تھا۔

”تیمور نے آفتاب کی بازو توڑ دی۔“

آفتاب کو اس کے ساتھی ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ کالج میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ پرنسپل تک بھی یہ بات پہنچ گئی تھی لیکن کوئی بھی تیمور کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آفتاب کی لڑائی کس سے ہوئی تھی، اس کی بازو کیسے ٹوٹی، وضاحت نہیں ہو رہی تھی۔ جس نے بھی وہ لڑائی دیکھی تھی، اور وہاں موجود تھا۔ وہ صاف مکر گیا تھا کہ وہ اس جگہ تھا ہی نہیں۔ اپریشن کے بعد اپنی بازو کو پلستر میں لپیٹ، سینے کے ساتھ لگائے جب آفتاب کالج میں آیا تو اس نے بھی تیمور کا نام نہیں لیا تھا اور بات گول کر گیا تھا۔

آفتاب نے تیمور کے پاس جا کر کہا تھا۔ ”ٹھیک ہونے کے بعد، تمہاری ایک بازو اور ایک ٹانگ تو ڈرک تجھے اپناج بنا کر بھیک مانگنے کے قابل نہ بنایا تو میرا نام بھی آفتاب خان نہیں ہے۔ یہ ایک پٹھان کا تجھ سے وعدہ ہے۔ یاد رکھنا۔“

اس کی بات سن کر تیمور نے مسکرا کر کہا تھا۔ ”میں تمہارے ٹھیک ہونے کا انتظار کروں گا اور تب تک یاد رکھوں گا جب تک تم میرے سامنے نہیں آجاتے۔ خواہ سال بیت جائیں۔“

وہ انتقام کی آگ، نفرت، رقابت، اور اس واقعے کے کرب کی تپش آفتاب کے سینے میں ہی رہ گئی اور اُسے اپنے باپ کی بیماری کی وجہ سے اپنے علاقے میں واپس جانا پڑا۔ وہاں باپ کی موت کے بعد آفتاب کے لیے واپس آنا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ وہاں کے خاندانی معاملات کچھ ایسے تھے کہ وہ ان میں الجھ گیا تھا اور پھر اس کے بازو کا زخم کچھ خراب ہو گیا تھا۔ اسی دوران تیمور امتحان دے کر کالج سے فارغ ہو گیا تھا۔ اُس نے اس کے ساتھیوں کو اپنا پتہ بھی دیا تھا کہ آفتاب جب بھی اس شہر میں آئے، وہ کسی بزدل کی طرح چھپ کر نہیں رہے گا۔ بلکہ اُسے اپنی بات کو پورا کرنے کا موقع دے گا۔

وقت اسی طرح گزر گیا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ واپس شہر نہیں آسکا اور اس کے بڑے بھائی نے آفتاب کو پولیس میں بھیج دیا تھا۔ اس کی پہلی تعیناتی کراچی میں ہو گئی تھی۔ فاصلہ اور بڑھ گیا تھا۔ مختلف شہروں میں اپنے فرائض کی ادائیگی کے بعد ایک بار پھر آفتاب کا تبادلہ اس شہر میں ہوا تو اُسے یہاں قدم رکھنے کا موقع ملا۔

آفتاب کچھ نہیں بھولا تھا۔ اسے اپنے بازو کے ٹوٹنے کی آواز بھی یاد تھی اور جو اس نے تیمور سے کہا تھا وہ الفاظ بھی اس نے نظر انداز نہیں کئے تھے۔ وہ پٹھان تھا۔ اپنی گردن کٹا سکتا تھا لیکن اپنے کہے الفاظ واپس نہیں لے سکتا تھا۔ اسی لئے وہ سب سے پہلے اس شہر میں آتے ہی اسی کالج میں گیا، اسی جگہ کھڑا ہوا جہاں اس کی بازو تیمور نے سب لڑکوں کے سامنے لڑائی کے دوران توڑی تھی اس نے ایک بار پھر اپنے وعدے کو پورا کرنے کا عزم کیا۔

کالج سے باہر نکل کر اس نے نیکی سی لی اور سیدھا اپنے دوست رضوان کے پاس چلا گیا۔ وہ اسے بڑی گرم جوشی سے ملا اور اپنے دفتر کے اوپر بنائے ہوئے کمرے میں لے گیا جو اس نے خاص ملاقات کے لیے ہی بنا رکھا تھا۔

”تمہارا اس شہر میں تبادلہ ہوا ہے کہ تم نے خود تبادلہ کر لیا ہے؟“ رضوان نے پوچھا۔  
”میرا تبادلہ ہوا ہے۔ وہ بھی کچھ جرائم پیشہ لوگوں کو پکڑنے یا مارنے کے لیے۔“ آفتاب نے کہا۔

”کون لوگ ہیں وہ؟“ اس نے پوچھا۔

”بے فکر ہو، ان میں تمہارا نام نہیں ہے۔“ آفتاب نے مسکرا کر کہا۔

”کہو تو میں خود اپنا نام لکھ دیتا ہوں۔“ وہ بھی ہنسا۔

”سکندر کو جانتے ہو؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

”ذاتی طور پر تو نہیں جانتا۔ اس علاقے کا اچھا آدمی نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا اسی کے لیے آئے ہو؟“

”سکندر، ناصر اور کچھ اور لوگ ہیں لسٹ میں۔ بہت سی شکایات ہیں ان کے بارے میں۔ ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔“ آفتاب نے کہا۔

”پولیس والے ہو، سب کو دیکھ سکتے ہو۔“ رضوان نے اس کے پاس ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایک جرم کی فائل میرے دل کی تجوری میں ہے اور تصویر آنکھوں میں ہے۔ تمہارے پاس میں تم سے محض ملنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ مجھے تیمور کا پتہ چاہیے۔“ آفتاب نے متانت سے کہا۔

”اس کا پتہ.....“ رضوان نے کہہ کر اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں ہے؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہے تو سہی لیکن.....“ اس نے کہا۔

لیکن کیا؟“ وہ بولا۔

”میرا مطلب ہے کہ.....“

”مجھے اس کا پتہ دے دو۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تیمور کا پتہ تم مجھے دو گے۔“

آفتاب نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ انتقام کی تپش ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں عود کر آ گئی تھی۔

رضوان نے کچھ دیر رک کر سوچا، وہ تذبذب کا شکار ہوا اور پھر ایک دروازے سے ڈائری نکال کر ایک کاغذ پر اس کا پتہ لکھا اور اسے دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ اس کے دفتر اور گھر کا پتہ ہے۔“

آفتاب نے کاغذ لے کر پڑھا اور اُسے اپنی جیب میں ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں چلتا ہوں۔“

”ارے بیٹھو۔ ابھی تو کچھ کھایا یا ہی نہیں ہے۔“ رضوان نے کہا۔

”اس شہر میں آتے ہی میں نے خار کھائے ہیں۔ جن کی چھین اب بھی میرے تن و بدن میں ہو رہی ہے۔“ آفتاب نے کہا اور اپنا بیگ اٹھالیا۔

”اب خار کھانا چھوڑ دو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ وقت آنے پر خود ہی چھوٹ جائیں گے۔“ آفتاب نے کہا۔

کچھ چیزوں کو چھوڑنے کے لیے وقت کا انتظار نہیں کیا جاتا، پہلے ہی چھوڑ دینی چاہیے۔“ رضوان نے کہا۔

”اچھی باتیں کرنے لگے ہو۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”تم رہو گے کہاں؟“ اس نے پوچھا۔

”سرکاری رہائش گاہ ہے میرے پاس۔“ اس نے کہا اور جانے کے لیے مڑا۔

”ایک بات کہوں۔“ اچانک رضوان نے متانت سے کہا۔

وہ رک کر پلٹا۔ ”ابھی کچھ کہنا باقی ہے۔ ہاں کہو۔“

”تم مجھ پر ناراض تو نہیں ہو گے۔“ اس نے پوچھا۔

”نہیں ہوں گا۔ بتاؤ کیا بات ہے۔“ آفتاب نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔

”دیکھو آفتاب.... یہ زندگی کی مختلف سیڑھیاں ہیں۔ جن پر ہم وقت آنے پر چڑھتے

ہیں۔ ایک ایسی ہی سیڑھی لڑکپن کی بھی ہوتی ہے۔ اس میں انسان سوچتا نہیں ہے۔ اب ہم سب کسی نہ کسی کاروبار سے منسلک ہو گئے ہیں۔ شہر کے اچھے شہری کہلانے لگے ہیں۔ لڑنے کا وہ بھی ایک دور تھا جو گزر گیا۔ تیمور اس شہر میں کاروبار کرتا ہے۔ اس کی عزت ہے۔ تم ماضی کو بھول کیوں نہیں جاتے۔“

”تم دوست ہو اور پھر میں نے کہا تھا کہ تمہاری بات کا برا نہیں مناؤں گا۔ اس لئے کچھ نہیں کہتا۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس کے منہ سے یہ سنتے ہی زبان کھینچ لیتا۔“ آفتاب نے کہا۔

”دیکھو ہم آپس میں بات کر رہے ہیں.....“ رضوان نے کچھ اور بھی کہنا چاہا۔  
”تم نے تیمور کا مجھے پتہ دیا اور اپنا وعدہ نبھایا شکریہ۔ اب کچھ مت کہنا۔“ آفتاب نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اُسے روک دیا۔

”صرف ایک بات سن لو۔“ رضوان اس کے سامنے آ گیا۔

”مت کہو۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”صرف ایک بات۔“ اس نے تقاضا کیا۔

”کہو۔“ آفتاب نے بادل خواستہ اُسے اجازت دے دی۔

”اب اس کی بیوی ہے اور.....“ رضوان نے جیسے ہی کہا وہ فوراً بولا۔

”اچھا ہے۔ اس کی تیمارداری کے لیے ایک اچھا ساتھی اس کے پاس ہوگا۔ جو اُسے ہر

پل حوصلہ دے گا کہ بازو اور ٹانگ ٹوٹ گئی تو کیا ہے۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ ہر پل۔

تیمور کو اپنی بیوی کی باتیں سن کر ہمت ملتی رہے گی۔“ آفتاب نے کہا اور اس کمرے سے باہر

نکل گیا۔ رضوان اپنی جگہ کھڑا رہا۔

☆=====☆=====☆

طارق نے بیل پر اپنی انگلی رکھ کر اُسے دبایا اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر

بعد نگہت کا دروازہ کھلتے ہی چہرہ نمودار ہوا۔

”جی....؟“ نگہت نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”ایاز سے ملنا ہے۔“ اس نے کہا۔

”وہ گھر نہیں ہے۔“ نگہت نے جواب دیا۔

”کہاں ہے؟“ طارق نے پوچھا۔

”پتہ نہیں بتا کر نہیں گیا۔ کل سے گیا ہوا ہے۔“ نگہت نے کہا۔

طارق نے نگہت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایسا آپ کو ایاز نے بولنے کے لیے کہا

ہے؟“

”وہ مجھے ایسا کیوں کہے گا۔ میں نے سچ بتایا ہے۔“ نگہت نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے

شک لہجے میں کہا۔

”دیکھیں میرا اس سے ملنا ضروری ہے۔ اُسے باہر بھیجیں۔“ طارق نے کہا۔

”میں نے کہا ناں کہ وہ کل سے گھر نہیں ہے۔ اپنا بیگ لے کر چلا گیا ہے۔ مجھے اتنا کہا

تھا کہ میں کہیں جا رہا ہوں۔“ نگہت نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ اس بار اس کے لہجے میں تغیر آ گیا

تھا۔ وہ طارق سے کچھ بگڑ کر بولی تھی۔

اس بار طارق کو اس کی بات کا یقین ہونے لگا تھا۔ پہلی بار طارق کے چہرے پر متانت آئی تھی۔ وہ بولا۔ ”آپ ان کی ماں ہیں؟“

”ہاں۔“ اس نے مختصر کہا۔

”پھر تو اس نے آپ کو بتایا ہوگا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔“ طارق نے کہا۔

”مجھے کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی میں یہ پوچھنے کے لیے مری جا رہی تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور یوں جا رہا ہے۔“ نگہت نے کہا۔ ”اس کی مرضی کہ وہ جہاں چاہے جائے۔“

”آپ اس کی سگی ماں ہیں؟“ طارق نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ایاز کا برتھ سرٹیفکیٹ نکال کواؤں؟“ نگہت نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور دروازہ ایک جھٹکے سے بند کر دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا ہے؟ یا میرے ساتھ کوئی چکر ہے؟“ طارق اس بارے میں سوچنے لگا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد طارق نے ایک بار پھر اپنا ایک لڑکا اس کے گھر بھیجا اور ایاز کا پوچھا۔ اُسے بھی وہی جواب ملا۔

”میں نے کہا تھا کہ مجھے دھوکہ مت دینا لیکن تم نے مجھے دھوکہ دے ہی دیا اور شہر سے بھاگ گئے۔ کہاں جاؤ گے۔ اب تمہارا حال اچھا نہیں ہوگا۔“ طارق نے اپنے آپ سے کہا اور پاس پڑے خالی ٹین کو اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ اڑتا ہوا دور جاگرا۔ اُس نے اپنی موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے اشارت کی اور اُسے اس رفتار سے لے گیا جیسے وہ کسی ریس میں حصہ لے رہا ہو۔ وہ بہت دیر تک شہر میں متلاشی نگاہوں سے گھومتا رہا۔ وہ ایاز کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ اُسے کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔

جب طارق اپنے دفتر میں پہنچا تو پہلے سے ہی ناصر کرسی پر اپنی ٹانگیں پھیلائے بیٹھا، اخبار پڑھ رہا تھا۔ طارق کو دیکھتے ہی اس نے اخبار ایک طرف رکھا اور بولا۔ ”آج صبح ہی کہاں چلے گئے تھے؟“

”یہ بتاؤ تم صبح صبح ادھر کیسے؟“ طارق نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں تو نہ دن کو چین ہے اور نہ رات کو، پاؤں میں چکر ہے۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔“

ناصر نے مسکرا کر کہا۔

”یہ چکر فضول نہیں ہوتا۔ اس چکر کے پیچھے کوئی مقصد ہوتا ہے۔“ طارق نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”مقصد سے ہی آتا جاتا آدمی اچھا لگتا ہے۔“ ناصر نے کہا۔

”بتاؤ تم کس مقصد سے آئے ہو؟“ طارق نے کہا۔

”تم تو جانتے ہی ہو کہ میں بات گھما پھیرا کر کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ ناصر نے کہا۔ ”تم سے پوچھنا تھا کہ تم نے اس دن نواز کو کار دی تھی۔ بھلا کیوں؟“

طارق اس کی بات سن کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان یوں پھیری جیسے جال میں آئی مچھلی کو دیکھ کر پھیرا خوش ہو جاتا ہے۔ اُس نے کہا۔ ”اگر تمہاری یہ عادت ہے تو کچھ میری بھی طبیعت گھما کر بات کرنے کے لیے کبھی مائل ہی نہیں ہوئی۔“ اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنے دائیں ہاتھ پر خارش کرنا شروع کر دی اور کہا۔ ”عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ سمجھ تو گئے ہو گئے تم۔“

ناصر نے اس کی ہتھیلی کی طرف دیکھ کر اپنا ایک ہاتھ اپنی قمیص کی سائیز والی جیب میں ڈال کر کہا۔ ”یہ بات ہے تو پھر اگلی بات کرتے ہیں۔ تمہاری کار لے کر وہ کہاں گئے تھے؟“

اس سوال کو سن کر طارق کا کھلی کرتا ہاتھ اسی جگہ رک گیا۔ کیونکہ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ پہلے سوال کے جواب میں جو اسے ملنے والا تھا، وہ شاید اُسے اب نہ ملتا۔ اس نے صاف کہہ دیا۔ ”یہ مجھے نہیں پتہ۔“

ناصر نے جب اپنی جیب سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ہزار نوٹوں والی ایک نئی گڈی تھی۔ جسے دیکھ کر طارق کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ ”موڈ میں ہوں۔ بتانے پر شاید ایک نوٹ بھی میری جیب میں واپس نہ جائے۔“

اس سوال کے جواب میں اتنا بڑا انعام؟ طارق کے جسم میں تو جیسے چیونٹیاں ریگنے لگی ہوں۔ وہ مضطرب ہو گیا۔ اس کی نگاہیں جیسے اُن نوٹوں پر جم کر رہ گئی ہوں لیکن اسے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔

”اگر ایک دو دن میں پتہ چلا لوں تو کیا یہ سارے نوٹ میرے ہو جائیں گے؟“ طارق نے طمع کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ناصر نے کچھ سوچا اور پھر کہا۔ ”یہ ابھی کی بات ہے۔ بعد میں بتانا ہے تو پھر تجھے انعام تو مل جائے گا لیکن اتنا نہیں۔“

”ابھی مجھے پتہ نہیں ہے، لیکن میں ایک دودن میں بتا دوں گا، لیکن پیسے مجھے اتنے ہی دینا۔“ طارق نے کہا۔

”تم پتہ کرو۔ میں انعام دوں گا لیکن اتنا نہیں۔ یہ صرف اب کی بات ہے۔“ ناصر نے کہا اور نوٹ اپنی جیب میں رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے طارق کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد طارق نے میز پر غصے سے ہاتھ مارا اور بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”کاش مجھے پتہ ہوتا کہ وہ کہاں ہیں اور ایاز کہاں ہے؟ آج ہی پتہ چلا کر رہوں گا۔“

ایاز اس سے بے خبر کہ طارق صبح سے ہی اس کی تلاش اور فکر میں ہے۔ وہ دو رہین اپنی آنکھوں سے لگائے اس مکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ابھی کچھ دیر قبل دیکھا تھا کہ ایک کارسوار جس کا وہ چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا، وہ اس مکان میں داخل ہوا ہے۔ وہ حماد تھا۔

حماد کے پاس چھوٹے پل کے آس پاس کی تصاویر تھیں۔ اُس نے جمال اور نواز کو ان تصاویر کی مدد سے سمجھایا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ کس جگہ سے کہاں تک جانا ہے۔ کس کو ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر کھڑا ہونا ہے، اور کہاں نظر رکھنی ہے۔ ”سردار اُس شخص کو لے کر نواز کے پاس جائے گی۔ نواز، جمال کو فون کرے گا اور پھر جمال مجھے فون کرے گا۔ میں لڑکی کو لے کر اس جگہ آؤں گا۔ اس جگہ جمال موجود ہوگا۔ لڑکی میں اس کے حوالے کر کے خود چلا جاؤں گا اور تم لوگ اُس سے پیسے لے کر لڑکی اس کے حوالے کر دو گے۔“

”کار کہاں سے لے کر آئے ہو؟“ نواز نے پوچھا۔

”یہ میرے دوست کی ہے۔“ حماد نے جواب دیا۔

سردار ایک طرف کھڑی تھی۔ جیسے ہی اُسے بولنے کا موقع ملا وہ بولی۔ ”میں ایک بات کہوں۔“

”ہاں کہو۔“ حماد نے اس کی طرف دیکھا۔

”جب ہم لڑکی اس کے حوالے کر دیں گے اور رقم لے لیں گے تو پھر ہم کیسے اور کہاں جائیں گے؟“ سردار نے پوچھا۔

”وہ جمال اور نواز کو پتہ ہے کہ انہوں نے کہاں جانا ہے۔“ حماد نے جواب دیا۔

”کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ رقم کا بیک میں لے کر اس جگہ پہنچ جاؤں۔ نواز اور جمال خالی ہاتھ اس جگہ سے جائیں۔ مجھے پولیس اتنی نہیں جانتی جتنی کہ ان دونوں سے ان کی شناسائی

ہے؟“ سردار نے اپنی بات کہہ کر ان تینوں کی طرف باری باری دیکھا اور کچھ توقف کے بعد پھر کہا۔ ”ہاتھ میں بیگ دیکھ کر اگر کسی پولیس والے نے ان کو دیکھ لیا تو وہ انہیں روک لیں گے اور بیگ کی تلاشی لینے پر کھیل بگڑ بھی سکتا ہے۔“

حماد نے اس کی بات سن کر نواز اور جمال کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ”اس کی بات میں دم تو ہے۔“

”اس وقت پولیس وہاں نہیں ہوتی۔“ جمال نے کہا۔

”نہ ہو۔“ سردار نے بلاتال کہا۔ ”لیکن ہمیں تو محتاط رہنا ہے ناں۔“

”اس علاقے کے تھانے میں دو دفعہ حاضری ہو چکی ہے۔“ نواز نے جمال کی طرف دیکھتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ جو صرف جمال ہی سمجھ سکا۔ اس بات نے جمال کو بھی اس بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ہمیں محتاط تو رہنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سردار ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تمہارے ہاتھ میں بیگ ہونا ہی مشکوک بات ہوگی۔“ حماد نے کہا۔

”تو پھر کیا کریں؟“ جمال نے پوچھا۔ وہ خود بھی اس کا حل سوچنے لگا تھا۔

”بیگ لے کر سردار اُس جگہ پہنچ جائے گی۔“ حماد نے کہا۔

”یہ پہنچ جائے گی؟“ جمال نے اس کی طرف شک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایسی بات ہے تو مجھے مت دو بیگ۔ میں نے تو بھلے کی بات کی تھی۔“ سردار نے لاپرواہی سے کہا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”بیگ سردار نے لے کر اس جگہ پہنچ جائے گی۔ یہی ٹھیک ہے۔“ نواز نے بھی اس بات کی تصدیق کی۔ جسے سن کر سردار کا دل خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ جو چاہتی تھی وہ ہو گیا تھا۔

جمال نے ایک بار پھر اس کی طرف بے یقینی کی نگاہوں سے دیکھا، اور بولا۔ ”اس کی جگہ تم بیگ کیوں نہیں لے جاتے؟“

سردار نے یہ سنا تو اُسے جھٹکا لگا۔ حماد نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں..... میں بیگ نہیں لے جا سکتا۔ مجھے کار بھی واپس کرنی ہے اور میرا وہاں نہ ہونا ہی بہتر ہے۔“ حماد نے کہہ کر جان چھڑالی۔ وہ کسی کی نگاہ میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

وہ پس پردہ رہ کر ہی پیسہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

جمال نے ڈھیلے پڑتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ ہم اس پر اعتماد کر لیتے ہیں۔“ سردار نے اطمینان کی سانس لی۔

”تم لڑکی کو کیسے لے کر آؤ گے۔ وہ بھی اکیلے؟“ نواز نے پوچھا۔  
 ”تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے سارا انتظام کیا ہوا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک شاپر بیگ سے برقعہ نکالا اور کہا۔ ”یہ برقعہ لڑکی پہنے گی۔ اس کے منہ پر ٹیپ لگی ہوگی اور چہرے پر نقاب ہوگا۔ کچھ گڑبڑ نہیں ہوگی۔“

”چلنے کی تیاری کریں۔“ اچانک سدرہ نے وقت دیکھ کر کہا۔

”ہاں۔ تم لوگ نکلو۔“ حماد نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تینوں جانے کی تیاری کرنے لگے۔ نواز نے جمال کے کان میں کچھ کہا اور اس کے بعد وہ سدرہ کو نازلی کے پاس لے گیا۔ سدرہ نے چوڑی ٹیپ اس کے منہ پر لگا دی۔ اس کا چہرہ چھپ سا گیا تھا۔

”تمہارا کام آسان کر دیا ہے۔ اُسے صرف برقعہ پہنا دینا۔“ نواز نے کہا۔ ”ٹیپ اتارنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ وہ شور مچائے گی اور کہانی خراب ہو جائے گی۔“  
 اس کمرے سے باہر نکل کر جمال نے آہستہ سے نواز سے کہا۔ ”بہتر نہیں ہے کہ تم لڑکی کو لے کر وہاں پہنچو۔“

”حماد نے جو منصوبہ بنایا ہے وہی اچھا ہے۔ ویسے بھی اس کے چہرے پر ٹیپ لگا دی ہے۔ بے فکر رہو۔“ نواز نے سرگوشی کی۔

اس مکان میں اُن چاروں افراد میں اگر ایک ہلچل سی تھی تو ایاز بھی کھڑکی کے سامنے لگا بار بار دور بین اپنی آنکھوں کو لگا کر اس طرف دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک اس کی نگاہ میں کوئی ایسی بات نہیں آئی تھی کہ جس سے وہ چونک جاتا۔ ایک تجسس اُسے اس کام پر مامور کئے ہوئے تھا۔

ایاز نے اس بار کھڑکی چھوڑ دی۔ آسمان پر اچانک گہرے بادل چھا گئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ یک دم اندھیرا سا ہو گیا تھا۔ ایاز نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ معاً اس کی سماعت سے منشی کی آواز نگرانی۔ وہ ملازم سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ پچاس ہزار روپے جب کمال دینے کے لیے آیا تھا تو میں کہاں تھا؟“

”وہ سویرے ہی آ گیا تھا۔ جب آپ زمینوں پر گئے تھے۔“ ملازم نے جواب دیا۔  
 ”زمینوں سے میں کب کا آیا ہوا ہوں۔ تم مجھے پیسے اب دے رہے ہو۔“ منشی نے ناراض ہو کر کہا۔

”بندہ بھول بھی تو جاتا ہے۔“ ملازم نے معصومیت سے کہا۔

”تمہاری یہ بھول حساب کتاب میں خرابی پیدا کر سکتی ہے۔ چلو جاؤ۔“ منشی نے کہا۔

ایاز نے اپنی گردن آگے کی طرف نکال کر اندر جھانکا۔ ملازم دوسرے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ منشی نے پہلے ایک بڑے رجسٹر میں لکھا، اس کے بعد اس نے چابیوں کا گچھا اٹھا کر ابھی سیف کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ وہ ملازم پھر بھاگتا ہوا اندر آ گیا اور اُس نے کہا کہ وہ جلدی آئے چوہدری صاحب کا فون ہے۔

منشی نے روپے کی گڈی اور چابیاں سرہانے کے نیچے رکھیں اور باہر نکل گیا۔ ایاز کمرے میں چلا گیا۔ پہلے اس نے پچاس ہزار روپے اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالے اور اس کے بعد اس نے چابیوں کا گچھا اٹھا کر جو منشی سیف کی طرف قدم بڑھائے باہر تیز تیز قدموں کے چلنے کی آواز آئی۔ کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ اس نے چابیاں سرہانے کے نیچے رکھیں اور خود بھاگ کر اسی دروازے سے باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ آنے والا منشی تھا۔ وہ بڑا بڑا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔ لگتا تھا کہ کوئی سخت بات ہوئی ہے یا پھر اُسے کوئی ایسا حکم ملا ہے جو اسے اس وقت پسند نہیں آیا۔ شاید بہت ہی مختصر بات ہوئی تھی۔

ایاز اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ سرہانے کے نیچے چابیاں تھیں، لیکن پچاس ہزار کے نوٹوں کی گڈی غائب تھی۔ وہ مزید پریشان ہو گیا۔ اس نے سارا بستر الٹ پلٹ کر دیا۔ کمرے میں ایک اودھم مچا گیا، ایک لمحے میں ملازم اس کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ جبکہ ایاز پھر اسی جگہ دور بین لگائے بیٹھا تھا۔

اس بار اُس نے دیکھا کہ دوسرا اور ایک عورت باہر نکلے ہیں۔ وہ پیدل ہی بڑی سڑک کی طرف چل پڑے ہیں۔ نواز کے چہرے پر دور بین لا کر ایاز نے غور سے دیکھا اور وہ پہچان گیا کہ، یہ شخص وہی ہے جو اکثر طارق کے پاس بھی بیٹھا ہوتا تھا۔ ایاز کی حیرانی میں دو چند اضافہ ہو گیا تھا۔

کار اُسی جگہ کھڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کار والا شخص اندر ہے اور پھر اُس نے سوچا کہ ملازم نے بتایا تھا کہ اس مکان میں دو مرد اور دو خواتین آئی ہیں۔ ایک تو چلی گئی، ایک ابھی اندر ہے۔

”یہ چکر کیا ہے۔ مجھے دیکھنا ہوگا۔“ ایاز نے کہا اور معنی خیز انداز میں اپنی گردن ہلائی۔ اس کے کمرے سے باہر ایک شور برپا تھا۔ منشی چیخ رہا تھا۔ ایاز بھی اس کے پاس چلا گیا۔

”کیا ہوا ہے؟“ ایاز نے انجان سا بن کر پوچھا۔

”ایک لمحے میں کمرے سے پچاس ہزار روپے غائب ہو گئے ہیں۔ ابھی رکھے اور ابھی باہر قدم نکال کر اندر کیا، پیسہ گم۔“ منشی نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔



”میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ میری تلاشی لینی ہے تو لے لیجئے۔“ ایاز نے کہا۔ پچاس ہزار روپے کی گڈی اس کی جیکٹ کی اندروالی جیب میں تھی۔

”کیا بات کرتے ہو جناب۔ ہم آپ کی تلاشی لیں گے۔ ہم آپ پر شک کریں گے۔“ منشی نے جلدی سے کہا۔

”نہیں.... شک نکال لینا آپ کا فرض ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”آپ جانا چاہیں تو جائیں، اس طرح شرمندہ نہ کریں۔“ منشی نے کہا اور ایاز بڑے سکون سے باہر نکل گیا۔ بادل اور بھی گہرے ہو گئے تھے۔ بارش کی آمد آدھی۔ ایاز کو یہ موسم اور بھی خوبصورت لگنے لگا تھا۔

☆=====☆=====☆

ہاتھ میں سیاہ بیک پکڑے جیسے ہی اپنے گھر سے پیدل نکل کر تیمور ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھا اور ابھی اُس نے ایک ٹیکسی کی طرف اشارہ کیا ہی تھا کہ اُسے لگا جیسے کسی نے اس کے کندھے پر ہولے سے ہاتھ مارا ہے۔ کوئی اس کے عقب میں کھڑا ہے۔ تیمور نے اُسی لمحے اپنی گردن گھمائی اور پیچھے دیکھا۔ جیسے ہی اس کی نگاہ اپنے پیچھے کھڑے آدمی پر پڑی ایک لمحے کے لیے تو وہ چونکا۔ پھر اُس نے اپنی آنکھوں سے سیاہ چشمہ اتار کر اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

”آفتاب خان.... تم آگئے؟“

”تمہاری یادداشت اچھی ہے کہ پہلی نظر میں ہی تم نے مجھے پہچان لیا۔ اس سے مجھے لگتا ہے کہ تمہیں میرے الفاظ بھی یاد ہوں گے۔“ آفتاب نے سرد مہری سے کہا۔

”سب یاد ہے۔“ وہ بولا۔

”میں آگیا ہوں تیمور.... اب اپنا وعدہ پورا کروں گا۔“ آفتاب نے کہا۔ ”اپنا وعدہ پورا کروں گا یا ایک بار پھر کوئی زخم تمہارے ہاتھوں لے کر اس شہر سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔“

تیمور نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اپنے دل کا شوق ابھی پورا کرو گے؟“

”میں نے آج تک چھپ کر وار نہیں کیا۔ تمہارے گھر کے سامنے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تم مل گئے۔ تمہیں بتا دیا ہے۔ تم تیاری رکھو۔ اگلی ملاقات میں ہم دونوں میں ایک نہیں ہوگا۔“ آفتاب خان نے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں وہی انتقام، نفرت، زہر اور تپش تھی جو چند سال قبل کالج کی اس گراؤنڈ میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔

”میں تیار رہوں گا۔“ تیمور نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

آفتاب نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس جگہ سے چلا گیا۔ تیمور کچھ دیر تک اسی جگہ کھڑا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آفتاب اپنی زبان کا پکا ہے۔ وہ لڑکرا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ مجبور ہو جائے گا جب وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے گا۔

تیمور چھوٹے پل کے پاس رکشے سے پہنچا تھا۔ اس وقت بازار میں کافی رش تھا۔ چلتے ہوئے ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا ٹکراتے رہا تھا۔ تیمور نے سوچا کہ اس رش کی وجہ سے اُسے یہاں بلایا گیا ہے۔ تاکہ کسی کی بھی توجہ ان پر نہ جائے۔ اپنے سیاہ چشمے سے تلاشی لگا ہوں سے وہ دیکھ رہا تھا کہ کون ہے جو اسے اشارے سے اپنے پاس بلائے۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھا گئے تھے۔ ہوا میں تیزی آگئی تھی۔ مٹی اُڑنے لگی تھی۔ تیمور لیٹر بکس کے پاس جا کر رک گیا۔

اُس سے کچھ ہی فاصلے پر نواز ایک طرف کھڑا ایک دکاندار سے مچھلی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ترجمہ نگاہوں سے دیکھ لیا تھا کہ تیمور اس جگہ آ کر رک گیا ہے۔ نواز اس دکان سے اگلی دکان پر ہو گیا۔ اس کے بائیں جانب سدرہ بظاہر مچھلی دیکھ رہی تھی لیکن اس کی نگاہیں نواز پر مرکوز تھیں۔ نواز نے اُسے اشارہ کیا کہ وہ تیمور کے پاس جائے۔ ان سے کافی فاصلے پر پل کے اوپر جہاں اور بہت سے لوگ کھڑے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے، اُن میں جمال کھڑا تھا۔ اس کی نگاہوں میں نواز اور سدرہ تھے۔

سدرہ کو کچھ دیر ابھی اور رکنا تھا۔ تاکہ جمال ارد گرد کا جائزہ لے کر تسلی کر کے کہ کوئی مشکوک شخص یا بغیر وردی کے پولیس والے تو نہیں متحرک ہیں۔ اس کے بعد اشارہ پاتے ہی سدرہ نے تیمور کے پاس جانا تھا۔

جہاں وہ تینوں تیمور کے ارد گرد تھے۔ وہاں ایاز اُڑتی مٹی اور تیز ہواؤں میں اس مکان سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ دور تک مٹی اُڑتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون آ رہا ہے، کون جا رہا ہے۔ اوپر سے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔

اس مکان کے اندر حماد بے چینی سے ان کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی گھڑی پر وقت دیکھ رہا تھا۔ اندر نازلی کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور اس کے منہ پر ٹیپ لگائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی نگاہوں سے گردن گھما کر محض دیکھ رہی تھی۔ باہر کسی کے بولنے کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ گاؤں کی کھلی فضا کی آندھی، شہر کی گنجان آباد سے کہیں زیادہ لگ رہی تھی۔ اس کی ہواؤں کی آوازیں بھی عجیب اور خوفناک تھیں۔

اچانک حماد کے دل میں خیال آیا کہ انہوں نے اس سے اغوا کا منصوبہ بھی بنوایا، اس کی ہدایت پر غل بھی کر رہے ہیں لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ لڑکی کس کی ہے اور کون ہے، جسے انہوں نے اغوا کیا ہے۔

حماد کو اس سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے یہ سب پیسے کے لیے ہی کیا تھا۔ کیوں کہ وہ نوکری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنا ذاتی کاروبار کرنے کا خواہش مند تھا۔ قطرہ قطرہ محنت سے جمع کر کے کچھ کرنے کی بجائے، اس نے شارٹ کٹ پر چلنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اسی لئے وہ ان سے جا ملتا تھا۔

حماد اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے کا تھوڑا سا دروازہ کھول کر دیکھا، لڑکی اندر بندھی ہوئی تھی۔ منہ پر ٹیپ تھی۔ اس لئے وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ حماد نے اس سے اپنی نگاہیں ہٹا لیں اور جیسے ہی وہ دروازے سے ہٹنے لگا، وہ چونکا۔ اُس نے ایک بار پھر اپنی نگاہیں لڑکی پر مرکوز کر دیں۔ لڑکی کی دائیں آنکھ کے پاس ایک زخم کا نشان تھا، جو کہ اس کی پہچان بن چکا تھا۔ اُسے دیکھ کر حماد چونکا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا، ایک عجیب سی بے چینی اس کے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت دوڑنے لگی تھی۔

حماد نے دروازے سے ایک طرف ہٹ کر مضطربانہ انداز میں کچھ سوچا۔ شک اور اندیشہ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنے منہ پر کپڑا لپیٹا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ نازی اُسے دیکھتے ہی ڈر گئی۔ اس کے جسم میں حرکت پیدا ہو گئی۔ حماد نے اس کے پاس جا کر اس کے ماتھے پر زخم کا نشان ایک بار پھر دیکھا اور ایک جھٹکے سے ٹیپ اس کے منہ سے اتار دی۔ نازی کا چہرہ واضح ہوتے ہی حماد کانپ کر رہ گیا۔ اس کی خیرہ نگاہیں نازی کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ اس لڑکی سے لاعلم تھا، لیکن اب واضح ہو گیا تھا۔

”او خدا یا یہ کیا ہو گیا۔“ حماد نے اپنے دل میں کہا۔ ”یہ لوگ اسے اغوا کر کے لائے ہیں۔ اس کی فیملی سے اس کا تاوان مانگا جا رہا ہے۔ او خدا یا۔“

نازی اس کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھے جا رہی تھی۔ حماد نے اسی لمحے فیصلہ کیا، کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ کچھ بھی ہے۔ وہ کم از کم اس گھر کو لوٹ نہیں سکتا۔ اُس نے جلدی سے نازی کے ہاتھ پاؤں کھولے اور اپنی آواز میں تبدیلی کر کے کہا۔ ”بھاگ جاؤ۔ یہاں سے سیدھی اپنے گھر چلی جاؤ اور فوراً اپنے گھر اطلاع کر دو کہ تم آزاد ہو گئی ہو۔ ابھی چلی جاؤ۔“

پھر حماد نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور سوچنے لگا کہ وہ اس کا رابطہ کیسے اس کے گھر والوں سے کرائے۔ اس سے پہلے کہ جمال کی کال اسے آئے، لڑکی کے گھر والوں کو اس کے

آزاد ہونے کی خبر چلی جانی چاہیے۔

اس مکان میں کوئی اور موبائل فون نہیں تھا۔ اپنے نمبر سے وہ رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جیب سے کچھ پیسے نکالے اور حیران پریشان نازی کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ ”بھاگ جاؤ۔۔۔ ابھی بھاگ جاؤ۔“

نازی نے وہ پیسے اپنی مٹھی میں لئے اور اس مکان سے باہر نکل گئی۔ حماد نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور غصے دانت پیسے۔ پھر اُس نے اپنا سرائینو کی بنی دیوار پر دے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ خون بہنے لگا۔ حماد نے فوراً زخم پر کپڑا رکھ لیا۔ کچھتاوہ اس کے سینے میں کانٹے بن کر اُسے تکلیف دینے لگا تھا۔

نازی نے باہر نکلتے ہی دیکھا کہ وہ کس طرف جائے۔ تیز ہوا اور اڑتی مٹی سے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کے قدم خود بخود اینٹوں کی بنی سڑک کی طرف اٹھ گئے۔ درخت کے نیچے کھڑے ایاز کو لگا کہ اس مکان سے کوئی باہر نکلا ہے۔ وہ چونک کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنی نگاہیں اس طرف مبذول کر دیں۔

جیسے ہی نازی سڑک پر تیز تیز چلنے لگی۔ ایاز نے بھی اپنے قدم اس کے پیچھے بڑھا دیئے۔ نازی کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مٹی اس کی آنکھوں میں جا رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی آنکھیں بند کر کے کھول رہی تھی۔ اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ ایاز اس کے پیچھے ہے اور ایاز اس بات سے لاعلم تھا کہ اس کے آگے جانے والی لڑکی کوئی اور نہیں نازی ہے۔

تھوڑی دیر وہ اسی طرح چلتے رہے۔ ہوا میں اور بھی تیزی آگئی تھی۔ نازی تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی، لیکن تیز ہوا اور مٹی اس کے آگے بڑھنے میں مانع ثابت ہو رہی تھی۔

ایاز اس سے ایک فٹ کے فاصلے پر تھا کہ جب مٹی کی دھند سے ایک ٹرائی نکلی اور اس سے پہلے کہ نازی اس سے جا نکلے، ڈرائیور نے ٹرائی کا اسٹیرنگ یک دم گھمادیا اور ایاز نے اُسی لمحے نازی کا بازو پکڑ کر ایک طرف کھینچ لیا۔ جونہی دونوں سنبھلے، ایک ساتھ ان کی آنکھیں چار ہوئیں، وہ چونک پڑے۔

”تم نازی یہاں؟“ ایاز نے حیرت سے پوچھا۔

”تم۔۔۔ تم۔۔۔“ نازی کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ ٹرائی مزید گرد اڑاتی آگے چلی گئی تھی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ ایاز نے پوچھا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نازی یوں اچانک اس طرح سے اُسے مل جائے گی۔ جب کہ نازی کے دل میں یہ شک اور

پختہ ہو گیا تھا کہ اغوا کرنے والوں میں ایاز بھی شامل ہے۔ اگر اُسے اُس نامعلوم شخص نے آزاد کرایا ہے تو ایاز اُسے پھر سے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے ہے۔ یا پھر یہ ان کی کوئی چال ہے۔

”تم نے مجھے اغوا کیا ہے... تم نے....“ نازی نے اس کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اغوا!...؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں تو یہاں اپنے چچا کے پاس آیا تھا۔“ ایاز نے چونک کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ نازی کو کسی نے اغوا کر کے اس مکان میں رکھا تھا لیکن یہ اس مکان سے باہر کیسے آئی؟ اور وہ کون لوگ ہیں؟

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے ہی مجھے اغوا کیا تھا۔“ نازی نے کہا اور ایک طرف دوڑ پڑی۔ تیز ہواؤں اور گرد و غبار میں بارش کے چھینٹے گرنے لگے تھے۔ ایاز بھی اس کے پیچھے بھاگا اور ایک بار پھر اس کا بازو پکڑ کر بولا۔

”تم مجھ سے جیسی بھی قسم لے لو میں نے ایسی حرکت نہیں کی۔ تم مجھے اچانک ملی ہو۔ اُس طرف میرے چچا کی حویلی ہے۔ چاہو تو کسی سے بھی میرے چچا کے بارے میں پوچھ لو۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

نازی اس کی طرف دیکھنے لگی۔ بارش کے قطرے اور بڑھ گئے تھے۔ نازی نے کہا۔

”میں کیسے یقین کر لوں تم پر؟ تم پہلے بھی میرا یقین توڑ چکے ہو۔“

”اس بارے میں بھی بات ہو جائے گی۔ دیکھو اگر تم نے یہاں کوئی شور وغیرہ کیا تو گاؤں کے لوگ جمع ہو جائیں گے اور یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ تم مجھ پر یقین کرو۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ وہ سامنے میرے چچا کی حویلی ہے۔ چاہو تو تم میرا وہاں سے پوچھ لو۔ پھر بھی اگر یقین نہیں ہے تو تم چلی جاؤ۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“ ایاز نے کہا۔ پتے پھینکنا اُسے آتے تھے۔

نازی نے سوچا کہ کیا ایاز سچ کہہ رہا ہے۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ جس نے اُسے آزاد کیا تھا، اُس نے کہا تھا کہ اپنے گھر والوں کو فوراً اطلاع کر دے۔ نازی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

”مجھے تمہارا موبائل فون چاہئے۔“

ایاز اس کے دل میں اپنا اعتماد بٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے فوراً بغیر پوچھے اپنا موبائل اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس بات نے نازی کے دل میں اس کی بد اعتمادی میں کچھ کمی کی۔ اُس نے جلدی سے تیمور کا نمبر ملایا اور موبائل فون کان سے لگا لیا۔ نیل جا رہی تھی۔ ایاز اس کی طرف

دیکھتے ہوئے تانا بانا جوڑتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ سونے کی چڑیا اب اس کے ہاتھ میں پھر سے آگئی ہے۔ اگر وہ ایک کے چنگل سے چھوٹی ہے تو اس کے شکنجے سے نہیں جائے گی۔ وہ ٹوٹے ہوئے اعتماد کے کالج کے ایک ایک ٹکڑے کو پھر سے اس طرح جوڑ دے گا کہ کوئی رخنہ نہیں رہے گا۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھا۔

☆=====☆=====☆

تیمور اُسی جگہ کھڑا تھا۔

جمال نے جب اچھی طرح سے تسلی کر لی کہ وہ اکیلا ہی آیا ہے تو اُس نے سدرہ کو اشارہ کیا۔ سدرہ ایک جگہ تجھلی کا بھاؤ تاؤ کر رہی تھی۔ اس کی نظریں غیر محسوس انداز میں مسلسل جمال کی طرف اٹھ بھی رہی تھیں۔ اشارہ ملتے ہی اُس نے وہ دکان چھوڑ دی اور تیمور کی طرف چل پڑی۔ جیسے ہی وہ تیمور کے پاس پہنچی، اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا رومال نیچے گرا دیا۔ رومال کو اٹھانے کے لیے وہ نیچے جھکی اور جیسے ہی وہ اٹھی اُس نے تیمور سے کہا۔

”میرے پیچھے آ جاؤ۔“

اس کی بات سن کر تیمور چونکا۔ سدرہ آگے چل پڑی تھی۔ تیمور بھی اس کے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ آگے جا کر دونوں ایک ساتھ چلنے لگے تھے۔ بارش کے قطرے آسمان سے اترنے لگے تھے۔ اچانک تیمور کا موبائل بج اٹھا۔ تیمور نے موبائل واٹریشن پر لگایا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس کی جیب میں ہلچل ہوئی اس نے دانستہ اپنے قدم آہستہ کر لئے تھے۔ وہ سدرہ سے کچھ پیچھے ہو گیا تھا۔ تیمور نے موبائل نکال کر کہا۔ ”ہیلو۔“

”بھائی میں نازی بول رہی ہوں۔ میں ان کے چنگل سے آزاد ہو گئی ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟“ نازی کی تیز آواز آئی۔

”کہاں ہو اس وقت؟“ تیمور نے آہستہ سے پوچھا۔ وہ نازی کی آواز سن کر چونکا تھا۔ سدرہ اپنے دھیان میں چلی جا رہی تھی۔ وہ تو یہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس سے بیک کس طرح حاصل کر کے رو پکڑ ہو سکے۔ جمال اور نواز کو وہ دھوکہ دینا چاہتی تھی۔ اُسے یہ تو پتہ تھا کہ تیمور اس کے ساتھ ہے۔ وہ کسی سے موبائل فون پر بات بھی کر رہا ہے۔ اس سے وہ لاعلم تھی۔ جبکہ جھوٹے پل پر کھڑا جمال دیکھ رہا تھا کہ تیمور کسی سے بات کر رہا ہے۔ وہ یک دم چونکا ہو گیا تھا۔ اُسے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ جمال نے نواز کی طرف دیکھا، نواز بھی تیمور کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

نازی کی آواز آئی۔ ”یہ کوئی گاؤں ہے۔“

”کیا نام ہے اس گاؤں کا؟“ تیمور نے پوچھا۔ اس کے قدموں کی چائل اور دھیمی ہو گئی تھی۔ سدرہ اپنی چال چل رہی تھی۔

”میں....“ نازی ایاز کے بارے میں بتانا چاہتی ہی تھی کہ ایاز نے ہاتھ جوڑ کر اُسے روک دیا۔ نازی نے اس کا نام بتانے کی بجائے کہا۔ ”یہ اسی گاؤں میں رہتے ہیں اور میں ان کے پاس خیریت سے ہوں۔ آپ ان سے بات کر لیں۔ یہ آپ کو اس گاؤں کا پتہ بتاتے ہیں۔“ نازی نے موبائل فون ایاز کی طرف بڑھا دیا۔ نازی کے پاس شاید اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ تیمور کو ایسا کہتی۔ ایاز نے کمال ہوشیاری سے موبائل فون کو ہاتھ سے ایسے چھوڑ دیا جیسے وہ گر گیا ہو۔ موبائل نیچے گرتے ہی کھل کر بکھر گیا۔ رابطہ ٹوٹ گیا۔ تیمور کو یہ تسلی ہو گئی تھی کہ نازی وہاں سے آزاد ہو گئی ہے۔

تیمور نے اسی نمبر پر دوبارہ ڈائل کیا۔ موبائل بند تھا۔ تیمور نے موبائل جیب میں ڈال لیا اور سوچا کہ نازی کا فرار یا تو ان کے علم میں نہیں ہے اور اگر ان کی موجودی میں وہ فرار ہوئی ہے تو یہ اس کی لاعلمی کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ تیمور کو اب یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ آزاد ہو گئی ہے اور کسی کے پاس خیریت سے ہے۔ مزید بات شاید اس لئے نہیں ہو سکی کہ ہو سکتا ہے موبائل کی بیٹری ختم ہو گئی ہو۔

بارش شروع ہو گئی تھی۔ دکانداروں میں ایک ہلچل برپا ہو گئی تھی۔ ہر کوئی اپنی اپنی دکان سمیٹنے لگا تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی۔

جمال اور نواز ایک دوسرے کے پاس ہو گئے تھے۔ دونوں کا خیال تھا کہ تیمور کے ساتھ کچھ لوگ ہیں۔ جن سے اس نے رابطہ کیا ہے۔ جمال نے اسی وقت حماد کو فون لگایا۔ حماد نے فون اٹھا کر کراہتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو۔“

”مجھے لگتا ہے کہ تیمور اکیلا نہیں آیا۔“ جمال نے کہا۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ حماد نے پوچھا۔ اس کی آواز میں لاغری تھی۔

”اُس نے ابھی کسی سے فون پر بات کی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ایک بری خبر ہے۔ میں اس وقت زخمی ہوں۔ کچھ لوگ آئے تھے۔ انہوں نے مجھے مارا اور لڑکی کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“ حماد اپنی آواز میں تکلیف پیدا کرتے ہوئے بولا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ جمال اس کی بات سن کر چیخا۔ اُسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ اس وقت کہاں کھڑا ہے۔ اس کی دھاڑ سن کر نواز بھی چونکا۔ اس کے آس پاس سے گزرنے والے لوگوں نے بھی ایک بار اس کی طرف دیکھا ضرور تھا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ حماد نے کہا۔ ”ایسا ہو گیا ہے۔“  
”یہ کیسے ہو گیا۔ کون لوگ تھے وہ؟“ جمال مضطرب ہو گیا تھا۔  
”میں انہیں نہیں جانتا۔“ حماد نے کہا۔

جمال نے فون بند کر دیا۔ اس کی نگاہ تیمور اور سدرہ کی طرف گئی۔ دونوں اسی پل کی طرف آرہے تھے۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ دونوں اسی جگہ کھڑے بارش کے پانی میں شرابور ہو گئے تھے۔ انہیں سردی کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔ جمال نے ساری بات نواز کے گوش گزار دی۔

”اب یہاں سے نکلو۔ میرا خیال ہے کہ لڑکی کے وہاں سے چلے جانے کی خبر اسے مل گئی ہے۔ یہ یہاں تک اکیلا ہی آیا ہے۔ اب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ نواز اس کا بازو پکڑ کر پل کے نیچے کی طرف لے گیا۔ جہاں بارش سے بچنے کے لیے بہت سے لوگ جمع تھے۔  
”سدرہ کا کیا ہوگا۔“ جمال نے پوچھا۔

”بھاڑ میں جائے وہ۔ ابھی کچھ دیکھتے ہیں اور پھر یہاں سے نکلتے ہیں۔“ نواز نے کہا۔ اب وہ اس جگہ تھے جہاں سے وہ تیمور اور سدرہ کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس کا دماغ یہ سوچ رہا تھا کہ کون لوگ اسے لے گئے ہیں۔ کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ انہوں نے لڑکی کو اس جگہ رکھا ہے۔

تیمور نے اپنے قدم تیزی سے آگے بڑھائے اور سدرہ سے پوچھا۔ ”تمہارے ساتھ یہاں اور کون کون ہے؟“

”تم چپ رہو۔“ سدرہ نے کرخت لہجے میں چلتے ہوئے جواب دیا۔ بارش سے اسے سردی لگنے لگی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل جوش اس جگہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ یک دم معدوم ہو گیا تھا۔ لوگ کسی نہ کسی سائے کے نیچے کھڑے ہو گئے تھے تاکہ بارش میں بھیگ جانے سے بچ سکیں۔ تیمور نے سدرہ کا بازو پکڑا اور اُسے کھینچ کر ایک بند دکان کے چھجے کے نیچے لے گیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر کسی محفوظ جگہ پر لوگ کھڑے تھے۔

”یہ کیا بد تیزی ہے؟“ سدرہ نے اُسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نشانے میں ہو۔ گولی تمہاری کھوپڑی اڑا سکتی ہے۔“

”بتاؤ تمہارے ساتھ یہاں کون کون ہے۔“ تیمور نے درشت لہجے میں پوچھا۔ اُس نے اس کی دھمکی کی کوئی پرواہ نہیں کی تھی۔ اس نے اپنی آواز نیچی ہی رکھی تھی اور پھر بارش کا بھی شور تھا۔

سدرہ نے اس کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ ”اس وقت تمہاری بہن کی زندگی خطرے میں ہے۔“ اس کے بعد سدرہ نے اپنی نظریں گھمائیں۔ جمال اور نواز نہ جانے کہاں تھے۔ جہاں وہ کھڑے تھے اس کے ساتھ ہی ایک راستہ نکلتا تھا۔ وہ بولی۔ ”یہ بیگ میرے حوالے کر دو اور میرے پیچھے چلو۔“

تیور نے اپنی جیکٹ ذرا سی ایک طرف سے ہٹا کر اپنا ریوالور اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ”میں مرنے اور مارنے کے لیے آیا ہوں۔ اس لئے کوئی ایسی حرکت مت کرنا۔ چپ چاپ میرے سوالوں کا جواب دو۔ ورنہ تم اس زمین پر بے جان پڑی ہوگی۔“ تیور نے اس انداز میں کہا تھا کہ سدرہ کے جسم میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ وہ تہی دست تھی۔ اس کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ تیور نے اس راستے کی طرف دیکھا۔ وہ راستہ بالکل اس کی مخالف سمت میں تھا جہاں اُسے جانا تھا۔

”تم مجھے کس طرف لے جانا چاہتی تھی۔“ تیور نے پوچھا۔

”اس طرف۔“ سدرہ یک دم ڈھیلی سی ہو گئی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے وہ اس کی گرفت میں آ گئی ہے۔ اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں جنہوں نے جمال اور نواز کو بھی شاید پکڑ لیا ہے۔ کیونکہ وہ دونوں ہی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ منصوبے کے مطابق نواز کو اس کے ساتھ ہی کچھ فاصلہ رکھ کر چلنا تھا۔ اس کا نہ ہونا اس بات کی تصدیق تھی کہ وہ پکڑا گیا ہے۔ یا پھر بھٹک لگنے سے وہ بھاگ گیا ہے۔

تیور اسے اس راستے کی طرف لے گیا۔ وہ کچا راستہ تھا۔ بارش کی وجہ سے وہ اور بھی خستہ حال ہو گیا تھا۔ وہ جہاں بھی قدم رکھتے تھے، جگہ نرم ہونے کی وجہ سے پاؤں اندر دھنس جاتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک پتلی اور ٹوٹی پھوٹی سڑک پر آ گئے تھے۔ جہاں سے محض چھوٹی موٹی ٹریفک ہی گزرتی تھی۔ ایک جگہ پانی کھڑا تھا۔ تیور نے اپنے کپڑوں میں لت پت جوتے اس میں گھمائے اور مٹی صاف کرنے کے بعد سڑک پر آ گیا۔ اس نے نازی کا بازو ایک ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا۔

”تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ جانتے ہو اس طرح کیا ہو سکتا ہے۔ تمہاری بہن زندگی سے جاسکتی ہے۔“ سدرہ نے چلتے ہوئے کہا۔ وہ گردن گھما کر کر پیچھے اور دائیں بائیں بھی دیکھ رہی تھی کہ شاید اُسے نواز اور جمال میں سے کوئی دکھائی دے دے۔ خوف اس کی آنکھوں اور چہرے سے مترشح ہونے لگا تھا۔

”وہ بھی میں دیکھ لوں گا۔“ تیور نے لاپرواہی سے کہا۔ سامنے ٹکڑ میں ایک رکشہ کھڑا

تھا۔ تیور نے اُسے ایک بار پھر خبردار کیا کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے اس کی جان چلی جائے۔ وہ اسے رکشے میں لے کر بیٹھ گیا۔

رکشہ اس جگہ سے کچھ ہی دور ایک پانچ منزلہ پلازے کے پاس لے آیا۔ اس پلازے کی تیسری منزل پر بھی تیور کا ایک آفس تھا۔ رکشے سے اترتے ہی تیور نے اس سے کہا، کہ وہ اس سے آگے چلے اور سیدھی سامنے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اگر بھاگنے کی کوشش کی تو وہ اسے گولی مارنے میں کسی تردد سے کام نہیں لے گا۔ دونوں پلازے کے اندر چلے گئے۔ سدرہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ کیونکہ وہ اندر سے بہت ڈری ہوئی تھی۔ وہ سامنے سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل پر چلے گئے تھے۔ وہاں سے وہ لفٹ میں سوار ہو کر آخری منزل پر چلے گئے۔ اس جگہ سے سیڑھیاں چڑھ کر تیور اسے چھت پر لے گیا۔ سدرہ جو سارے راستے بھاگ جانے کے بارے میں سوچتی رہی تھی، اس کے اندر ہمت ہی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ بھاگ سکے۔ ”اب بتاؤ کہاں رکھا ہے میری بہن کو اور کون لوگ ہیں تمہارے ساتھ۔“ تیور نے ریوالور نکال کر اس پر تان لیا۔ ریوالور پر چڑھا ہوا سائیکلسر دیکھ کر سدرہ اور بھی گھبرا گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ یہ شخص پوری تیاری سے آیا ہے۔ اگر اس نے گولی چلائی تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا، یہ اپنا کام کر کے اطمینان سے نیچے چلا جائے گا اور اس کی لاش اس جگہ پڑی رہ جائے گی۔ بارش تیز ہو رہی تھی۔

سدرہ نے تھوک نکل کر کہا۔ ”میں نے بتایا تو مجھے کیا ملے گا؟“

”تجھے آزاد کر دوں گا۔“ تیور نے کہا۔

”نہیں..... کچھ پیسہ بھی ملے گا؟“ سدرہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔ وہ بھی دے دوں گا لیکن مجھے جو بھی بتانا چاہتا ہے۔“ تیور نے کہا۔

”اس گاؤں کا نام نور پور ہے۔ اینٹوں کی بنی سڑک کے ساتھ بنے مکان کی پہچان یہ ہے کہ اس کی ایک دیوار پر سرخ سفیدی کی ہوئی ہے۔“ سدرہ نے گھبرا کر بتایا۔ اس کی نگاہ مسلسل ریوالور پر تھی۔ ”تمہاری بہن اس مکان میں ہے۔“

”تمہارے ساتھ کون کون ہیں۔“ تیور نے پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سدرہ کی طرف قدم بڑھائے اور سدرہ ڈرتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگی۔

”مم..... میرا خیال ہے کہ وہ سکندر کے آدمی ہیں۔ جمال اور نواز نام ہے ان کا۔“ سدرہ نے بتایا۔ وہ پیچھے چھوٹی دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔ جس کے پار نیچے سڑک تھی۔

سکندر کا نام سن کر تیور نے اپنے ہونٹ بھیجنے لئے تھے۔ ”ٹھیک ہے۔ اب تم جانے کی

تیار کرو۔“

”کک... کیا مطلب... تم نے مجھے آزاد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔“ سدرہ گھبرا گئی۔ ”میں اس منصوبے کا حصہ نہیں ہوں۔ مجھے تو کچھ پیسوں کے عوض انہوں نے شامل کیا تھا۔“

”جو تم نے جرم کیا ہے۔ اس کی سزا تو ملنی چاہیے۔ تمہیں بھی پتہ چلے کہ جس راہ پر تم چلتی رہی ہو اس کا انجام کیا ہے۔“ تیمور نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ریوالور سے گولی نکلی جو سیدھی اس کے ماتھے پر جا گئی۔ وہ تڑپا اور ایک جھٹکے سے اس جھوٹی دیوار کے پار جا گری۔

سدرہ بلندی سے نیچے آ رہی تھی۔ عین اس وقت آفتاب کی جیب اس جگہ رکی اور ٹھیک اسی وقت سدرہ سیدھی اوپر سے نیچے اس کی جیب کے بونٹ پر ایک دھماکے سے آ گری۔ ہر نظر اس طرف مبذول ہو گئی، جاتا قدم رک گیا۔ آفتاب یک دم جیب سے باہر نکل آیا۔ اُس نے پہلے لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر اوپر دیکھنے کے بعد دو سپاہیوں کو اسی جگہ رکنے کا کہہ کر دو سپاہی ساتھ لئے اور پلازے کے اندر چلا گیا۔ بارش اتنی تیز تھی کہ اسی دوران اس کے کپڑے بھی شرابور ہو گئے تھے۔

ایک سپاہی کو لفٹ کے پاس رکنے کا اشارہ کر کے آفتاب خود تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اُس کی ہر آتے جاتے پر نگاہ تھی۔ پلازے کے اندر موجود کسی شخص کو یہ خبر نہیں تھی کہ اس پلازے کی چھت سے ایک عورت کو گولی مار کر نیچے پھینک دیا گیا ہے۔ ہر منزل پر پہنچ کر آفتاب لفٹ کی طرف بھی دیکھتا تھا کہ اس سے باہر کون آ رہا ہے۔ جونہی وہ چوتھی منزل پر پہنچا، تیمور پانچویں منزل کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا ہی تھا کہ اس کی طرف دیکھ کر آفتاب رک گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے؟ تم یہاں؟“ تیمور نے پوچھا۔

آفتاب اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اس کا جائزہ لیا۔ بھیکے کپڑوں کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ”اوپر چھت سے نیچے آ رہے ہو؟“

تیمور نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“ آفتاب نے سرد مہری سے کہا۔

”تمہیں جواب دینے کا میں پابند نہیں ہوں۔ میں جہاں سے مرضی آؤں۔ تمہیں اس سے کیا۔“ تیمور نے کہا۔

آفتاب نے اپنی جیب سے اپنا کارڈ نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے کیا۔ جس پر اس کا حکمہ اور عہدہ لکھا ہوا تھا۔ تیمور کو پہلی بار پتہ چلا کہ وہ پولیس میں ہے۔ وہ وردی میں ہوتا تو شاید اس کی ضرورت نہ پڑتی۔

”اوہ..... تم پولیس میں چلے گئے ہو۔“ تیمور نے کہا۔

”تم اوپر چھت پر کیا کر رہے تھے؟“ آفتاب نے پوچھا۔

”تمہیں کس نے کہا کہ میں اوپر چھت پر تھا۔“ تیمور نے کہا۔

”ابھی ایک لڑکی کے سر پر گولی مار کر اسے نیچے گرا دیا گیا ہے۔“ آفتاب نے کہا۔

تیمور نے کہا۔ ”لڑکی کو نیچے گرا دیا گیا ہے؟ کس نے؟“

”زیادہ بنو نہیں۔ تم ہی تھے اوپر چھت پر اور یہ کام تمہارا ہی ہے۔“ آفتاب نے اپنا

ریوالور نکال لیا۔

”یہ تم اس بنیاد پر کہہ رہے ہو کہ تم مجھ سے انتقام لینا چاہتے ہو۔ لڑکر نہیں کسی بہانے

پھنسا کر ہی سہی۔“ تیمور نے کہا۔

”انتقام آفتاب خان ڈنگے کی چوٹ پر لیتا ہے۔ اس عمارت کی چھتیں بہتی نہیں ہیں کہ

تم اس پانی میں بھیک جاؤ۔“

تیمور نے اپنے بھیکے کپڑوں کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ”کپڑے بھیکے دیکھ کر تم نے کہہ

دیا کہ میں اوپر تھا۔ کپڑے تو تمہارے بھی بھیکے ہوئے ہیں۔ تم بھی اوپر سے آ رہے ہو؟“

”میں باہر سے آ رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

”اس عمارت میں میرا آفس ہے۔ میں بھی سب کے سامنے آیا تھا۔ شرابور

کپڑوں میں لیکن لفٹ کے ذریعے میں اوپر والی منزل پر چلا گیا تھا۔ وہاں سے اتر رہا تھا کہ تم

نے مجھے روک لیا اور لڑکی کی کہانی سنا ڈالی۔“ تیمور نے کہا۔

آفتاب اس کی بات سن کر تذبذب میں پڑ گیا۔ اس کے ساتھ نیچے استقبالیہ پر آیا تو

تیمور کے بارے میں آفتاب کو بتایا گیا کہ اس کا آفس ہے۔ وہ ابھی کچھ دیر قبل ہی اکیلا یہاں

آیا تھا اور اوپر گیا تھا۔

سدرہ کا چہرہ دیکھ کر آفتاب کو یہ بتایا گیا تھا کہ یہ لڑکی پہلی بار اس عمارت میں آئی تھی۔

اکیلی ہی اوپر کی طرف گئی تھی۔

اس کے بعد اس عمارت میں اور بھی پولیس آ گئی تھی۔ تفتیش شروع ہو گئی تھی۔ تیمور

اطمینان سے اپنے آفس میں چلا گیا تھا۔ وہ اس کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا تھا۔ اس نے

عشرت کو فون کر دیا تھا کہ وہ اس جگہ گاڑی بھیج دے۔ اس نے نازی کے فون کے بارے میں بتا دیا تھا لیکن یہ بات اس سے مخفی رکھی تھی کہ اس نے اغوا کرنے والوں کی ایک ساتھی کو اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا ہے۔

لاش پولیس نے اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ اسی دوران تیمور کی کار آگئی تھی۔ تیمور نے اپنا ریوالور آفس کی الماری میں پڑے آفس بیگ میں رکھ لیا تھا اور اس بیگ کو لے کر نیچے آئے ہی وہ اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ ڈرائیور کو اس نے اسی جگہ سے واپس بھیج دیا اور خود کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

آفتاب کی نگاہیں مسلسل تیمور کے تعاقب میں تھیں۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس عورت کو اپنی گولی کا نشانہ اسی نے بنایا ہے لیکن کیوں؟ ایسے بہت سے سوالات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔

تیمور نے پہلے یہ اطمینان کیا تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں تو نہیں ہے۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو پھر اس نے نور پور کی طرف اپنی کار اس رفتار سے دوڑائی کہ اس نے بارش اور کھڑے پانی کی بھی پروا نہیں کی تھی۔

کار نور پور کی اندر جاتی سڑک پر جب اتر رہی تھی تو حماد کی کار اس کے برابر میں گزر کر مین سڑک کی طرف بڑھی تھی۔ حماد نے اس کے برابر میں کار گزارتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر اس طرح سے ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کا چہرہ چھپ جائے۔ اُسے ابھی جمال نے فون کر کے کہا تھا کہ وہ فوری ان کے پاس پہنچے۔ کار واپس کرنے کے بعد اس نے اسی جگہ جانا تھا۔

تیمور کو وہ مکان تلاش کرنے میں کسی قباحت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ سرخ رنگ کی سفیدی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

کار ایک طرف کھڑی کرنے کے بعد پہلے اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ بارش کی شدت میں کمی آگئی تھی لیکن دور تک کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کار سے باہر نکلا۔ مکان کی طرف بڑھا۔ حماد نے شاید دانستہ دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ تیمور مکان کے اندر چلا گیا۔ اس نے سارے مکان کے کمروں کو دیکھ لیا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک چار پائی پر وہ ضخیم کتاب پڑی ہوئی تھی جو نازی نے لائبریری سے ایشو کرائی تھی۔

تیمور نے وہ کتاب اٹھالی۔ ایک بار پھر اس نے نظر دوڑائی اور مکان سے باہر نکل کر کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا۔

”کہاں چلی گئی ہے۔ اگر یہاں ہے تو کس کے پاس ہے؟“ اس نے اپنے موبائل فون سے وہی نمبر ڈائل کیا جس نمبر سے نازی نے اُسے فون کیا تھا۔ تیل جانے لگی تھی۔ مسلسل تیل جانے پر جب فون اٹینڈ نہیں ہوا تو وہ خود ہی کٹ گیا۔ تیمور نے ایک بار پھر کوشش کی.... ایک بار پھر تیل جانے لگی۔

جس جگہ تیمور کھڑا تھا۔ اُس سے کچھ فاصلے پر ایک پرانا گرا ہوا مکان تھا۔ جواب جانور وغیرہ باندھنے کے کام آتا تھا۔ ایک ہی کمرہ تھا۔ جس کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کمرے میں جس کی چھت پانی سے ٹپک رہی تھی، ایاز اور نازی پناہ لئے ہوئے تھے۔

نازی اگر ایک پل کے لیے یہ سوچتی کہ ایاز اس کی مدد کر رہا ہے۔ وہ ان اغوا کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہے تو دوسرے ہی لمحے یہ خیال آ جاتا کہ اسی کا سارا چکر ہے۔ وہ ان ہی سوچوں میں معلق تھی کہ پہلی بار ایاز کے موبائل پر تیل ہوئی۔ جب فون نہ اٹھایا تو نازی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ دوسری بار پھر تیل ہونے لگی۔ ایاز موبائل اسکرین کی طرف دیکھتا رہا اور پھر نمبر کاٹ کر بولا۔

”ایک تو گھر سے کہیں باہر نکل جاؤ تو ماں کا فون آنا ہی بند نہیں ہوتا۔ کیا کر رہے ہو۔ کہاں ہو۔ کیسے ہو۔ تنگ آ جاتا ہوں میں ان سوالوں سے۔“

نازی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ایاز نے باہر سر نکال کر دیکھا اور کہا۔ ”بارش کم ہوگئی ہے۔ بوند باندی ہے۔ تم اگر جانا چاہو تو چلی جاؤ۔“

ایک بار پھر نازی کے ذہن کے اندیشے دم توڑنے لگے کہ ایاز تو اسے روکنا نہیں چاہتا۔ وہ تو خود کہہ رہا ہے کہ چلی جاؤ۔

”میں کیسے جاؤں گی۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی بس....“ نازی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ایک اکیلی لڑکی کا جانا بھی اس جگہ سے آسان نہیں ہے۔“ وہ بڑبڑا کر یک دم اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تمہیں کس نے اغوا کیا تھا اور کیوں؟“

”پتہ نہیں کون لوگ ہیں وہ اور کیوں کیا مجھے نہیں پتہ لیکن اگر میں یہاں سے گئی تو پھر کہیں وہ لوگ مجھے پکڑ نہ لیں۔“ نازی نے کہا۔

”یہ ہی میں کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا کہ کہیں تم میری بات پر یقین ہی نہ کرو۔ اچھا کیا کہ تم نے خود ہی کہہ دیا۔ تم نے مجھے دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ میں ان اغوا کرنے والوں کے ساتھ ملا ہوا ہوں لیکن یہ سچ ہے کہ میں یہ سب جانتا بھی نہیں ہوں۔ اگر تم میری طرف سے

ذہن صاف کرو تو میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے گھر جانا ہے۔ بھائی اور بھابی پریشان ہوں گے۔“ نازی نے جلدی سے کہا۔  
 ”تمہارے گھر جانے کی ہی بات کرنا چاہتا ہوں۔“ ایاز نے کہا۔ ”بارش میں میں تمہیں حویلی اس لئے نہیں لے کر گیا کہ وہاں میرے چچا جان ہیں۔ تمہیں دیکھتے ہی سوالوں کا نہ رکنے والا سیلاب شروع ہو جائے گا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اندھیرا ہونے کا انتظار کرو۔ اس کے بعد میں تمہیں تمہارے گھر کے دروازے تک چھوڑ دوں گا۔“

”نہیں مجھے ابھی جانا ہے۔“ نازی نے کہا۔

”ٹھیک ہے ابھی چلی جاؤ لیکن اس وقت میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ کیونکہ اگر چچا کے کسی ملازم نے یا گاؤں کے کسی آدمی نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو پھر مجھے ان کے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔“ ایاز نے کہا۔

”میں چلتی ہوں۔“ نازی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہاں سے سیدھے چلو گی تو اس سڑک کے ختم ہوتے ہی جی ٹی روڈ آجائے گا۔ وہاں رک جانا اور شہر کی طرف جانے والی کسی بھی بس میں سوار ہو جانا۔“ ایاز نے کہا۔ ”اور اپنا خیال رکھنا۔ کاش میں تم سے کچھ اپنے بارے میں کہہ سکتا۔“

ایاز نے آخری جملہ بڑی متانت سے کہا تھا کہ ایک بار نازی اس کے چہرے کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ایاز اپنی آنکھوں میں نہ جانے کہاں سے پانی لے آیا تھا۔ اس نے چہرہ ایسا بنا لیا تھا کہ جیسے اسے بہت کرب ہے۔ نازی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔

نازی کا چہرہ یک دم افسردگی میں ڈوب گیا تھا۔ پرانی محبت شاید پھر سے یاد آگئی تھی۔ شاطر ایاز نے نازی کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ اُس نے متانت سے کہا۔ ”نازی.... اگر کچھ دیر رک جاؤ تو میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ نازی نے دو ٹوک کہا۔

”ضرورت ہے.... ضرورت ہے کہ میں تمہیں کچھ اپنے بارے میں بتاؤں۔“ ایاز نے زور دے کر کہا۔

”جو میں تمہارے بارے میں جان گئی ہوں کیا وہ کافی نہیں ہے؟“ نازی نے اس کی طرف دیکھا اور نگاہیں پھیر لیں۔

”تم ابھی میرے بارے میں جانتی ہی کہاں ہو۔“ ایاز نے کہا۔ ”تم کیا جانتی ہو میرے

بارے میں یہ کہ میں ایک جھوٹا اور دولت کی ہوس کا مارا ہوا ہوں۔ جس نے تمہیں دھوکہ دیا۔ تم سے جھوٹ بولا؟ ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا لیکن.... وہ جھوٹ بھی تمہیں کھو جانے کے ڈر سے بولا۔ روز اگر نئی کار بدلی تو وہ بھی تمہارے لئے کہ کہیں تم مجھے دھکا نہ دو۔ میری محبت پروان چڑھنے سے پہلے اس لئے دم نہ توڑ دے کہ میرے پاس دولت نہیں ہے اور تم ایک امیر بھائی کی بہن ہو اور میں ایک لاوارث لڑکا ہوں۔ جس نے زندگی میں تلخیوں کے سوا کیا دیکھا ہے؟“

”جیسے چاہا جاتا ہے، وہاں ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔“ نازی نے خشک لہجے میں کہا۔

”لیکن کیا کیا جائے اس معاشرے کا جہاں ہم رہتے ہیں۔ یہاں ہر رشتہ دولت کے ترازو میں تولایا جاتا ہے۔ برابری کی سطح دیکھی جاتی ہے۔ دل نہیں دیکھا جاتا کہ اس میں کتنی چاہت ہے کتنی محبت ہے۔ کتنی اپنائیت ہے۔“ ایاز نے جذباتی پن سے کہا۔ ”اگر میں غلط تھا تو مجھے کون یہ باتیں سمجھاتا....؟ میری ماں....؟ جو کبھی میری نہیں بنی.... میری بہن جو میری ماں کی ہے.... یا میرا باپ جس کی انگلی پکڑنے سے پہلے علیحدگی کی دیوار میری ماں نے کھڑی کر دی۔“

جس طرح تپش سے موم پکھلنے لگتی ہے، اسی طرح نازی کا دل بھی رفتہ رفتہ اس کے ہر جملے پر پھڑپھڑانے لگا تھا۔ یہ باتیں کبھی بھی ایاز نے اس کے ساتھ نہیں کی تھیں اور وہ بھی اتنی سنجیدگی اور جذباتی پن سے۔ وہ کہانی جو اس نے ہمیشہ اس سے مخفی رکھی تھی وہ بیان کر رہا تھا لیکن اس مجسمہ تراش کی طرح جو بڑی خوبصورتی سے پتھر کو تراشا جانتا ہے۔ ایاز کے بارے میں جو نفرت کی گرد اس کے دل پر جم گئی تھی وہ اُڑنے لگی تھی۔ نازی نے زندگی میں پہلی بار ایاز کو چاہا تھا۔ کہتے ہیں پہلی محبت کے نشان دیر پا ہوتے ہیں۔ شاید وہ نشان مٹے نہیں تھے۔ تبھی وہ اس کی بات سننے لگی تھی۔

ایک بار پھر نازی نے اس کی طرف دیکھا اور اسی لہجے میں کہا۔ ”اب کیا فائدہ اس حقیقت کا.... جسے تمہارا جھوٹ کھا گیا ہے۔“

”آج تم میری حقیقت سن لو۔ پھر یہاں سے چلی جانا۔ فیصلے کا اختیار تمہارا ہوگا اور زندگی کی آخری سانس تک.... انتظار میرا مقدر ہوگا۔“ ایاز نے کہا۔ نازی اس کی بات سن کر چپ رہی۔ ایاز نے دیکھا کہ لوہا گرم ہے۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”میری ماں ایک سخت دل عورت ہے۔ میرے باپ سے اس کی کبھی نہیں بنی۔ میرا باپ ایک اچھا انسان تھا۔ جو کمایا



بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیا لیکن میری ماں اس سے زیادہ چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنا بوتیک بنا لیا اور میرے باپ کی کمائی کا مذاق اڑانے لگی۔ طعنے دینے لگی۔ بات برداشت سے باہر ہو گئی اور آئے دن گھر میں جھگڑے ہونے لگے۔ بات طلاق تک جا پہنچی۔ میری ماں نے یہاں تک ہی اس باب کو ختم نہیں کیا۔ اُس نے میرے باپ پر جائیداد کا مقدمہ کر دیا اور بہت سی جائیداد اور دولت حاصل کر لی۔ میرا باپ اپنا سب کچھ کھو کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ ایاز نے یہاں رک کر اپنی آنکھوں سے آنسو بہائے اور پھر کچھ توقف کے بعد سلسلہ کلام جوڑا۔ ”میری ماں اور بہن ایک ہی سوچ کی مالک ہیں۔ میں اس گھر میں کسی فضول چیز کی طرح کبھی ادھر اور کبھی اُدھر..... کسی کو میری کوئی پرواہ نہیں۔ ایک دس روپے کی خاطر ماں کے آگے ہاتھ پھیلا کر جتنی باتیں میں نے سنی ہیں شاید کوئی بھیک مانگنے والا سنتا ہو۔“ ایاز نے کہا اور جذبات میں آکر مکہ سامنے کچی دیوار پر دے مارا۔ نازلی کا دل دھک سے رہ گیا۔ باتوں کی تپش نفرت پر غالب آنے لگی تھی۔ وہ پھر بولا۔ ”میں اپنے خرچے کے لیے ایک دوست سے مانگنے لگا۔ اسی سے مانگ کر تعلیم پوری کی۔ کہ نوکری ملے گی تو پانی پانی ادا کر دوں گا لیکن کہیں نوکری نہ ملی۔ سفارش نہیں تھی۔ باپ کا سایہ ساتھ نہیں تھا کہ جو میری راہنمائی کرتا۔ میرے لئے کچھ اور کرتا... ماں نے کھانا دینا بند کر دیا کہ کماؤ گے تو کھاؤ گے۔ کتنی راتیں اور دن میں نے بھوک کی دوستی میں گزارے ہیں۔ یہ میں جانتا ہوں۔“

”تم اب بھی جھوٹ بول رہے ہو۔“ اچانک نازلی نے سوچ کر کہا۔ ”ابھی جب تمہیں فون آ رہا تھا تو تم نے کہا تھا کہ تمہاری ماں تمہارے بارے میں فکر مند رہتی ہے اور.....“

”وہ جھوٹ تھا۔ جبکہ فون کسی اور کا تھا۔“ ایاز نے کہا۔

”تب تم نے ایسا کیوں کہا تھا۔“ نازلی نے اُلجھن بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بہت کوشش تھی..... ہر پل یہی کوشش تھی..... کہ کچھ پتہ نہ چلے..... میرے دکھ کی باتیں میرے پاس ہی رہیں..... میری محرومیوں پر پردہ ہی رہے..... کتنا پردہ ڈالتا..... باپ کی ایک بات یاد ہے۔ اپنے آپ سے کبھی بھرم کی چادر مت اٹھاؤ۔ مذاق بن کر رہ جاؤ گے۔“ ایاز نے کہا۔ ”آج وہ بھی اٹھا دی۔ جس دوست سے اُدھار لیتا تھا۔ جس کی گاڑیاں استعمال کرتا تھا۔ جب اس کا قرض ادا نہ کر سکا تو وہ تنگ کرنے لگا۔ ایک بار پھر ماں سے مانگا تو ماں نے گھر سے باہر نکال دیا۔ یہاں رشتے کے ایک چچا کے پاس ہوں۔ اُس نے ایک دن جب بہت تنگ کیا تو اُسے کہہ دیا کہ ایک لڑکی کو اپنی محبت کے جال میں پھانسا ہے۔ بہت

دولت ہاتھ آ جائے گی۔ تمہارا قرض اتار دوں گا۔ یہ جھوٹ میرا جرم بن گیا اور میں نے آخر کار تمہیں کھو ہی دیا۔“ ایاز نے کہا اور ہڈ ہال سا ہو کر ایک ٹوٹی ہوئی چار پائی کے کونے پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور کرب اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ اُسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے کوئی لمبی مسافت سے تھک کر بیٹھ گیا ہو۔

نازلی کے دل پر اس کی ہر بات اثر کر گئی تھی۔ اُسے پھر سے اس کی باتوں پر یقین آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے ذریعے نے آنسوؤں کی شکل میں ایاز کے بارے میں جو بھی نفرت اور غلط فہمی تھی، وہ بہہ گئی تھی۔ جس طرح بارش میں مٹی اور گرد سے نہائے درختوں کے پتے دھل جاتے ہیں اسی طرح نازلی کا دل بھی صاف ہو گیا تھا۔ لحوں کا کھیل تھا۔ لفظوں کی جادو گری تھی۔ شطرنج کی بازی تھی۔ مہروں کی چال تھی۔ کمزور اور نرم دل کی زمین پر شاطر لحات غالب آ گئے تھے۔

نازلی نے پہلی بار اس کی طرف اپنے قدم اٹھائے اور اس کے پاس جا کر رک گئی۔ اس نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تم نے کبھی مجھے بتانے کی کوشش کی؟ تم مجھے بتاتے میں سنتی۔“

صحرا پر پڑنے والی بارش کے قطروں جیسے الفاظ نازلی کے منہ سے سن کر ایاز جیسے دل ہی دل میں کھل اٹھا۔ وہ اس کی سوچ سے بھی کہیں زیادہ بے وقوف نکلی تھی۔

”کچھ کہنے کا موقع دیا تم نے؟ میرے بارے میں جو جانا اسے سچ مان کر اپنی رائے دی اور راستے الگ کر لئے۔ میں نے کتنا کہا کہ مجھے کچھ تو کہنے دو لیکن تم نے..... تم نے اپنا نام بھی میری زبان سے سننا گوارہ نہیں کیا تھا اور چل دی تھی۔“ ایاز نے اٹھ کر کہا۔

”میں اس وقت کرب میں تھی۔ مجھے تم سے ایسی اُمید نہیں تھی۔ مجھے بہت دکھ تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔“ نازلی کو جیسے احساس ہونے لگا تھا۔

”بہر حال نازلی..... مجھے آج کہنے کا موقع ملا اور میں نے کہہ دیا۔ میں اس وقت مشکل میں ہوں۔ جس کے پیسے دینے ہیں اس کی وجہ سے شہر سے بھاگ کر یہاں آیا ہوا ہوں۔ چچا نے کہا ہے کہ وہ مجھے کچھ پیسے دیں گے تاکہ میں کوئی کاروبار کر سکوں۔“ ایاز نے کہا۔

”تم میرے ساتھ شہر چلو۔“ نازلی نے کہا۔

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”میں بھائی سے بات کروں گی۔ میں ان کی ہر غلط فہمی دور کروں گی اور بھائی تمہارے لئے کچھ کریں گے۔“ نازلی نے کہا۔ لگتا تھا اس نے ہر بات نظر انداز کر دی ہے۔

ایاز نے اپنا رخ دوسری طرف کرتے ہوئے اپنی آنکھیں نچا کر کہا۔ ”نازلی..... تم اپنے بھائی کے بارے میں کتنا جانتی ہو؟“

”کیا مطلب؟“ نازلی نے چونک کر پوچھا۔

”کیا یہ تمہارے علم میں ہے کہ تمہارے بھائی اس وقت کاروباری طور پر کس قدر الجھن کا شکار ہیں۔ اُن کے سر پر مارکیٹ کا کتنا پیسہ ہے۔“ ایاز نے اپنا رخ اس کی طرف کر کے متانت سے کہا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ نازلی نے خیرہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ایاز شطرنج کے مہرے اپنی مرضی سے چل کر کھیل اپنے ہاتھ میں کر چکا تھا۔ اب اس نے ایک نئی چال چلی تھی۔ وہ بولا۔ ”کردوڑوں روپیہ تمہارے بھائی کے سر ہے۔ مجھے کیسے پتہ چلتا..... مجھے تو اُس وقت پتہ چلا جب میرے چچا نے تمہارے بھائی کا نام لیا۔ تمہارے بھائی کی کمپنی کا ذکر کیا..... کیونکہ چچا کے ایک بیٹے شہر میں کیمیکل کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ انہیں مال دیتے ہیں۔ لاکھوں کالین دین ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ نازلی اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اغوا کرنے والوں میں..... یہ میرا خیال ہے۔ اُن لوگوں کا ہاتھ ہے جنہوں نے تمہارے بھائی سے ڈیڑھ کروڑ روپیہ لینا ہے۔ میرے چچا بتا رہے تھے کہ اس سلسلے میں تمہارے بھائی کی ان کے دفتر میں کوئی لڑائی وغیرہ بھی ہوئی تھی۔“ ایاز نے ایک اور چال چل دی تھی۔

جس رات وہ تیمور اور عشرت کے ساتھ رات کا کھانا کھانے کے لیے باہر گئے تھے۔ اس کے اگلے دن عشرت نے تیمور کے جانے کے بعد اس بات کا سرسری طور پر ذکر کیا تھا کہ، جاتے دفتر کام کے لیے ہیں اور لوگوں سے جھگڑتے رہتے ہیں۔ مفت کی دشمنی لینے کے لیے، ان الفاظ پر نازلی نے کچھ خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اُس وقت وہ کتاب پڑھنے میں مشغول تھی۔ اُس نے سنا تھا اور کوئی سوال بھی نہیں کیا تھا۔

ایاز کی بات میں نازلی کو سچائی نظر آنے لگی تھی۔ اس دن کی ہوئی بات کی حقیقت اب منکشف ہو رہی تھی۔ وہ مجسمہ حیرت بنی ایاز کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس بات کو نہ ماننے کا اس کے دل میں کوئی ابہام ہی نہیں تھا۔ اُس دن اگر وہ عشرت سے اس بارے میں کچھ تفصیل پوچھ لیتی تو شاید وہ آج حیران نہ ہوتی بلکہ ایاز کی ہاں میں ہاں ملا دیتی۔

اس وقت ایک بار پھر تیمور کا فون اس کے موبائل پر آگیا۔ اس نے ایک نظر اپنے موبائل فون کی اسکرین کی طرف دیکھ کر نازلی کی طرف دیکھا جو ساکت اسی جگہ کھڑی تھی۔ وہ باہر نکل آیا۔ بارش بالکل تھم گئی تھی۔ ایاز نے اپنی آواز میں دیہاتی لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔

”کون بول رہے ہو تم؟“ دوسری طرف سے تیمور کی آواز آئی۔

”آپ کو کس سے بات کرنی ہے۔“ ایاز نے اسی لہجے میں کہا۔

”اس نمبر سے مجھے ایک فون آیا تھا۔“ تیمور نے کہا۔

”آسکتا ہے..... یہ میرے پی سی او کا فون ہے۔ کسی نے کیا ہوگا۔“ ایاز نے ایک نظر اس کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تمہارا پی سی او کہاں ہے؟“ تیمور نے جلدی سے پوچھا۔

”میرا پی سی او..... آپ کو کیا کام ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”تمہارے اس فون سے ایک لڑکی نے فون کیا تھا۔ مجھے اس کا پتہ کرنا ہے کہ وہ لڑکی کہاں ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”لڑکی نے.....؟“ ایاز سوچنے لگا اور پھر بولا۔ ”ہاں کیا تھا ایک لڑکی آئی تھی..... کوئی شہر کی لگتی تھی۔ گھبرائی ہوئی تھی۔“

”ہاں ہاں کہاں ہے وہ لڑکی؟“ تیمور نے مضطرب ہو کر کہا۔

”وہ فون کر کے چلی گئی تھی۔“ ایاز نے کہا۔

”کہاں چلی گئی تھی؟“ تیمور نے پوچھا۔

ایاز کچھ قدم اور آگے بڑھ گیا تھا۔ جس کونے میں وہ بات کر رہا تھا اس سے کچھ ہی دور باہر سڑک پر تیمور کھڑا تھا۔ ایاز نے کہا۔ ”اُس نے مجھ سے پوچھا کہ شہر کی طرف کون سی بس جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ تم بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد بس آئی میں نے بتا دیا کہ بس آگئی ہے۔ وہ لڑکی اس بس میں بیٹھ کر شہر کی طرف چلی گئی۔“

”کتنی دیر ہو گئی ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”یہی کوئی..... بارش شروع ہوتی ہی وہ آئی تھی اور پھر چلی گئی۔“ ایاز نے کہا۔

”کئی بات ہے کہ وہ بس میں سوار ہو گئی تھی۔“ تیمور نے ایک بار پھر تصدیق کی۔

”بابو..... اب ہم آپ کو کیسے یقین دلائیں۔“ ایاز اچھی اداکاری کر رہا تھا۔

”تم مجھے مل سکتے ہو؟“ اچانک تیمور نے پوچھا۔

”کہاں؟“ ایاز نے ایک بار پھر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ دھیمّا تھا۔  
”میں اس وقت نور پور گاؤں میں ہوں۔“ تیمور نے کہا۔

ایاز یک دم چونکا اور بولا۔ ”بارش تیز ہو رہی تھی۔ میرا گاؤں اس گاؤں سے دو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ میرا بڑا بیٹا بھی بیمار ہے۔ میں دکان بند کر کے جانے ہی والا تھا جب وہ لڑکی آئی تھی۔ اُسے بس میں سوا کر کے میں نے بھی اپنے گاؤں کی راہ لی تھی۔ آپ آسکتے ہیں تو آجاؤ میرے گاؤں۔ میرے گاؤں تک رستہ سارا کچا ہے۔ بارش سے کچھ بھی بہت ہو گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ تیمور نے کہا اور رابطہ کاٹ دیا۔

ایاز نے دیوار کے ساتھ لگ کر ذرا سسر نکال کر اس دیوار سے پار دیکھا۔ تیمور اپنی کار میں بیٹھ رہا تھا۔ پھر اس کی کار کا انجن جاگا اور اُس نے کار یک دم گھما کر موڑی اور تیزی سے بڑی سڑک کی طرف چل پڑا۔ ایاز نے اطمینان کا سانس لیا اور نازلی کے پاس چلا گیا۔  
”اُس کا فون تھا۔ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔“ ایاز نے اندر جاتے ہی کہا۔ نازلی چار پائی پرگم سم بیٹھی تھی۔ ایاز نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تم ایسا کرو کہ اب یہاں سے چلی جاؤ۔ بارش رک گئی ہے۔ شہر جانے کے لیے بس مل جائے گی۔“  
نازلی چونکی۔ ”کیا میرا جانا خطرے سے خالی ہوگا؟“

ایاز نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں نچا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”ایسا تو نہیں ہے کہ وہ چپ بیٹھے ہوں گے۔ تمہاری تلاش میں تو ہوں گے اور نہ جانے کون کس روپ میں تمہارا دشمن ہے۔“

”پھر میں کیا کروں۔“ نازلی نے پوچھا۔

”تم اپنے بھائی کو فون کرو۔ وہ تمہیں اس جگہ سے لے جائے۔ یہ ہی اس کا ایک حل ہے۔ یا پھر تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں تمہارے گھر کے دروازے تک چھوڑ آتا ہوں۔“  
ایاز اس کے دل میں بے اعتمادی کا کوئی رخ نہ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

”بھائی کو بلاؤں.....؟“ نازلی نے سوچا۔

”لیکن اس فون سے نہیں ورنہ میرے لئے کوئی صفائی بھی پیش کرنا ممکن نہیں ہوگا۔“  
ایاز نے کہا۔ ”مجھے ڈر لگتا ہے اور ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ میری بات کو وہ مان سکیں۔ تم بھی اگر کچھ کہو گی تو بات پھر بھی سنھلے گی۔ ہمیں اپنی بات کہنے کے لیے ابھی کچھ وقت درکار ہے۔“

”پھر تم مجھے میرے گھر تک ساتھ لے کر چلو۔“ نازلی نے فوراً کہا۔ ”اور مجھے میرے گھر کے دروازے تک چھوڑ آؤ۔“

ایاز نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا اب بھی ساتھ صرف اس گھر کے دروازے تک ہی ہوگا؟“

نازلی نے اپنی نگاہیں اس کی نگاہوں سے ہٹا کر متانت سے کہا۔ ”فیصلے کا اختیار تم نے مجھے دیا ہے۔“

”ہاں..... ہاں.....“ ایاز نے سر مار کر کہا۔ ”لیکن اگر تم میری بات مان لو تو واپس مت جاؤ۔ میرا مطلب ہے کہ ابھی یہاں ہی رک جاؤ۔ یہاں رہنے سے تم اُن لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہو گی جو تمہیں اغوا کر کے لائے تھے۔“

”اگر میں گھر نہ گئی تو میرے بھائی اور بھابی پریشان ہیں۔“ نازلی نے کہا۔ ”ان کی پریشانی بڑھتی جائے گی۔“

”اُنہیں اطلاع کرنے کے لیے میں کوئی اور نمبر کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم ان سے بات کر لینا۔ میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ کیا حالات ہیں۔ تمہارے بھائی کے ساتھ کیا معاملہ چل رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم احتیاط کرو۔ غالباً کسی بینک کا بھی کوئی معاملہ تھا۔ شاید تمہارے بھائی خود کہیں بھاگ دوڑ یا چھپ کر اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر رہے ہوں۔“

”بھائی اتنی مشکل میں ہیں۔ اُنہوں نے کبھی کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔“ نازلی نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

”کیا وہ اپنے بزنس کی باتیں تم سے شیئر کرتے ہیں؟“ ایاز نے پوچھا۔

”نہیں۔“ نازلی نے نفی میں گردن ہلائی۔

”تو پھر تمہیں ان کی مشکلات کا کیسے اندازہ ہو سکتا ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”تو پھر کیا میں یہاں اس مکان میں رہوں؟“ نازلی نے کچھ سوچ کر کہا۔

”اپنے چچا کی حویلی میں داخل کرنے کا منصوبہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تم اعتماد سے کام لینا۔ جیسا میں کہتا ہوں ویسا کرنا۔ میں تمہارے گھر والوں سے بات بھی کر ادوں گا اور تم محفوظ بھی ہو جاؤ گی۔“ ایاز نے جلدی سے کہا۔

نازلی نے سوچا کہ ایاز کی بات ماننے میں عافیت ہے۔ یقیناً شہر واپس جانے میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ لوگ ہو سکتا ہے کہ اس کی تلاش میں ہوں اور پھر نہ جانے تیمور بھائی کس مشکل میں ہیں۔ اُنہیں کن حالات کا سامنا ہے۔

ایاز نے اسے سمجھایا کہ حویلی کے اندر جانے کے لیے اسے کیا کرنا ہے۔ حویلی میں کون کون ہوگا اس کے بارے میں بھی اس نے بتادیا۔ کچھ اور ہدایات کے بعد اس نے باہر نکل کر باہر کا جائزہ لیا۔ دور تک بارش کا جابجا پانی کھڑا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جس سے سردی کی شدت میں دو چند اضافہ ہو گیا تھا۔ گاؤں کی کھلی فضا میں اس کی شدت اور زیادہ تھی۔ نزدیک کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دور کہیں کوئی آتا جاتا نظر آ رہا تھا۔

ایاز نے نازی کو اشارہ کیا اور اُسے دروازے کے پاس کھڑا کر کے کچھ کہا اور حویلی کی طرف چل پڑا۔ وہ کچھڑ سے چلتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھانے کی بھی کوشش میں تھا تا کہ وقت بچ سکے اور نازی اس حویلی کے اندر پہنچ سکے۔

ایاز نے حویلی کے اندر قدم رکھا تو منشی اپنے تخت پوش پر اس طرح افسردہ براجمان تھا کہ جیسے اس بارش میں اس کی فصل تباہ ہو گئی ہو۔

”پتہ چلا؟“ ایاز نے اس کے پاس جا کر آہستہ سے پوچھا۔

منشی یک دم چونکا۔ ”زمین کھا گئی ہے کہ آسمان..... دیواروں کی نیت خراب ہو گئی تھی کہ خود اس جگہ کی جہاں میں نے پچاس ہزار روپے رکھے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس حویلی کا ہر ملازم پرانا ہے۔ ان پر شک کیا تو اپنے آپ پر شرمندگی ہی ہوگی۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔“

منشی پھر اپنی سوچ میں مستغرق ہو گیا تھا۔ ایاز اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جاتے ہی وہ کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ نازی حویلی کی طرف آ رہی تھی۔ ایاز نے مسرت بھرے جذبات سے اپنا مکہ دو، بار لہرایا۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد پھر جب ایاز نیچے اتر تو منشی نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی نازی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے پیچھے حویلی کی ایک ملازمہ مائی کھڑی تھی۔ نازی بڑے پُر اعتماد انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایاز کی آہٹ سن کر منشی نے اپنا سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہتا، ایاز نے مائی سے پوچھا۔

”اماں..... کچھ کھانے کے لیے ہے؟“

”کھانا بعد میں کھانا باؤ پہلے ادھر آؤ۔“ منشی نے کہا اور ایاز اس کے پاس چلا گیا۔ ”یہ لڑکی شہر سے آئی ہے۔ شہر بھی اس جگہ سے دور ہے۔ کسی اخبار میں کام کرتی ہے۔ بارش سے پہلے جب آندھی چل رہی تھی تو دونو جوانوں نے اس لڑکی سے اس کا بیک اور کیموہ چھین لیا..... حالات بھی اب بڑے خراب ہیں۔ گھر میں پڑی رقم کا پتہ نہیں چلتا۔ اسے تو پھر باہر

لوٹ لیا گیا ہے۔ بیٹی تو کیا کہہ رہی تھی کہ تو یہاں کیا کرنے کے لیے آئی ہے۔“

”جی مجھے اپنے منہ پر کے لیے دیہی ماحول میں معلومات درکار تھیں۔“ نازی نے بتایا۔

”ہاں یہ کہہ رہی ہے۔ ایک دو دن کے لیے یہاں رہنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا جتنے دن چاہو رہو۔ اس نے کہا کہ اسے فون کی بھی ضرورت ہے تاکہ یہ اپنے پیچھے اطلاع کر سکے۔ میں نے کہا وہ بھی مل جائے گا۔ تم پڑھ لکھے ہو اس کی مدد کرو۔“ منشی نے ایاز سے کہا۔ ”چھ سات مہینے پہلے بھی ایسی ہی لڑکیاں اور لڑکے اس گاؤں میں آئے تھے۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ ایاز نے کہا۔ فون کی بات کرنے کے لیے ایاز نے نازی سے نہیں کہا تھا لیکن اُسے حیرت ہوئی تھی کہ اس نے یہ بات کیوں کی ہے۔ اگر منشی نے اسے فون کرنے کی اجازت دے دی تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ ایاز کے کہنے پر ہی نازی نے کسی دور دراز شہر کا نام لیا تھا۔ اس کی دلیل اُس نے نازی کو یہ دی تھی کہ اگر تم نے اسی شہر کا نام لیا تو منشی کو شک پڑ جائے گا، میرا تم سے کوئی چکر ہے۔ کیونکہ میں بھی اسی شہر کا ہوں اور تمہیں بہانے سے میں حویلی کے اندر لے کر آیا ہوں۔ نازی جیسے ہی اس حویلی میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں فوراً خیال آیا تھا کہ اس حویلی سے وہ اپنے بھائی کو فون کر سکتی ہے۔ اس لئے اس نے فوراً فون کا کہہ دیا تھا۔

”بھئی تم ایسا کرو۔ لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ پہلے اسے کچھ کھانے پینے کے لیے دو۔ پھر میں اس کی بات فون پر کر دیتا ہوں۔“ منشی نے اماں سے کہا۔ نازی نے ایک نظر ایاز کی طرف دیکھا اور اُنھ کے اماں کے ساتھ چل پڑی۔ جیسے ہی وہ اس جگہ سے باہر نکل گئے۔ ایاز نے جلدی سے منشی کے پاس جا کر کہا۔ ”چچا جی کب آرہے ہیں؟“

”چوہدری صاحب کا ابھی پتہ نہیں۔“ منشی نے جواب دیا۔

”منشی جی..... میرا ایک مشورہ ہے آپ کو۔“ ایاز نے کہا۔

”کیا.....؟“ منشی نے خود ہی اپنا کان اس کے آگے کر دیا۔

”ابھی آپ اسے فون کرنے کی اجازت نہ دینا۔ بہانہ کر دینا کہ فون بارش کی وجہ سے خراب ہو گئے ہیں۔ ابھی ذرا یہ تو پتہ چلا لیں کہ یہ کسی اخبار کی ہے بھی کہ نہیں۔“ ایاز نے کہا۔

”کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ حالات تو اتنے خراب ہیں کہ خالی کمرے سے پیسے پاؤں لگا کر بھاگنے لگے ہیں۔“ منشی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پچاس ہزار کی گمشدگی اس کے ذہن پر سوار تھی۔

”آپ اسے کہو کہ وہ یہاں مہمان کی طرح رہے۔ بے فکر ہو کر۔ جو چاہے کھائے..... میں اس سے ایک دو ملاقاتوں میں پتہ چلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ گاؤں میں کس چکر میں آئی ہے۔ کہیں انکم ٹیکس آفیسر تو نہیں ہے۔“ ایاز نے سرگوشی کی۔

انکم ٹیکس آفیسر کا سن کر جیسے منشی کا سانس نیچے ہی رہ گیا ہو۔ ”ابھی باہر کر دیں کیا؟“

ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ پتہ تو کر لیں۔“ ایاز نے کہا۔

”جلدی پتہ کر لو، کہیں وہ پہلے ہمارا پتہ کر کے یہاں سارا معاملہ نہ بلا لے۔“ منشی نے کہا۔

”مجھے تو پہلے ہی اپنے پچاس ہزار کا پتہ نہیں چل رہا۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں۔“ ایاز نے خوش ہو کر کہا اور معنی خیز انداز میں آنکھیں گھما کر اس دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے ابھی نازلی اماں کے ساتھ باہر گئی تھی۔

☆=====☆=====☆

تیور کا رسی طوفان کی دوڑاتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ گھر کا ایک ایک کمرہ چھان لیا تھا لیکن نازلی گھر میں نہیں تھی۔ اُس نے عشرت کو فون کیا۔

”نازلی کا کوئی فون آیا تھا۔“ تیور نے رابطہ ہوتے ہی پوچھا۔

”نہیں... مجھے کوئی فون نہیں آیا۔“ عشرت نے جواب دیا۔ اس کے بعد تیور نے ساری تفصیل سے اُسے آگاہ کر دیا۔ باتیں کرتے ہوئے اس نے ٹی وی آن کر دیا تھا۔ نیوز چینل چل رہا تھا۔

”انکل احسان کا فون آیا تھا۔“ عشرت نے بتایا۔

”کیا کہتے ہیں وہ۔“ تیور نے پوچھا۔

”وہ کہہ رہے تھے کہ وہ اسلام آباد کے لیے کل نکلیں گے۔ وہاں پہنچ کر فون کر کے آپ سے نازلی کا پتہ لے کر اس سے اس جگہ ملاقات کر لیں گے۔“ عشرت نے بتایا۔

”ان کو بھی ابھی نازلی سے ملنا تھا۔“ تیور نے کہا۔ اس کی نگاہ ٹی وی اسکرین پر مرکوز ہو گئی تھی۔ چینل پلازے کی چھت سے سر میں گولی لگنے سے نیچے گرنے والی سدرہ کی خبر نشر کر رہا تھا۔ نیوز چینل کا صحافی آفتاب سے سوالات کر رہا تھا۔ آفتاب کہہ رہا تھا کہ وہ جلد ہی اس کا سراغ لگا لے گا۔

”ہیلو... ہیلو...“ عشرت کی آواز آئی۔

”ہا۔۔۔۔۔“ تیور چونکا۔

”کیا ہوا... چپ کیوں ہو گئے؟“ عشرت نے پوچھا۔

”نہیں سوچ رہا تھا کہ اب انکل احسان کو کیا کہوں۔“ تیور نے کہا۔

”میں کہتی ہوں کہ اب بھی تم پولیس کی مدد لے لو۔ ہم کتنا لڑ سکتے ہیں، اور انکل احسان

سے کوئی جھوٹ بولنے کی بجائے انہیں بھی اعتماد میں لے لو۔“ عشرت نے مشورہ دیا۔

”نہیں میں ایسا نہیں کروں گا۔“ تیمور نے سوچ کر ٹھوس لہجے میں کہا۔

”اب نازی کو کہاں تلاش کرو گے۔ کیسے؟ کیا یہ فون کر کے انہوں نے کوئی سازش کی ہو۔ نازی سے خود انہوں نے فون کرایا ہو۔“ عشرت نے اپنا قیاس عیاں کیا۔

”وہ ایسا کیوں کریں گے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے کہ انہوں نے یہ چیک کیا ہو کہ تم بیک لے کر اکیلے ہی آئے ہو۔ اگلی فون کال

.... میں وہ پیسے وصول کریں۔“ عشرت نے کہا۔

تیمور نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم کام کرو، میں سوچتا ہوں۔“

”تیمور..... میری بات مان لو۔“ عشرت نے ایک بار پھر استدعا کی۔

”یہ بات میں نہیں مان سکتا۔“ تیمور نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کی نگاہیں سامنے

ٹی وی پر تھیں لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ کیا عشرت کا قیاس ٹھیک ہے؟ انہوں نے اسے چیک کیا

ہے کہ وہ اکیلا ہی ہے؟ اپنی ایک ساتھی کو قربانی کا بکرا بنا کر یہ دیکھا ہے کہ وہ کیا کر سکتا ہے؟

تیمور کو عشرت کی بات میں دم نظر آنے لگا تھا۔ اس موبائل کو پی سی او کا نمبر ظاہر کرنا بھی ایک

ڈرامہ ہی ہو سکتا ہے۔

تیمور نے ایک گلاس پانی کا پیا اور پہلے احسان احمد کو فون کر کے یہ بتایا کہ نازی اپنی کزنز

کے ساتھ کاغان وغیرہ کی سیر کو چلی گئی ہے۔ میں آپ سے ملاقات کے لیے اُسے بلا لیتا

ہوں۔ اس کے جواب میں احسان احمد نے کہا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ ہم چند دن اسلام آباد میں

ہیں۔ اُمید ہے کہ ملاقات ہو جائے گی۔

اس کے بعد تیمور نے پھر اسی نمبر پر رابطہ کیا۔ مسلسل بیل جانے کے باوجود دوسری

طرف سے فون نہیں اُٹھایا گیا تھا۔ تیمور نے فون بند کر دیا۔

ایک خیال اس کے ذہن میں اچانک یہ آیا کہ وہ آفتاب کی اس سلسلے میں مدد لے۔ وہ

ایک ایماندار شخص ہے۔ جو دشمنی ایمانداروں سے نبھانا جانتا ہو، وہ اپنے فرائض منصبی میں کسی

کو تاہی کامرتکب نہیں ہو سکتا ہے لیکن پھر یہ خیال بھی آیا کہ اگر اُس نے یہ ذکر کیا تو اس لڑکی کی

بھی فائل کھل جائے گی۔ شک یقین میں بدل جائے گا۔ کڑی سے کڑی مل جائے گی اور اس

لڑکی کا قتل اس کے سر پر آجائے گا۔ پھر شاید وہ خود کو نہ بچا سکے۔ آفتاب وہاں بھی کوئی رعایت

نہیں برتے گا۔

تیمور نے اپنا خیال رد کر دیا۔ نازی کا نہ پہنچنا اس بات کی دلیل تھی کہ اس کے ساتھ چکر

کھلا گیا ہے۔ وہ اب بھی ان کے قبضے میں ہی ہے۔ نیوز چینل پر پھر سدرہ کے قتل کی خبر آرہی تھی۔ پھر آفتاب صحافیوں سے بات کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ وہ اس کا سراغ لگا کر رہے گا اور بہت جلد مجرم تک رسائی حاصل کر لے گا۔

اچانک اس کا موبائل فون بول پڑا۔ اس نے جلدی سے اپنا فون اٹھا کر اسکرین پر نمبر دیکھا۔ ایاز نے فون کا نمبر آ رہا تھا۔

”ہیلو۔“ تیمور نے فون کان کو لگا کر کہا۔

”میرا نمبر دیکھ کر حیرت تو ہوئی ہوگی کہ پی سی او والے کو کیا کام پڑ گیا ہے۔“ ایاز نے

چپک کر کہا۔ اس نے آواز بدلی ہوئی تھی۔

”تم مجھے دھوکہ دے رہے تھے۔“ تیمور نے کہا۔

”نہیں دھوکہ نہیں تھا۔“ ایاز کی آواز آئی۔ ”ایک چال چلی تھی۔ جس میں میں کامیاب

رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ تمہاری بہن کہیں اور نہیں ہے۔ وہ میرے پاس ہے۔ میرے قبضے

میں۔ بڑی حفاظت سے ہے۔ اس وقت اچھا کھا رہی ہے۔“ ایاز نے نازی کی طرف دیکھا جو

ایک طرف بیٹھی پھل کھا رہی تھی۔ اس کے پاس ہی اماں بھی براجمان تھی۔ ایاز اس سے فاصلے

پر تھا۔

”تم لوگوں کے کہنے پر میں اس جگہ پیسے لے کر پہنچا تھا۔ پھر تم لوگوں نے میرے ساتھ

دھوکہ کیوں کیا؟“ تیمور نے کہا۔

ایاز اس کی بات سن کر چونکا۔ اس نے سوچا کہ اس کا مطلب ہے کہ تیمور کو انہوں نے

بلایا تھا اور اس دوران نازی اس جگہ سے فرار ہوئی تھی اور یقیناً جس وقت نازی نے تیمور کو فون

کیا تھا، اس وقت کچھ لین دین ہو رہا ہوگا۔ ایاز نے کہا۔ ”ہم پہلے بندے کو آزماتے ہیں۔“

اس کے منہ سے نکلا۔

یہ بات سن کر تیمور کو یقین ہو گیا کہ عشرت کی بات صحیح تھی۔ ”آزمائش ختم ہوئی کہ نہیں؟“

”ہاں ہوگئی۔ اب ڈیل ہوگی۔ پہلے ہم نے بھلا کتنی ڈیمانڈ کی تھی تم سے؟“ ایاز نے

جاننے کے لیے پوچھا۔

”یہ تم جانتے ہو۔“ تیمور نے سرد لہجے میں کہا۔

”تمہاری یادداشت دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ایاز نے زیرک لہجے میں کہا۔

”دو کروڑ۔“ تیمور نے بتایا۔

دو کروڑ کا سن کر ایاز کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ حیرت سے اس کا منہ سیٹی بجانے کی شکل

اختیار کر گیا تھا۔ اس نے فوراً سنبھل کر کہا۔ ”تم پیسے پورے لے کر آئے تھے ناں؟“  
 ”ہاں۔“ تیمور نے مختصر جواب دیا۔ اسے شک پڑ رہا تھا کہ یہ وہ آواز نہیں ہے جو اس سے قبل رابطہ کرتی تھی۔

”لیکن اب میں تم سے قسطوں میں پیسے لوں گا۔ زیادہ لمبی قسطیں نہیں ہوں گی۔ صرف دو قسطیں ہوں گی۔ ایک چھوٹی اور دوسری بڑی۔“ ایاز نے کہا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔ جب میں سارا روپیہ ایک ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں تو تم مجھ سے قسطوں میں کیوں روپیہ لے رہے ہو۔ ختم کرو یہ کھیل۔“ تیمور یک دم پھٹ پڑا۔

”یہ میری مرضی ہے کہ میں کیسے بھی روپیہ لوں۔ ایک دو دن میں تمہاری بہن تمہارے پاس ہوگی اور روپیہ میرے پاس۔“ ایاز نے اسی لہجے میں کہا۔ اس بات نے ثابت کر دیا کہ یہ وہ نہیں ہے۔ ورنہ جیسے ہی تیمور اونچی آواز میں بات کیا کرتا تھا تو وہ فوراً اسے درشت لہجے میں خبردار کر دیا کرتا تھا۔

”بولو کیا چاہتے ہو۔“ تیمور نے نرم پڑ کر کہا۔

”دو لاکھ روپیہ تم ابھی لے جاؤ۔ گرین چوک میں ایک طرف پینے کے پانی کی گول ٹنکی بنی ہوئی ہے۔ وہاں ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پودا لگا کر کھلے منہ کا ڈرم اس پر رکھا ہوا ہے۔ وہاں جا کر تم پانی پینا اور دو لاکھ روپیہ اس ڈرم میں رکھ دینا۔ اس کے بعد میں اگلا حکم دوں گا۔ اس کی تعمیل پر تمہاری بہن تمہارے پاس ہوگی۔“ ایاز نے ہدایت کی۔

”کب جانا ہے مجھے وہاں؟“ تیمور نے پوچھا۔

ایاز نے یک دم کچھ سوچا اور کہا۔ ”ٹھیک ایک گھنٹہ کے بعد وہاں چلے جانا۔ کام ختم کرتے ہی وہاں سے چل پڑنا۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا ورنہ پتھر کے ہو جاؤ گے۔“

”ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گا۔“ تیمور نے کہا۔

”تمہاری پہچان کیا ہوگی۔“ ایاز نے پوچھا۔

تیمور نے کچھ ٹانٹنے کے بعد کہا۔ ”میرے ہاتھ میں سیاہ شاپر ہوگا اور اُس ڈرم میں شاہ میں ہی ڈالوں گا۔ میرے علاوہ اور کون ہوگا۔“

”اوکے۔“ ایاز نے کہا۔

”دیکھو میں اس کھیل کو طوالت نہیں دینا چاہتا۔ ختم کرو اسے۔“ تیمور نے کہا۔

”ہم کون سا اسی کام کے لیے فارغ ہیں۔ تم تیاری کرو۔ ایک بات اور تم وہ شاپر بیگ لے کر اس جگہ نہیں جاؤ گے۔ بلکہ اپنا کوئی آدمی بھیجو گے۔ کوئی آدمی... جو تمہارا ملازم ہو سکے۔“

ہے۔ پولیس والا نکلا تو گولی جب چل کر تمہاری بہن کے سر میں چھید بنائے گی تو تمہیں آواز نہیں آئے گی۔ صرف خبر پہنچے گی۔“ ایاز نے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ تیمور نے سوچا کہ یہ وہ نہیں ہے۔ اگر یہ وہی ہوتا تو پہلے اپنی ساتھی کی موت کا غصہ اس پر نکالتا، اس کی بہن کو مار دینے کی دھمکی دیتا، اسے ڈراتا، لیکن اس نے کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ تیمور نے مزید سوچا کہ اس کا مطلب ہے، نازی ان کے چنگل سے بھاگی ضرور تھی لیکن اب وہ کسی اور کی گرفت میں ہے لیکن کسی ایسے شخص کے پاس ہے جو اسے جانتا ہے۔

ایاز نے عین وقت پر کوئی اور آدمی اس جگہ لانے کا فیصلہ اس لئے کیا تھا تا کہ طارق اگر تیمور کو جانتا ہے تو اسے بھگ نہ لگ جائے۔ ورنہ وہ اس کے لیے مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔

”میرے ہاتھوں اب یہ دوسرا شکار ہوگا۔“ تیمور نے کہا اور دلبر کو فون کر کے فوراً اُسے گھر پہنچنے کی تاکید کی۔

جبکہ ایاز نے موبائل فون بند کرنے کے بعد اپنے آپ سے کہا۔ ”ذرا دیکھو تو سہی پیسے دینے میں یہ خود کتنا مخلص ہے۔“

اس کے بعد ایاز نے طارق کو فون کر دیا۔ جیسے ہی رابطہ ہوا ایاز نے کہا۔ ”کیسے ہو پیارے طارق۔“

”تم...؟ تم کہاں سے بول رہے ہو؟“ طارق کی آواز گونجی۔

”اس کی فکر چھوڑو کہ میں کہاں سے بول رہا ہوں۔ اپنے دو لاکھ روپے وصول کرو۔“ ایاز نے کہا۔

”لاؤ میرے پیسے... کہاں ہو تم؟ پیسے دینے کے لیے تم میرے پاس آتے ہو یا میں آؤں؟“ طارق نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

”بے صبرے مت بنو۔ روپیہ تمہارے پاس خود چل کر آ رہا ہے۔“ ایاز نے ایک ادا سے کہا۔

”کیا بات ہے۔ کوئی لائٹری لگ گئی ہے یا مجھے چونا لگا رہے ہو؟“ طارق نے پوچھا۔

”چونا لگانے کا وقت گیا۔ میری بات غور سے سنو۔ تمہاری دکان کے سامنے سڑک پار کر کے ایک طرف کٹڑ میں جو پانی کی ٹنکی ہے۔“ ایاز نے کہنا شروع کیا۔

”کیا اس ٹنکی میں روپیہ ہے؟“ طارق نے بلاتامل پوچھا۔

”یا تو میری بات سن لو یا صرف تم بول لو۔“ ایاز نے کہا۔

ایاز کا لہجہ ایسا تھا کہ طارق کا غصہ یک دم کا فور ہو گیا تھا اور وہ اس کی بات غور سے سننے

لگا تھا۔ ”اچھا اچھا تم بولو۔“

”ابھی ایک گھنٹے کے اندر ایک ایسا شخص آئے گا۔ جس کے ہاتھ میں سیاہ شاپریک ہوگا۔ وہ اس شکی سے پانی پیئے گا اور دائیں بائیں دیکھ کر وہ شاپریک پودے کے ارد گرد رکھے ہوئے ڈرم میں رکھ دے گا۔ وہ وہاں سے چل پڑے گا۔ تم تسلی کر کے وہ شاپریک اٹھا لینا۔ اس میں تمہارے دو لاکھ روپے ہوں گے۔ تمہارا اور میرا حساب چکلتا ہو جائے گا۔“ ایاز نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”کسی کو بلیک میل کر رہے ہو؟“ طارق نے پوچھا۔

”تمہیں اس سے کیا۔ تم اپنا پیسہ وصول اور اپنی راہ لو۔“ ایاز نے کہا۔

”میں اس طرح پیسہ نہیں لوں گا۔ اس ڈرم سے تم خود وہ شاپریک لے کر میری ٹیبل پر رکھ کر اپنی راہ لینا۔“ طارق نے اطمینان سے کہا۔

”ڈرگے ہو کہ کوئی چکر نہ ہو۔ بزدل ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”میں ڈرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ یہ تمہارا کام ہے۔ تم ہی کرو گے۔“ طارق نے کہا۔

”ٹھیک ہے پھر تم انتظار کرو۔ دیکھتے ہیں کہ اگلی ملاقات کب ہوتی ہے۔ میں اُسے کہیں اور بلا لیتا ہوں۔“ ایاز نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

”میں تمہاری ہڈی پیلی ایک کر دوں گا۔“ طارق نے دانت پیس کر درشت لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں ملوں گا تو میری ہڈی پیلی ایک کرو گے۔ اب میں پہلے والا ایاز نہیں رہا ہوں۔ پاورفل لوگوں سے مل گیا ہوں۔ یہاں کمزور کو ہمیشہ طاقت والا کھاتا ہے۔ اس لئے

میں نے سوچا کہ کسی کا نوالہ بننے کی بجائے خود نوالہ کھانے کے قابل ہو جاؤں۔ دل کرے تو مجھے فون کر لینا۔ ورنہ ہمیشہ کے لیے ان پیسوں سے بھی جاؤ گے اور تم میرا کچھ بگاڑ بھی نہیں پاؤ گے۔ پرانی دوستی کی وجہ سے تمہیں اپنے ذرائع سے روپیہ پہنچا رہا ہوں۔ ورنہ تم انتظار ہی

کرتے رہ جاتے۔“ ایاز نے اس انداز میں کہا کہ طارق کو لگا کہ وہ واقعی اب بدل گیا ہے۔ کسی بکری کے بچے کی طرح آواز والے ایاز کے حلق سے شیر کی نہیں تو کسی ایسے جانور کی آواز

ضرور آرہی تھی جو قوت کا مالک تھا۔

ایاز نے فون بند کر دیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ طارق اسے فون کر کے اپنی رضامندی کا اظہار ضرور کرے گا۔ کیونکہ وہ پیسے کے معاملے میں دیمک کی طرح تھا۔ اس کتے کی مانند تھا

جو ایک ہڈی کے لیے اپنی ہڈی تڑوانے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔

ایسا ہی ہوا۔ طارق کا فون آ گیا تھا۔ اس نے رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ ایاز نے اُسے بتایا کہ کیسے پیسہ لینا ہے اور پھر کہا۔ ”تمہارے ساتھ چار دن اچھے گزرے ہیں۔ اس لئے تمہیں پیسہ لوٹا رہا ہوں۔ ورنہ میں تمہارے سامنے بھی آ جاتا تو تمہارے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ تم میری جیب سے ایک روپیہ بھی نکلوا سکتے۔“

رابطہ منقطع کرنے کے بعد، ایاز نے بہانے سے اماں کو نازی کے پاس سے اندر بھیجا اور نازی سے کہا کہ وہ اس کے لیے فون کا انتظام کرنے جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی پتہ چلائے گا کہ اس کے بھائی کے کیا حالات ہیں۔

ایاز نے نشی سے بہانہ کر کے جیب لی اور وہاں سے چل پڑا۔ نشی نے اس کی ہدایت کے مطابق نہ صرف نازی سے یہ کہہ دیا تھا کہ تمام فون بند ہیں بلکہ انہیں متفصل بھی کر دیا تھا۔

☆=====☆=====☆

حماد نے اُس جگہ آ کر جہاں اُسے نواز نے بلایا تھا، رک کر دائیں بائیں دیکھا۔ نواز یک دم ایک جنرل اسٹور سے باہر نکلا اور حماد کو اشارہ کر کے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ وہ خود تیز تیز قدم اٹھا کر چلتا جا رہا تھا۔

بائیں گلی میں ایک مارکیٹ بنی ہوئی تھی۔ بنانے والے نے تو اس لئے بنائی تھی کہ وہ مارکیٹ کھلے گی، اس جگہ اچھی دکانیں بنیں گی لیکن اس کے برعکس ہوا۔ کیونکہ وہ مارکیٹ بازار سے اندر ایک گلی کی طرف تھی۔ اس لئے لوگوں نے ان دکانوں کو اپنا گودام بنالیا تھا۔ جو اکثر ضرورت کے وقت کھلتی اور بند ہو جاتی تھیں۔ ورنہ تو اس جگہ ویرانہ پڑا رہتا تھا۔

نواز اس مارکیٹ میں چلا گیا۔ یک دم ایک طرف سے جمال نکل کر بھی نمودار ہو گیا تھا۔ حماد کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ اُس نے دونوں کی طرف دیکھا۔ تینوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔

”کیا ہوا تھا؟“ جمال نے پوچھا۔

”مجھے تو خود نہیں پتہ چلا کہ کیا ہو گیا ہے۔ چار پانچ آدمی ایک ساتھ اندر آئے۔“ حماد نے کہنا شروع کیا۔

”دروازہ کھلا ہوا تھا؟“ جمال نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ پہلے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور وہ دروازہ دھکیل کر اندر آ گئے۔ ایک نے مجھے پکڑ لیا۔ باقی آگے بڑھے اور لڑکی کو کھول کر باہر لے آئے۔“



مجھے زور سے اُنہوں نے دھکا دیا۔ میں دیوار سے لگا اور میرا سر پھٹ گیا۔“ حماد نے صفائی سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

جمال اور نواز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ”کون تھے؟ کچھ پتہ ہے۔“

”پتہ نہیں۔“ حماد نے نفی میں گردن ہلائی۔

”پولیس والے تھے کیا؟“ نواز نے سوال کیا۔

”شاید وہ ہوں.....“ حماد نے آہستہ سے کہا۔

”اگر وہ ہوتے تو تجھے کیسے چھوڑ گئے؟“ جمال نے اس کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھا۔

”میں نے کب کہا کہ وہ پولیس والے ہوں گے۔ میں نے شاید کہا ہے۔“ حماد نے کہا۔ وہ گڑ بڑا گیا تھا۔

”تم کیا کہتے ہو نواز؟“ جمال نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کسی کے کانوں کا خبر نہیں تھی کہ ہم اس جگہ ہیں۔ اس لئے کوئی اس جگہ آکر لڑکی کو لے گیا۔ سمجھ سے بالاتر ہے۔“ نواز نے کہا۔

”وہ رقم لے کر پہنچ گیا تھا۔ ایک بڑی رقم ہمارے ہاتھ آنے والی تھی اور تم نے سارا ستیاناس کر دیا۔“ جمال نے ذانت پیسے۔

”میں نے ستیاناس کیا ہے؟“ حماد نے کہا۔

”اُس نے جانتے ہو کیا کیا ہے۔ وہ جو لڑکی ہمارے ساتھ تھی اسے گولی مار دی ہے۔“ نواز نے اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”گ...و...لی... مار دی ہے۔“ حماد کے لیے یہ انکشاف حیران کن ہی نہیں خوفناک بھی تھا۔ اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

”کیونکہ اسے خبر مل چکی تھی کہ وہ آزاد ہو گئی ہے۔ اس نے اس کا فائدہ اُٹھایا۔ ہم اس جگہ سے بھاگ گئے تھے۔ ورنہ ہم میں سے کوئی اس کے ہاتھ چڑھ جاتا تو شاید... ہم بھی خبر کا حصہ ہوتے۔“ جمال نے کہا۔ اسے تاسف تھا۔ وہ بار بار بے چینی سے اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔

”آ...پ... پتہ کیسے پتہ چلا کہ اس نے لڑکی کو مار دیا ہے۔“ حماد نے پوچھا۔

”نواز نے نیوز چینل دیکھا ہے۔“ جمال نے کہا۔

”وہ پکڑا گیا ہے کیا؟“ اس نے پوچھا۔

جمال نے اس کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہو گئی فکر.... آزاد ہے

وہ... مار کر بھی اس نے کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا کہ اس نے کچھ کیا ہے لیکن اس نے ہمیں خبردار کر دیا ہے کہ اس کی کاپی میں ہمارے لئے کوئی چھوٹ نہیں ہے۔“

”چلیں یہاں سے۔“ نواز نے کہا۔

”ہاں... میں بھی چلتا ہوں۔ ابھی ہمیں ایک دوسرے سے الگ رہنے کی ضرورت ہے۔“ حماد نے جلدی سے کہا۔

جمال نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اب ہم الگ الگ نہیں رہیں گے۔ تم ہمارے پاس اور ساتھ رہو گے۔ جب تک وہ لڑکی ہمارے ہاتھ دوبارہ نہیں آ جاتی۔“

”سک... کیا مطلب ہے؟“ حماد نے کہا۔

”مطلب بھی سمجھا دیتے ہیں۔ ہمارے ساتھ چلو۔“ نواز نے کہا اور اُسے مزید بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جمال اور نواز نے حماد کو ایک رکشہ میں بٹھایا اور سیدھا شارکلب میں سکندر کے پاس لے گئے۔

حماد کو ایک کمرے میں چھوڑ کر پہلے سکندر اور ناصر کے گوش ہر بات اُنہوں نے گزار دی اور پھر کہا۔ ”اب بتاؤ یہ چکر کیا ہے۔“

”چکر چل گیا تو ہمارے پاس آگئے ہو۔“ ناصر نے سیخ پا ہو کر کہا۔ ”اس لڑکی کو اغوا کر کے یوں اس جگہ سے چلے گئے تھے جیسے ہمارا سایہ اس کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ جب ہم نے مدد کی پیشکش کی تو ہمیں کہا گیا کہ اپنے پیسے سے مطلب رکھو... اور اب آگئے ہو اس چکر کا پتہ چلانے کے لیے؟“

”ناصر بھائی جو ہونا تھا وہ ہو گیا... اب آگے کی بات کرو۔“ نواز نے کہا۔

”آگے کی بات یہ ہے کہ ہمیں ہمارا پیسہ دو۔ اسی وقت... جو وقت ہم نے تمہیں دیا تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔“ ناصر کا غصہ ختم نہیں رہا تھا۔

”جانے دو ناں ناصر بھائی۔ اس طرح مسئلہ حل تو نہیں ہوگا۔“ جمال نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں... اب مہلت ختم۔“ ناصر اپنی بات پر بضد ہو گیا تھا۔

”اسے سمجھاؤ سکندر بھائی۔“ نواز نے سکندر کی طرف دیکھا۔

”ناصر سمجھ جاؤ... بچے ہیں۔“ سکندر نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”ایک تو آپ بھی فوراً مان جاتے ہیں۔“ ناصر نے کہا۔ ”جاننے نہیں ہو یہ کس طرح

سے ہم سے بھاگے تھے۔“

”فائدہ نظر آرہا ہو تو بات مانتی پڑتی ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”اُسے اندر بلاؤ۔“

حماد بھی ان کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ سکندر اور ناصر کی شکلیں دیکھ کر ہی اُسے خوف آرہا تھا۔ پہلی بار اُسے احساس ہوا تھا کہ اس نے ایک باعزت زندگی سے جرم کی دلدل میں طمع کے جوتے پہن کر جو قدم رکھا تھا، وہ غلط تھا۔ اُس نے شارٹ کٹ کے لیے اپنی دانست میں محفوظ راستہ دیکھا تھا کہ پیسے لے کر وہ ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائے گا لیکن پیر پھلتے ہی کل کا کیا ہوا فیصلہ بچھتا وہ بن گیا تھا۔

”تو تم ہو منصوبہ ساز۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر اس نے جمال کی طرف دیکھا۔ ”ویسے میں داد دوں گا تم دونوں کو... اصل منصوبہ تو تم دونوں نے بنایا تھا۔“

”جب لڑکی کو اغوا کرنے کی بات چلی اور پتہ چلا کہ وہ کون ہے تو فوراً اس کی باتیں یاد آ گئیں۔ اس نے ایک بار ان کا ذکر کیا تھا۔ سوچا اسی سے منصوبہ بنواتے ہیں۔ کل کو ضرورت پڑی تو اسے ٹیڑھا بھی کر لیں گے۔ ورنہ ہم اسے اپنے ساتھ کیوں شامل کرتے۔“ نواز نے کہا۔

سکندر ہنسا۔ ”اب آگیا ہے وقت اسے ٹیڑھا کرنے کا... نکال لو گھی۔“

حماد ان کی طرف دیکھ کر گھبرائے جا رہا تھا۔ کچھ خاموشی کے بعد سکندر نے کہا۔ ”اس لڑکی کو اس نے آزاد کیا ہے۔“

”ہمارا بھی یہی خیال ہے۔“ جمال نے اس کی تائید کی۔ حماد نے مزید گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔

”میں اسے کیوں آزاد کرتا۔“ حماد نے گھبرا کر کہا۔

”ہم سے ایک غلطی اور ہو گئی تھی۔ اس کی بجائے اگر ہم دونوں میں کوئی اس جگہ رہ لیتا تو وہ اچھا تھا۔ ہم اس کی باتوں میں آگئے تھے اور اس وقت کوئی فیصلہ بھی نہیں کر سکے۔“ جمال نے ایک بار پھر تاسف آمیز لہجے میں کہا۔

”تم دونوں نے اس لڑکی کو اس سے چھپا کر رکھا تھا لیکن تم دونوں کے جانے کے بعد اس نے دیکھ لیا... کس طرح... یہ جانتا ہے۔ تب اسے پتہ چلا کہ اس کی لاعلمی میں کسے اغوا کیا ہوا ہے۔“ سکندر نے کہا۔ حماد نے تھوک نکل کر اپنا حلق تر کیا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ پھر بولا۔ ”اس نے خود کو زخمی کیا اور لڑکی کو بھگا دیا یا خود کہیں چھوڑ دیا... آگے کی بات یہ بتائے گا۔“

”م... کیا بتاؤں... اور آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ کون تھی جسے آپ نے اغوا کیا

تھا۔“ حماد نے مزید پریشان ہونے کی اداکاری نہیں کی تھی۔ کیوں کہ وہ سکندر کی بات سن کر ہی پسینے سے نہا گیا تھا۔

”ہم اُڑتی چیزیا کے پرگن کر بتا دیتے ہیں کہ اس کی پرواز کہاں تک ہوگی۔“ سکندر نے اطمینان سے کہا۔ ”اُس مچھلی کی طرح مت تڑپو جو پانی سے باہر نکل آئی ہو۔ اچھے بچوں کی طرح بتاؤ کہ تم نے کیا کیا تھا؟“

”میں نے کیا کرنا تھا۔ میں جو بھی کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے۔“ حماد نے کہا۔

”نہیں یہ سچ نہیں ہے۔“ سکندر کے لہجے میں کوئی تغیر نہیں تھا۔

”جمال... نواز... تم بتاؤ کیا میں نے تم لوگوں کے ساتھ خلص ہو کر کام نہیں کیا۔“ حماد نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا لیکن اس وقت تک جب تک تم نے لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔“ ان دونوں کی بجائے سکندر نے جواب دیا۔

”کون لڑکی تھی وہ... مجھے آپ پریشان کر رہے ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ لڑکی کون تھی۔ بتاؤ جمال کون تھی وہ؟“ حماد نے تکرار کرتے ہوئے کہا۔

”تم نہیں جانتے تھے کہ وہ کون لڑکی تھی؟“ سکندر نے پوچھا۔ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے کوئی کسی کو سرد خانے میں پہنچا دے۔ جیسے دوسرے کی رگوں میں خون جمادے۔

”نہیں۔“ حماد نے کہا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

”ناصر...“ اچانک سکندر نے اسے مخاطب کیا۔ ناصر فوراً آگے بڑھا۔ ”یہ تمہارا کیس ہے۔ اس کی ہڈی تو زرد... اسے اپنا بیچ بنا دو... کچھ بھی کرو... ایک بار سچ اس کے منہ سے نکلا دو تا کہ جمال اور نواز یہ نہ کہہ سکیں کہ جب ہم نے سکندر سے مدد مانگی تو وہ بھی ہمارے لئے کچھ نہیں کر سکا۔“ سکندر کا لہجہ اتنا خطرناک اور سفاک ہو گیا تھا کہ حماد کو اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ ناصر کو ایسے موقع کی تلاش رہتی تھی۔ وہ زبان کا ہی تیز نہیں تھا، اس کا ہاتھ بھی اٹھنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔

حماد کے لئے یہ صورت حال بہت پریشان کن اور خطرناک تھی۔ وہ ایسا جرائم پیشہ تو تھا نہیں کہ ایسی باتوں کی پرواہ ہی نہ کرے۔ اپنے سچ یا جھوٹ کے موقف پر ڈٹا رہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ان کے درمیان چھس گیا ہے۔ وہ ان لوگوں کا مقابلہ کرنے کی کوئی سکت نہیں رکھتا ہے۔ اسے اس سنگینی کا اندازہ نہیں تھا۔ اس لئے جیسے ہی ناصر اس کی طرف بڑھا اُس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک منٹ... رک جاؤ... میں سچ بتاتا ہوں۔“

سکندر نے اشارہ کیا اور ناصر اسی جگہ رک گیا۔ ”ہاں بتاؤ۔“  
 ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے کس لڑکی کو اغوا کیا ہے۔ مجھے تو روپے چاہیے تھے۔  
 میں نے پیسوں کے لیے ہی ان سے رابطہ جوڑا تھا.....“ حماد نے کہنا شروع کیا۔  
 ”ہمیں ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آگے کی بات بولو۔“ سکندر نے اُسے ٹوک دیا۔

”ان کے جانے کے بعد جیسے ہی میں نے اس لڑکی کو دیکھا میں دنگ رہ گیا۔ میرے تصور میں بھی ایسی بات نہیں تھی۔ میں کم از کم اس گھرانے کے لیے ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی شکل اس پر ظاہر کئے بغیر لڑکی کے ہاتھ پاؤں کھول کر آزاد کر دیا۔“ حماد نے صاف صاف بتا دیا۔

”کیوں۔“ سکندر نے زعم سے جمال اور نواز کی طرف دیکھا۔ جیسے یہ باور کر رہا ہو کہ میرا اندازہ ٹھیک تھا کہ نہیں۔ پھر وہ حماد کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم جانتے ہو کہ تمہارا اس گھرانے کے ساتھ کیا تعلق ہے؟“

”ہاں جانتا ہوں۔ اسی لئے تو ایسا کرنے پر مجبور ہوا۔“ حماد نے کہا۔ اس نے گردن جھکا لی تھی۔

”کہتے ہیں گھی اگر سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو اُسے ٹیڑھا کرنا پڑتا ہے۔ تیور کے گھر میں تم ہی جاسکتے ہو۔ اس لڑکی کو تم ہی واپس ہم تک لاسکتے ہو۔ یہ اچھا کیا کہ تم نے اپنی شکل اس پر ظاہر نہیں کی لیکن اگر تم نے وہ لڑکی ہم تک نہ پہنچائی تو ہم تمہاری شکل اس گھرانے پر ظاہر کر دیں گے۔ جانتے ہو پھر کیا ہوگا۔ سنا ہے کہ تیور کا ہاتھ بہت بھاری ہے۔“ سکندر نے کہا اور بے خیالی میں اس کا اپنا ہاتھ اپنی گال پر چلا گیا لیکن جیسے ہی اُسے احساس ہوا تو اُس نے جلدی سے اپنا ہاتھ اپنی گال سے کھینچ لیا۔

حماد جیسے جیسے اس کی بات سن رہا تھا اس کی سانس تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دل کی دھڑکن مضطرب ہو رہی تھی۔ گھبراہٹ اور خوف کی تپش سے اس کی آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔ وہ بولا۔  
 ”میں.... بیشاید یہ کام نہ کر سکوں۔“

”شاید کہ یقیناً؟“ سکندر نے تصحیح چاہی۔

”میں یہ کام نہیں کر سکتا۔“ اس بات کے باوجود کہ اس کے جسم کے انگ انگ میں خوف دوڑ رہا تھا، اس نے صاف انکار کر دیا۔

”یہ لوگ بتا رہے تھے کہ جب تم اس لڑکی کے اغوا کا منصوبہ ان کو بتا رہے تھے تو انہوں

نے خفیہ کمرے سے تمہاری ویڈیو بھی بنائی تھی۔ کیا وہ ویڈیو ہم تیور کو بھیج دیں؟“ سکندر نے اس کے پاس ہو کر برے پراسرار لہجے میں کہا۔

”آ..... آ..... آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“ حماد نے کہا۔

”ہم وہی کرتے ہیں جس کی دوسرا امید بھی نہیں کرتا۔“ سکندر نے کہا۔

”ایسا مت کرنا.... ورنہ.... ورنہ.... بہت کچھ ہو جائے گا۔“ حماد مزید خوفزدہ ہو گیا تھا۔

”یہ ہم جانتے ہیں کہ اس بات سے ایک آگ لگ جائے گی۔ بہت کچھ بکھر جائے گا۔

رشتے ٹوٹ جائیں گے۔ تمہارا رشتہ اس گھر سے خاص رشتہ ہے۔ کچھ نہیں بچے گا۔“ سکندر

نے کہا۔ حماد اس تصور سے ہی کانپ گیا۔ وہ پھر بولا۔ ”چپ چاپ ہمارا یہ کام کر دو۔ اس لڑکی

کو اس طرح سے ہمارے حوالے کر دو.... کوئی منصوبہ بنا کر کہ تمہارا نام نہ آئے۔ باقی ہم

سنجال لیں گے۔ ہمیں بس ایک بڑی رقم چاہیے۔ کوئی خون خرابہ نہیں ہوگا۔“ سکندر نے کہا۔

حماد کے لیے اقرار اور انکار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ دونوں طرف موت تھی۔ وہ سوچنے لگا

اور پھر بولا۔ ”مجھے ایک دن سوچنے کے لیے دے دو۔“

”دنوں کی نہیں اب بات ہے گھنٹوں کی.... تم سوچ لو.... چند گھنٹے ہم سے لے لو.... ہم

تمہارے آرام اور طعام کا بندوبست کر دیتے ہیں۔“ سکندر نے کہا۔

حماد نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ روئے.... اور اس وقت کو کو سے جب اس

نے اپنی قناعت سے پاؤں باہر نکال کر ان لوگوں سے ہاتھ ملایا تھا۔ تیور، عشرت اور نازی

سے اس کا ایک رشتہ تھا۔ ایک نازک رشتہ.... وہ رشتے اس کی مٹھی میں ریت کی طرح ہو گئے

تھے۔ وہ کچھ کھونا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن جو اس کے پاس تھا، اُسے قائم رکھنا بھی مشکل ہو رہا

تھا۔

سکندر نے اُسے بلایا اور پوچھا۔ ”کہاں کھو گئے ہو؟“

”کہیں نہیں۔“ حماد نے کہا۔

”اس دروازے سے باہر جانا اب تمہارا اس حال میں ممکن ہوگا جب تم ہماری بات مانو

گے۔ ورنہ ایک ایسا طوفان آئے گا، جس میں سب کچھ بہہ جائے گا۔“ سکندر نے کہا۔ اس

نے باہر سے ایک آدمی بلایا اور اُسے حکم دیا کہ وہ اسے لے جائے۔

حماد دوسرے کمرے میں کسی قیدی کی طرح بے بس اور لاچار بیٹھا تھا۔ سکندر کو جہاں

جمال اور نواز کے ذریعے سے پیسہ چاہیے تھا، وہاں وہ تیور سے اپنا بدلہ لینے کی ٹھان کر بھی

بیٹھا تھا۔ اس لئے اس نے جمال اور نواز کا ہاتھ دینا منظور کیا تھا۔ جمال اور نواز کے کندھے

کو وہ اچھی طرح سے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

☆=====☆=====☆

دلبر کو تیمور نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ دلبر اس کا خاص آدمی بھی تھا اور اس کے دوسرے بہت سارے کاروباری معاملات میں راز داں بھی تھا۔ وہ اس کے ساتھ اپنی جان سے بھی زیادہ مخلص تھا۔ اُس نے ساری بات اطمینان سے سنی اور اگلے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

تیمور نے اُسے سیاہ شاپر جو کہ پیسوں کے اوپر پلینا ہوا تھا، دیا اور بتانے لگا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ دلبر نے ساری بات غور سے سنی اور اس کی ہدایت پر گھر سے باہر نکل گیا۔ اگلے چوک سے اس نے ٹینکی لی اور جس جگہ وہ ٹینکی تھی، اس سے ایک چوک پہلے ہی اتر گیا۔

دلبر پیدل ہی ٹینکی کی طرف جا رہا تھا۔ ٹینکی کے سامنے طارق کی دکان تھی۔ اس کی نگاہیں اس ٹینکی پر مرکوز تھیں۔ وہ ہر اُس شخص کو غور سے دیکھ رہا تھا جو بھی اس جگہ سے پانی پیتا تھا۔ کسی نے بھی سیاہ شاپر اس ڈرم میں نہیں ڈالا تھا۔

طارق کی دکان سے کچھ ہی دور ایاز بھی اپنی جیب میں بیٹھا ٹینکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جبکہ تیمور ایک ایسی جگہ پر کھڑا تھا جہاں سے وہ اس چوک کو پوری طرح سے اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے تھا۔

دلبر پیدل ہی اس ٹینکی تک پہنچا۔ اُس نے ڈرم کے ساتھ کھڑے ہو کر پانی کا آدھا گلاس پینے کے دوران نظر گھما کر دائیں بائیں دیکھا اور گلاس نیچے رکھتے ہی ہاتھ میں پکڑا شاپر اس ڈرم میں ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ آگے چل پڑا۔ اُس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ تیمور کی ہدایت کے مطابق اگلے چوک سے مڑتے ہی دیوار کے ساتھ لگے اخبارات اور رسائل کے اشال پر کھڑا ہو گیا تھا۔

ایاز جیب میں بیٹھا سب دیکھ رہا تھا۔ اُس نے چاروں طرف اپنی نگاہیں گھمائیں، اسے کوئی بھی ایسا دکھائی نہ دیا جس کی توجہ اس ڈرم کی طرف ہو۔ پھر اس نے طارق کی دکان کی طرف دیکھا۔ اس کا شیشے کا دروازہ بند تھا۔ اندر سے کوئی بھی باہر نہیں نکلا تھا۔

طارق نے دیکھا تھا کہ وہ شخص شاپر ڈرم میں ڈال کر چلا گیا ہے۔ چار، پانچ منٹ گزر گئے تھے۔ طارق نے اُٹھ کر دروازے کے پاس جا کر پہلے دائیں اور پھر بائیں دیکھا۔ پھر اُس نے اپنے ملازم کو آواز دے کر جیب سے پیسے نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔

”یہ لے... ایک پان لے کر آ۔“

”بہتر۔“ اس نے کہا۔ وہ اس کا سادہ لوح ملازم تھا۔ وہ جانے لگا تو طارق نے پھر

روک لیا۔

”بات سن چھندے.... پان اسی دکان سے لے کر آنا جہاں سے روز لے کر آتا ہے۔“

”یہ کوئی بتانے والی بات ہے۔“ چھندے نے دانت نکال کر کہا۔

”جلدی جا۔“ طارق کی نگاہیں اس ڈرم کی طرف تھیں۔ اس نے پھر روک لیا اور بولا۔

”ایک بات اور سن... وہ ڈرم دیکھ رہا ہے سامنے۔“

”وہ جو ٹینکی کے پاس پڑا ہے۔“ چھندے نے اس طرف دیکھ کر کہا۔

”ہاں وہی.... اس ڈرم میں کوئی چیز ڈال کر چلا گیا ہے... کالا شاپر ہے... وہ اُٹھا کر لاؤ۔“

ذرا دیکھیں اس میں کیا ہے۔“ طارق نے کہا۔

”رہنے دیں... آج کل بم بڑے پھٹ رہے ہیں۔“ چھندے نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

”اُس میں بم نہیں ہے۔“ طارق نے کہا۔

”آپ کو کیسے پتہ ہے؟“ چھندے نے اس کی طرف دیکھا۔

”تم اتنے سوال نہ کیا کرو اور جاؤ جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔“ طارق نے اکتاہٹ

آمیز لہجے میں کہا۔

”ابھی جاتا ہوں۔“ چھندے نے کہا۔

”بات سن۔“ طارق نے پھر روک لیا۔ ”پہلے پان لینا ہے... اس کے بعد اسی جگہ سے

مڑ کر اس کے ڈرم کے پاس چلے جانا اور شاپر نکال لینا۔“

”پہلے شاپر نکال کر لاتا ہوں۔“ چھندا بولا۔

”جیسا میں نے کہا ہے ویسا کر۔“ طارق نے کہا۔

”ویسا ہی کر لیتے ہیں۔“ چھندے نے کہا اور پھر جانے لگا تو طارق نے روک لیا۔

”شاپر لے کر یہاں نہ آنا۔ سیدھا اپنے گھر چلے جانا۔ میں تمہارے گھر ہی آتا ہوں اور

شاپر کھولنا نہیں ہے۔ سمجھے۔“ طارق نے کہا۔

”میں کیوں کھولوں گا۔“ چھندے نے کہا۔ اس کا گھر اس جگہ سے چند گلیاں چھوڑ کر

تھا۔ اس گھر میں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ کسی گاؤں میں رہائش پذیر تھے اور وہ

ایک عرصے سے طارق کے پاس ملازم تھا۔ وہ چھوٹا سا گھر طارق نے ہی اسے رہنے کے لیے

دیا تھا۔ دراصل اس جگہ طارق کچھ ناجائز سامان وغیرہ رکھتا تھا۔

”اب تم جاؤ۔“ طارق نے کہا۔ اس کی نظریں اس ڈرم پر تھیں۔

”پہلے شاپر لانا ہے اور پھر پان....“ چھندے نے دہرایا۔

”بے وقوف پہلے پان لینا ہے اور اس کے بعد شاپر نکال کر تم اپنے گھر چلے جاؤ گے اور شاپر کو سنبھال کر رکھنا ہے۔ کسی کو دینا نہیں ہے اور نہ ہی کھونا ہے۔“ طارق نے ایک ایک لفظ اس کے کان میں ڈرا پس کی طرح ڈالتے ہوئے کہا۔

”ایسا ہی کہا ہے میں نے۔“ چھندے نے کہا۔

”تم نے ایسا نہیں کہا تھا۔“ طارق بولا۔

”کچھ اور کہہ دیا تھا میں نے؟“ اس نے طارق کی طرف دیکھا۔

”یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے کام کر کے آؤ۔“ طارق نے کہا۔ ”اور یہ بات یاد رکھنا۔ پان والے بکے پاس ہی نہ بیٹھ جانا۔“

”میں فارغ ہوں کہ اس کے پاس جا کر بیٹھ جاؤں گا۔ مجھے آپ نے اتنے کام بتائے ہیں۔“ چھندے نے کہا۔

چھندا باہر نکلا تو ایاز نے فوراً اس کی طرف دیکھا اور جب وہ ڈرم کی طرف جانے کی بجائے دوسری سمت چل پڑا تو اُسے حیرت ہوئی کہ طارق نے ابھی تک اس ڈرم کا رخ کیوں نہیں کیا ہے۔ اس کی دانست میں تو طارق کو اس کتے کی طرح بھاگ کر جانا چاہیے تھا جو ہڈی دیکھ کر پاؤں کی زمین چھوڑ دیتا ہے۔

چھندا پان والے کی دکان پر جا کر کھڑا ہی ہو گیا تھا۔ پان والا کسی کا پان لگا رہا تھا اور چھندا اُسے پان لگاتے ہوئے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس نے یہ کام سیکھنا ہے۔ طارق اپنی جگہ مضطرب تھا کہ چھندا کیوں نہیں آیا۔ ایاز تب پریشان ہو گیا تھا جب اس کی نگاہ اس میلے کیلے لڑکے پر پڑی تھی جس کی کمر پر پلاسٹک کی بوری تھی۔ جو پھولی ہوئی تھی۔ وہ لڑکا جگہ جگہ رک کر کاغذ پلاسٹک، اور جو اس کے مطلب کی چیز دکھائی دے رہی تھی، وہ اٹھا کر بوری میں ڈالے جا رہا تھا۔ اس کے قدم رفتہ رفتہ اس ڈرم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس سے قبل جو دو ڈرم اس کے راستے میں آئے تھے وہ بھی اس نے اچھی طرح سے دیکھے تھے۔ ایک ڈرم سے اسے کچھ ملا بھی تھا جو کہ اس نے ڈرم کے اندر سے نکال کر اپنی بوری میں منتقل کر لیا تھا۔

اس لڑکے پر طارق کی بھی نگاہ پڑ گئی تھی۔ چھندا تھا کہ پان والے کے پاس ہی جا کر سو گیا تھا۔ ایاز اور طارق اپنی اپنی جگہ مضطرب ہو گئے تھے۔ ایاز سوچ رہا تھا کہ اگر طارق اس ڈرم تک نہ پہنچا تو وہ شاپر اس لڑکے کے ہاتھ لگ جائے گا۔ جبکہ طارق اس لئے بے چین ہوئے جا رہا تھا کہ چھندے سے پہلے اگر اس لڑکے کی نگاہ شاپر پر پڑ گئی تو اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

تیور دیکھ رہا تھا کہ کوئی بھی اس ڈرم کی طرف نہیں گیا۔ اس کا دھیان اس لڑکے کی طرف نہیں گیا تھا۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ آخر کوئی اس ڈرم سے وہ شاپر کیوں نہیں اٹھا رہا ہے۔ وہ لڑکا اور آگے بڑھ گیا تھا۔ اس ڈرم سے وہ کچھ ہی فاصلے پر تھا اور ایک جگہ رک کر کوڑے کے لگے ڈھیر سے اپنے مطلب کی چیزیں متلاشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ اس میں پھیر بھی رہا تھا۔ اس طرح کرتے ہوئے اس نے کوڑا بکھیر بھی دیا تھا۔

جب لڑکے کو اس میں سے جو اس کی مرضی کی چیزیں تھیں، مل گئیں۔ وہ آگے چل پڑا۔ ڈرم کا فاصلہ اب تھوڑا ہی رہ گیا تھا۔ طارق بار بار اس طرف دیکھ رہا تھا جدھر سے چھندے کو آنا تھا۔ ایاز کی نگاہیں طارق کی دکان کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں کہ وہاں سے کوئی کیوں نہیں نکل رہا ہے۔

اچانک چھندا خراماں خراماں چلتا نمودار ہوا۔ طارق کی جان میں جان آئی لیکن اس کی چلنے کی رفتار اس قدر دھیمی تھی کہ وہ لڑکا اس ڈرم کے پاس پہلے پہنچ سکتا تھا۔ طارق کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔ چھندا پانی کی ٹنکی کے پاس پہنچا تو لڑکا سیدھا ڈرم کے پاس جا پہنچا۔ طارق کا دل زور سے دھڑکا کہ اب وہ شاپر اس میں سے نکال لے گا۔ ایاز نے بھی یہ سوچ لیا تھا کہ وہ شاپر لڑکے کے ہاتھ لگ جائے گا۔ جب لڑکا ڈرم کے پاس پہنچا تو تیور بھی چونک پڑا تھا۔

لڑکے کی نگاہ شاپر پر جیسے ہی پڑی وہ اس کی طرف لپکا اور اُسے اٹھانے کے لیے جیسے ہی اپنا ہاتھ بڑھا کر ڈرم میں جھکنے لگا، چھندا اس کے پاس رک کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے اپنی باری کے انتظار میں ہو کہ یہ پہلے اس جگہ سے جو اٹھانا چاہتا ہے وہ اٹھالے اس کے بعد وہ اپنا کام کرے گا۔ طارق کے جسم میں چیونٹیاں ریگنے لگی تھیں۔ اچانک ایک بھاری بھر کم آواز سے وہ لڑکا رک گیا۔ ایک بزرگ نے اسے پکار کر کہا تھا۔

”اوئے... تم نے سارا کوڑا بکھیر دیا ہے۔ رک ذرا...“

لڑکے نے سنا اور اس جگہ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ چھندا اسے بھاگتا ہوا دیکھتا رہا۔ طارق نے منہ ہی منہ میں کہا۔ ”ابے اٹھا شاپر کو اور نکل یہاں سے۔“

چھندے نے پہلے پانی پیا اور اس کے بعد ڈرم سے شاپر نکال کر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ ایاز نے دیکھا کہ طارق کا ملازم شاپر اٹھا کر چل پڑا ہے تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔ تیور نے جیسے ہی اسے شاپر اٹھاتے دیکھا، اس نے دلبر کو فون کیا اور قریب کھڑی موٹر سائیکل پر سوار ہوتے ہی ہلمٹ پہنا اور چھندے کے پیچھے چل پڑا۔

تیور کی موٹر سائیکل ایاز کی جیب کے پاس سے گزری تھی۔ طارق اب اطمینان سے

بیٹھا باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایاز نے اسے فون کیا۔

”تمہارا ملازم شاہر لے گیا ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”او... تو تم یہیں کہیں ہو۔“ طارق نے کہا۔

”میں یہاں نہیں ہوں لیکن میری نگاہیں اس جگہ ہیں۔“ ایاز نے کہا۔

”بڑا میٹ ورک بنالیا ہے۔“ طارق نے کہا۔

”تجھے اب پیسے مل گئے ہیں۔ تیرا اور میرا حساب برابر ہو گیا ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”ابھی برابر نہیں ہوا ہے۔“ طارق نے کہا۔

”اب کیا رہتا ہے؟“ ایاز نے پوچھا۔

”ابھی دیکھنا ہے کہ اس میں سے پیسے نکلتے ہیں کہ کچھ اور ہی برآمد ہوتا ہے۔“ طارق

نے کہا۔

ایاز نے اس کی بات سن کر اپنے ہونٹ بھیجنے لئے تھے۔ اس نے دل ہی میں اسے برا

بھلا کہتے ہوئے کہا۔ ”کم بخت کمینہ...“ پھر اس نے کہا۔ ”میں تمہیں بعد میں فون کرتا ہوں۔

ایک ایک نوٹ گن لینا پورے دو لاکھ روپے ہیں۔“

”دیکھ لیتا ہوں۔“ طارق نے کہا۔

ایاز نے اپنی جیب گھمائی اور وہاں سے چل پڑا۔

چھند اپنی ہی مستی میں جا رہا تھا۔ اس سے بے خبر کہ اس کے پیچھے دلبر بھی چلا آ رہا ہے۔

جبکہ تیمور نے ایک طرف موٹر سائیکل کھڑی کر دی تھی اور اس کی تار وغیرہ دیکھنے لگا تھا جیسے

ابھی موٹر سائیکل میں کوئی نقص پڑ گیا ہے۔

چھند ایک دو گلیاں مڑ کر ایک مکان کے سامنے رکا، اس کا تالا کھولا اور اندر چلا گیا۔

دلبر نے فون کر کے تیمور کو بتایا کہ وہ اندر چلا گیا ہے۔ باہر سے تالا اس نے کھولا ہے۔ جس

سے صاف ظاہر ہے کہ اس مکان میں اور کوئی نہیں رہتا ہے۔ تیمور اس کے پاس آ گیا۔ اس

نے موٹر سائیکل اس کے حوالے کی اور کچھ بتانے کے بعد دلبر کو وہاں سے چلتا کر دیا۔

گلی میں کوئی نہیں تھا۔ آمد و رفت بھی نہیں تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ گلی آگے سے بند

تھی۔ تیمور دلبر کے بتائے ہوئے مکان کے سامنے جا کر رک گیا۔ اس نے دروازے پر دستک

دی۔ چھند نے سمجھا کہ طارق آ گیا ہے۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔

”آپ اس گھر میں اکیلے ہی رہتے ہیں۔“ تیمور نے پوچھا۔

”ہاں جی... اکیلا رہتا ہوں... کیا بات ہے؟“ چھند نے کہہ کر پوچھا۔

”اندر آ کر بات کرتا ہوں۔“ تیمور نے کہا اور چھند کے کی اجازت سے پہلے ہی وہ

مکان میں داخل ہو گیا۔ تیمور نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ چھندا اسے حیرت سے

دیکھے جا رہا تھا۔

”آپ ہیں کون۔“ اس نے پوچھا۔

”تم بتاؤ تم کون ہو۔“ تیمور نے سوال کیا۔

”میں چھندا ہوں۔“ اس نے اکڑ کر کہا۔

تیمور نے اس کا جائزہ لیا۔ اس کی دانست میں یہ نوجوان اس کے سامنے سادہ لوح بننے

کی کوشش کر رہا ہے، یا پھر وہ ایسا ہی ہے اور اس کے پیچھے کوئی اور ہے۔ اُس نے غصیلے لہجے

میں کہا۔ ”وہ شاہر وہاں سے کیوں اُٹھایا تھا؟“

”مجھے طارق نے کہا تھا۔“ چھند نے ڈر کر فوراً کہہ دیا۔

طارق کا نام سن کر تیمور چونکا بھی اور اس کے ایک خیال کی تصدیق بھی ہو گئی کہ وہ سادہ

لوح ہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ طارق تک پہنچا جائے اور یہ محض اس تک پہنچنے کا ایک ذریعہ

ہو سکتا ہے۔

”کہاں ہے طارق؟“ اس نے پوچھا۔

”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ چھند بے نے اس کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

”دراصل یہ شاہر میں نے ہی اسے وہاں سے اُٹھانے کے لیے کہا تھا۔“ تیمور نے اس

بار اپنے لہجے میں نرمی لاتے ہوئے کہا۔

”وہ بھی آتا ہی ہوگا۔“ چھند نے کہا۔

”اس وقت کہاں تھا۔“ اس نے پوچھا۔

”اپنی دکان میں تھا۔“ چھند نے جواب دیا۔

”کون سی دکان.....“ تیمور کا سوال ابھی زبان پر ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

تیمور نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا اور چھند کے کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی

کے انداز میں پوچھا۔ ”شاہر کہاں ہے جو تم اُٹھا کر لائے تھے۔“

چھند نے اپنے ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کیا۔ شاہر سامنے ایک کرسی کی گدی کے

نیچے رکھا ہوا تھا۔ گدی اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور شاہر دکھائی دے رہا تھا۔ تیمور نے چھند کے کو

سامنے کے کمرے میں دھکیل کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ چھندا اندر جس جگہ گرا اسی جگہ بیٹھا

دروازہ ایک بار پھر بجا۔ تیمور نے دروازے کے پاس جا کر کنڈی کھول دی اور خود دروازے کے پیچھے ہو گیا۔ دروازہ کھولتے ہی طارق نمودار ہوتے ہوئے بولا۔

”کہاں مر گئے تھے...“

طارق آگے بڑھا تو پیچھے سے تیمور نے نکل کر برق رفتاری سے دروازے کی کنڈی پھر چڑھائی اور طارق کو پیچھے سے دبوچ لیا۔ اس اچانک آفت پر طارق گھبرا گیا۔ وہ طاقتور جسم کا مالک تھا۔ اس نے ایک جھٹکا دیا اور اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ طارق نے جیسے ہی تیمور کو دیکھا وہ چونک پڑا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ طارق نے پوچھا۔

”مجھ سے یہ پیسے تم نے منگوائے تھے۔“ تیمور نے پوچھا۔

”کون سے پیسے؟“ طارق نے اس کی طرف دیکھا۔

اسی دوران تیمور نے بجلی سی تیزی سے آگے بڑھ کر طارق کو پھر دبوچ لیا۔ اُس نے طارق کو گردن سے پکڑ کر میز پر اٹالٹا کر اس کی گردن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ ”بتاؤ... کہاں ہے میری بہن...“

”بہن...؟“ طارق نے نیچے تکلیف میں پھنسے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں جانتا۔“

تیمور نے اُسے مزید دبایا اور کہا۔ ”پھر پیسے کیوں منگوائے تھے۔ بتاؤ ورنہ میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔“

طارق کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی گردن کسی شکنجے میں کس دی گئی ہو۔ اتنی مضبوط گرفت تھی کہ اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ طارق نے جواب دینے کی بجائے مزاحمت شروع کر دی اور اپنے آپ کو تیمور کی گرفت سے چھڑانے لگا۔ دونوں میں ہلچل ہونے لگی تھی اور طارق نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہی ایک مکہ تیمور کے منہ پر دے مارا۔ تیمور نے یکے بعد دیگرے اس کے منہ پر تین چار مکے مار دیئے۔ تیمور کے بھاری بھر کم ہاتھ نے طارق کو دونوں طرف دھکا دیئے تھے۔ وہ کسی بھینسے کی طرح تیمور کی طرف بڑھا اور اُسے لیتا ہوا نیچے فرش پر جا گرا۔ دونوں میں ایک لڑائی شروع ہو گئی تھی۔ تیمور نے طارق کو ایک طرف اٹھا کر پھینکا اور پھر اسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا اور اس کے سر پر ٹکڑے ماری۔ طارق جیسے مدہوش ہو گیا تھا۔ تیمور نے اُسے سیدھا کیا اور پوچھا۔

”بتاؤ... ورنہ جان سے مار دوں گا۔“

”مجھے نہیں پتہ۔“ طارق نے نڈھال لہجے میں کہا۔

”تو پھر کسے پتہ ہے؟“ تیمور نے اسے جھنجھوڑا۔

”میں نے ایاز سے پیسے لینے تھے... اُس نے مجھے فون کر کے کہا تھا کہ اس طرح کوئی پیسے شاپر میں ڈال کر وہاں رکھ دے گا تم لے لینا۔“ طارق نے بند آنکھوں سے بتایا۔

”ایاز۔“ تیمور نے آہستہ سے دھرایا۔ ”تم سچ کہہ رہے ہو۔“

”ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”وہ کہاں ہے۔“ تیمور نے پوچھا۔

”یہ میں نہیں جانتا۔“ طارق بولا۔ اچانک کمرے میں موبائل فون بول پڑا۔ لڑتے ہوئے موبائل طارق کی جیب سے نکل کر نیچے گر گیا تھا۔ تیمور نے اس کی طرف دیکھا اور اس کا موبائل فون اٹھا لیا۔ اسکرین پر وہی نمبر تھا جس سے تیمور کو بھی ایاز نے فون کیا تھا۔ تیمور نے اپنا ریو اور نکال کر طارق کی کپٹی پر رکھ دیا۔ جیسے ہی ریو اور اس کی کپٹی پر لگا ایک دم طارق نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

”گولی مار دوں گا۔ میری طرف دیکھ کر بات کرنا۔“ تیمور نے اس کا اسپیکر آن کر کے ایک ہاتھ سے موبائل اس کے کان سے لگا دیا۔

”ہیلو پیارے۔“ ایاز کی آواز گونجی۔ ”جتنا تمہارا حساب بنتا تھا اس سے زیادہ پیسے ہیں۔ باقی تم ٹپ سمجھ کر رکھ لینا۔“

تیمور نے اثبات میں اشارہ کیا تو طارق نے کہا۔ ”ہاں ٹھیک ہے۔“

”اب حساب برابر۔“ وہ چپکا۔ وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ اس کی بات پر تیمور نے عمل بھی کیا اور کوئی گڑبڑ بھی نہیں ہوئی۔

”ہاں۔“ طارق نے کہا۔ تیمور نے پھر اسے اشارے سے سمجھایا۔ طارق نے پوچھا۔

”ایاز تم اس وقت کہاں ہو۔“

”اس زمین پر ہی ہوں۔“ وہ بولا۔

”اس زمین پر کہاں۔“ طارق نے پوچھا۔

”تم ایک کمینے شخص ہو۔ تجھے تو میں کبھی نہیں بتاؤں گا۔“ ایاز نے کہا۔

طارق نے پھر تیمور کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”وہ لڑکی تیرے پاس ہے ناں۔ اسے تم نے اغوا کر لیا ہے کیا؟“

ایاز کی ہنسنے کی آواز آئی۔ ”تجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ لڑکی میرے پاس ہے؟ چل اتنا جان

لے کہ ایک سونے کی کان ہاتھ لگ گئی ہے۔ تیرا میرا حساب بے باق ہو گیا ہے۔ پھر ملیں گے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس سے یہ تو تصدیق ہو گئی تھی کہ نازلی اس وقت ایاز کے پاس ہے لیکن وہ لڑکی تو بتا رہی تھی کہ اسے سکندر کے آدمیوں نے اغوا کیا ہے۔ یقیناً ایاز نے ان کے ساتھ مل کر یہ کام کیا ہوگا۔ تیمور کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئی تھیں۔ اس نے دانت پیس لئے تھے۔ وہ بولا۔ ”جرم کرنے والا اس معاشرے کا ناسور ہے۔ اسے کاٹ کر پھینک دینا ہی اس کا علاج ہے۔ جس کی اصلاح ہو سکتی ہے، اس کی اصلاح ہو اور جو ناسور پھیل گیا ہو اسے کاٹ دیا جائے۔“

تیمور نے طارق کو گریبان سے پکڑ کر سیدھا کیا اور اس کے سر پر اپنا ریوالمور رکھ کر اس کے کان میں درشت لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”اندر جاؤ اور اپنے آدمی کی آنکھوں پر پٹی اور ہاتھ باندھ کر باہر لے آؤ۔ میں دروازے کے پیچھے کھڑا ہوں۔ اگر گڑبڑ کی تو یاد رکھنا بے آواز گولی تجھے موت کی آغوش تک لے جانے میں دیر نہیں لگائے گی۔“

طارق نے خوفزدہ نگاہوں سے ایک بار ریوالمور کی طرف دیکھا اور دروازے کی طرف چلا گیا۔ اس نے دروازہ کھولا، چھندالپک کر اس کی طرف بڑھا۔

”کیا ہو رہا تھا باہر؟“

طارق نے گردن گھما کر کر دیکھا تیمور دروازے کی اوٹ میں ریوالمور کا رخ اس کی طرف کئے کھڑا تھا۔ تیمور کے ہاتھوں مار کھانے کے بعد اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائے جس سے اس کی ایک بار پھر دھنائی ہو اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ریوالمور بے آواز تھا۔

چھندے کی بات کا جواب دینے کی بجائے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک طرف سے ری اٹھا کر چھندے کے ہاتھ اس کی پشت کی جانب لے جا کر باندھنے لگا۔ چھندا حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کمزوری مزاحمت کرنے لگا اور بولا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟ مجھے کیوں باندھ رہے ہو۔ میں نے کیا کیا ہے؟“

”چپ رہو۔“ طارق نے ڈھیلے انداز میں کہا۔ اس کی نگاہ تیمور پر بھی تھی۔ پھر اس نے چھندے کی آنکھوں پر پٹی بھی باندھ دی تھی۔ وہ حیران تھا کہ تیمور چھندے کے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ جیسے بھی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی تیمور اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اس نے طارق کو اشارہ کیا اور طارق نے چھندے کو ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

”مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ طارق بھائی کہاں ہو تم؟ کیا ہو رہا ہے؟“ چھندا

احتجاج کر رہا تھا۔ تیمور نے آگے بڑھ کر اس کا منہ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے غرانے کے انداز میں کہا۔

”خاموش رہو۔“

چھندا پہلے ہی دل کا کمزور تھا۔ اس کی دانست میں طارق نے ہی ایسا کہا تھا۔ وہ یک دم سہم کر خاموش ہو گیا۔

تیمور نے اپنے موبائل فون سے کچھ فاصلے پر جا کر دلبر کو کال کی، ان کے مابین ہونے والی گفتگو طارق کے کان تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس دوران بھی اس کے ریوالمور کا رخ طارق کی طرف ہی تھا۔ اس سے بات کرنے سے فارغ ہو کر تیمور نے ایک طرف ترتیب سے رکھے ڈبے کھول کر دیکھنا شروع کر دیئے۔ ہر ڈبہ خالی تھا۔ وہاں پچاس سے زائد ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ ایک ڈبے سے ایک پستول اور چند گولیاں نکلی تھیں۔ تیمور نے وہ پستول اور گولیاں اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لی تھیں۔ طارق اس کی طرف کھڑا بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے قبل اتنے مضبوط شخص سے اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دلبر ایک ٹیکسی کار خود ڈرائیور کرتا ہوا اس مکان تک پہنچ گیا۔ اس نے تیمور کی ہدایت پر ٹیکسی مکان کے دروازے کے ساتھ جوڑ لی تھی۔ تیمور نے طارق کو اشارہ کیا۔ اس نے چھندے کو بازو سے پکڑا اور اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

تیمور نے باہر جھانک کر دیکھا۔ گلی میں کوئی نہیں تھا سوائے چند بچوں کے جو ایک طرف کھیل رہے تھے اور انہوں نے اپنا ہی شور مچایا ہوا تھا۔ تیمور کے اشارہ کرنے پر چھندے کو جلدی سے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور طارق کو تیمور نے دلبر کے ساتھ بٹھا دیا تھا۔ وہ خود طارق کے عین پیچھے بیٹھ گیا تھا۔ ٹیکسی کے شیشوں پر پردے تھے۔ تیمور کے ریوالمور کی نال طارق کی پسلی سے لگی ہوئی تھی۔ جبکہ چھندا سہم کر کونے سے لگا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے محض سانس لینے کی آواز آرہی تھی۔

ٹیکسی جیسے ہی سڑک چڑھی دلبر نے اس کی رفتار میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ کسی ماہر ڈرائیور کی طرح ٹیکسی چلا رہا تھا۔ طارق چپ دیکھ رہا تھا کہ وہ اسے اور چھندے کو کہاں لے جا رہا ہے۔ جبکہ چھندا کی دانست میں یہ تھا کہ اُسے طارق کہیں لے جا رہا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سے کیا غلطی ہو گئی تھی کہ جس کی پاداش میں اسے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جانا پڑا ہے۔ وہ اس مکان میں رکھی ہر چیز کا راز داں تھا۔ اس نے سوچا ممکن ہے کہ طارق کو اس پر کوئی شک پڑ گیا ہو اور وہ اسے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہو لیکن اس نے تو کچھ بھی ایسا نہیں



کیا کہ جس سے طارق اشتعال میں آکر اس کے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر مجبور ہوا ہو۔ چند راستے میں یہ ہی سوچتا رہا تھا۔

ٹیکسی شہر سے باہر چلی گئی تھی۔ بائی پاس سے کچھ فاصلے پر دلبر نے تیمور کے اشارے سے ٹیکسی روک دی تھی۔ وہ سڑک تھی۔ سڑک کی دائیں بائیں جانب درخت، جھاڑیاں اور سبزہ تھا۔ جبکہ کچھ ہی فاصلے سے سڑک بائی پاس کی طرف مڑ جاتی تھی۔ اس جگہ سے ایمر جنسی پولیس کا دفتر آدھ کلومیٹر پر تھا۔

تیمور نے طارق کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا اور پھر تیمور کے اشارے سے ہی طارق نے چھندے کا بازو پکڑا اور تیمور انہیں سڑک کی بائیں جانب درختوں میں لے گیا۔ دلبر نے آگے جا کر موڑ مڑتے ہی ایسی جگہ پر ٹیکسی کھڑی کر دی جہاں سے وہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ البتہ دلبر یہ دیکھ سکتا تھا کہ اس طرف سے کون آ رہا ہے اور جس جگہ درختوں کے بیچ میں تیمور ان دونوں کو لے کر کھڑا ہے، وہ بھی اسے دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی یا ٹرک اس طرف سے گزر جاتا تھا۔

چھندے کو طارق نے تیمور کے اشارے سے ایک درخت کے نیچے کھڑا کر دیا تھا۔ طارق اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ خود تیمور کچھ ہی فاصلے پر ایک درخت کے عقب میں ہو گیا تھا لیکن اس کے ریوالتور کا رخ اس کی طرف تھا۔

طارق کو خوف پیدا ہونے لگا تھا کہ تیمور اسے یہاں لاکر گولی مار دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ گھبراہٹ اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی تھی۔ وہ لاچار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ ورنہ وہ ضرور احتجاج کرتا۔

تیمور نے دلبر کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ دلبر کو پہلے ہی تیمور نے طارق کا موبائل دے دیا تھا۔ اس نے اشارہ پاتے ہی ایمر جنسی پولیس کو کال کی اور بولا۔

”پلیز جلدی آئیے گا۔ بائی پاس کی طرف مڑنے والی سڑک سے ذرا پہلے ایک شخص پستول لئے کھڑا ہے۔ اس نے ایک شخص کے ہاتھ اور آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اسے گولی مار دینا چاہتا ہے۔“

”آپ کون.....؟“ دوسری طرف آواز آئی۔

دلبر نے اپنے بارے میں فرضی بتایا اور رابطہ منقطع ہوتے ہی اس نے تیمور کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا اور خود ٹیکسی میں جا کر بیٹھ گیا۔

تیمور نے طارق کے گھر سے لیا ہوا پستول کھولا اس کا پہلا خانہ چھوڑ کر اس نے باقی

خانوں میں گولیاں بھریں اور انتظار کرنے لگا۔ طارق بدستور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ تیمور اس کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔

اچانک پولیس وین کا ہوٹر بجنا سنا دیا۔ طارق کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی ہوٹر بالکل نزدیک آکر بجنے لگا، تیمور نے اس کا پستول طارق کی طرف پھینک دیا۔ طارق نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پستول کو کیچ کر لیا۔ ٹھیک اسی دوران پولیس کے جوان وین سے نیچے اترے انہوں نے فوراً طارق کی طرف دیکھا اور اس کی طرف دوڑ پڑے۔ طارق بدحواس پستول ان کی طرف لہرا کر دیکھنے لگا۔ پولیس کے جوانوں نے بھی اپنی اپنی پوزیشن لے کر اسلحہ اس پر تان لیا۔

”میں کچھ نہیں کر رہا..... میں کچھ نہیں کر رہا ہوں۔“ طارق نے یک دم کہنا شروع کیا۔ اس کی بات سن کر جو نبی ایک جوان درخت کی اوٹ سے باہر نکلا، گھبرا کر طارق نے اس پر فائر کھول دیا۔ اسے لگا تھا جیسے اس پر گولی چلنے لگی ہے۔ وہ خانہ کیوں کہ خالی تھا اس لئے جوان بیچ گیا۔ اُسے ڈرانے کے لیے ایک طرف سے اس کے عین پیروں کے پاس ایک فائر ہوا۔ طارق نے مزید گھبرا کر ہوائی فائر کھول دیا اور چیخا۔

”مجھے مت مارو۔ میں کچھ نہیں کر رہا ہوں۔“

”اپنا پستول پھینک دو۔“ ایک آواز آئی اور طارق نے پستول پھینک دیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ خوف اس کی آنکھوں سے مترشح تھا۔ پولیس کے جوانوں کے دیکھ کر اسے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ اچانک کیسے آگئے اور یک دم اسے تیمور کا خیال آیا کہ وہ اس درخت کے عقب میں کھڑا تھا اچانک کہاں غائب ہو گیا ہے۔

تیمور تو اسی وقت اس جگہ سے بھاگ گیا تھا جیسے ہی پولیس وین اس جگہ آکر رکی تھی۔ تیمور بھاگتا ہوا ٹیکسی تک پہنچا تھا اور جو نبی وہ بیٹھا، دلبر نے ٹیکسی آگے بڑھانا چاہی ایک جھٹکا لگا اور ٹیکسی بند ہو گئی۔ دلبر چالی گھبرا کر اسے اشارت کرنے لگا۔ وہ بار بار کوشش کر رہا تھا لیکن ٹیکسی اشارت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے اسے؟“ تیمور نے دلبر کی طرف دیکھا۔

”پتہ نہیں ابھی تو ٹھیک تھی۔“ دلبر نے کہہ کر پھر کوشش کی۔ تیمور کو ڈرتا تھا کہ کہیں پولیس اس جگہ نہ آجائے۔ ورنہ اس کا بچھایا ہوا جال بے کار چلا جائے گا۔ وہ دلبر کو جلدی ٹیکسی اشارت کرنے کے لیے کہنے لگا۔

پولیس نے طارق کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ طارق بار بار کہہ رہا تھا۔ ”اُس آدمی کو

پکڑو جو اس جگہ تھا۔“

ایک جوان نے طارق کے ہاتھوں کو باندھ دیا تھا۔ دوسرے نے پوچھا۔ ”کون تھا اس جگہ؟ اور کون ہے تمہارے ساتھ؟“

”میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ یہ سارا چکر اسی کا ہے۔ وہ اس طرف کہیں بھاگا ہے۔“ طارق نے اس طرف اشارہ کر کے کہا۔

اس جوان کے اشارے سے دو جوان اس سمت بھاگ پڑے۔ دلبر کی ٹیکسی اشارت نہیں ہو رہی تھی۔ بار بار چابی گھمانے سے لگتا تھا جیسے اس کی بیڑی ختم ہو گئی ہے۔ تیمور نے پیچھے کی طرف دیکھا اور پھر نیچے اتر کر ٹیکسی کو پیچھے سے دھکا دینے لگا۔ دو جوان جو اس طرف آئے تھے، ان کا رخ ان کی مخالف طرف تھا اور وہ درختوں کے بیچ متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جبکہ ان سے کچھ ہی فاصلے پر سڑک پر تیمور ٹیکسی کو دھکا لگا رہا تھا۔ اشارت کرنے کے لیے بار بار جھٹکے لگ رہے تھے۔

دونوں جوانوں کا رخ اس سڑک کی طرف ہو گیا تھا۔ تیمور ٹیکسی کو دھکا لگا رہا تھا۔ دلبر اسے اشارت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جوان سڑک سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔ چند قدموں کا فاصلہ تھا کہ وہ سڑک پر آجاتے اور سیدی سڑک پر انہیں ٹیکسی دکھائی دے جاتی۔ تیمور کا اس جگہ سے نکل جانا بہت ضروری تھا۔ جوانوں کے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ تیمور ٹیکسی کو مسلسل دھکا لگا رہا تھا۔ جوان دو قدم پیچھے تھے اور ٹیکسی یک دم اشارت ہو گئی۔ تیمور بھاگ کر ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ دلبر نے اس کی رفتار بڑھا دی۔ اسی اثنا میں دونوں جوان سڑک پر آگئے اور دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ انہوں نے دور جاتی ٹیکسی کو بھی دیکھا اور واپس سڑک سے نیچے اتر گئے۔

چھندے کی آنکھوں سے پٹی اتری تو وہ اپنے سامنے پولیس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جب اس کی نگاہ طارق پر پڑی اور وہ بھی اس حال میں کہ وہ پولیس کی گرفت میں تھا اور اس کے دونوں ہاتھ باندھے ہوئے تھے تو اس کی حیرت دو چند ہو گئی تھی۔

”کون ہو تم۔“ اسی جوان نے چھندے سے پوچھا۔

چھندے نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور کہا۔ ”میرا نام چھندا ہے۔“

”یہ تجھے کیوں مارنا چاہتا تھا؟“ اس نے سوال کیا۔

”مجھے مارنا چاہتا تھا؟“ چھندے نے طارق کی طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔ وہ حیرت کی بلندی پر تھا۔

”تجھے نہیں پتہ تیری آنکھیں اور ہاتھ اس نے باندھے ہوئے تھے۔“ جوان نے کہا۔

چھندے کو یک دم یاد آ گیا کہ اس نے اسے ہاتھ اور آنکھیں باندھی تھیں۔ وہ بولا۔ ”یہ مجھے مارنا چاہتا تھا؟ مارنا چاہتا ہوگا۔ میں یہ جانتا جو ہوں کہ اس کے اس مکان میں کیا کیا ہے۔ یہ..... یہ..... مجھے مار کر اپنے راز ختم کرنا چاہتا ہوگا۔ اسی طرح اس نے پہلے اسلم کو بھی مار دیا تھا۔“

چھندے کے منہ سے یہ الفاظ سن کر طارق کا دل چاہا کہ وہ ابھی چھندے کا گلا دبا دے۔ اس جوان نے جلدی سے پوچھا۔

”اسلم کون تھا؟“

”وہ بھی اس کا ملازم تھا۔ پتہ نہیں ایک دن یہ اس کے ساتھ کیوں لڑ پڑا اور پھر اس نے اس کے پیٹ میں گولی مار دی تھی۔“ چھندے نے بلاتامل کہا۔

”اس کا بھی پتہ کر لیتے ہیں اور اس مکان میں کیا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”آئیں میرے ساتھ میں دکھاتا ہوں۔“ چھندا بھڑک اٹھا تھا۔ طارق محض دانت پیسنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی جوان کے حکم پر پہلے انہیں پولیس اسٹیشن کی طرف لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

طارق کو آفتاب خان کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ طارق کے بارے میں جو معلومات آفتاب کے پاس تھی سب سے پہلے اس نے وہ پڑھی، کیونکہ طارق کے خلاف رپورٹ اس کے پاس تھی، اور اسے بھی گرفتار کرنے کی ذمہ داری آفتاب کی تھی۔

چھندا اس بات پر ہی سبک پاتا تھا کہ طارق نے اسے مارنے کی کوشش ہی کیوں کی۔ سب سے پہلے چھندے کی نشاندہی پر وہ اس کے مکان میں گئے اور بہت کچھ ناجائز جو اس مکان میں چھپا ہوا تھا وہ برآمد کیا۔ اس کے بعد تفتیش شروع ہو گئی۔ طارق کے خلاف اتنا کچھ مل گیا تھا کہ وہ تیمور کا کہیں بھی ذکر نہ کر سکا اور چھندے کو نہ مارنے کی صفائی اس کے منہ میں ہی رہ گئی تھی۔ جہاں اس کے خلاف اور بہت سے کیس بنے وہاں ایک اقدام قتل کا بھی کیس بن گیا تھا۔ طارق بری طرح سے پھنس گیا تھا۔ چھندے کو ذرا ہوا کیا ملی اس نے اس کے سارے راز کھولنا شروع کر دیئے تھے۔

☆=====☆

تیمور راستے میں ہی اتر گیا تھا۔ دلبر ٹیکسی کو لے کر آگے چلا گیا تھا۔ تیمور کو ایاز کے فون کا انتظار تھا۔ ایک دو بار اس نے خود بھی اسے فون کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا فون بند تھا۔

تیمور جب گھر پہنچا تو عشرت اس کی منتظر تھی۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ تیمور کی بائیں آنکھ کے اوپر ہلکے سے زخم پر پڑی۔ اس سے عشرت نے یہ اندازہ لگانے میں کسی غلطی سے کام نہیں لیا، کہ وہ کسی سے لڑکر آ رہا ہے۔

”کیا ہاں؟“ عشرت نے پوچھا۔

”یہ تو پتہ چل گیا ہے کہ وہ ایاز کے پاس ہے لیکن کہاں ہے معلوم نہیں۔“ تیمور نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔

”ایاز کے پاس؟“ عشرت نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اس کا کوئی آدمی تمہارے ہاتھ لگ گیا تھا؟“

”ہاں۔“ تیمور نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”تو اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں ہے؟“ عشرت نے کہا۔

”وہ اس سے خود لاعلم تھا۔“ تیمور نے کہا۔

”ایاز کے گھر رابطہ کریں؟“ عشرت نے تجویز پیش کی۔

”وہ اسے کیا اپنے گھر میں لے کر بیٹھا ہوگا؟ اس کے ساتھ اور لوگ بھی شامل ہیں۔ یہ اس اکیلے کا کام نہیں ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”تیمور... کیا تم کسی سے لڑے تھے؟“ عشرت نے اس کے پاس ہو کر کہا۔

”بس ایسے ہی کچھ ہاتھ پائی ہو گئی تھی۔“ تیمور نے کہا۔

”اس ہاتھ پائی میں..... وہ زندہ ہے ناں؟“ عشرت نے اپنی نگاہیں اس کی طرف مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

تیمور نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں قانون کو ہاتھ میں نہیں لے رہا۔ وہ زندہ ہے اور پولیس کی تحویل میں ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”تم نے اسے پولیس تک کیسے پہنچایا۔“ عشرت نے پوچھا۔

”بس وہ پہنچ گیا وہاں تک۔“ تیمور نے اس سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ محض اتنا کہہ کر چپ ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر عشرت بولی۔

”انکل احسان کا بیٹا راجیل اس شہر میں ہے۔“

”راجیل کیا اس شہر میں ہے؟ وہ کیا کر رہا ہے یہاں ہے؟“ تیمور نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”انکل کا فون آیا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ راجیل چند دنوں سے اس شہر میں ہے۔ اپنے کسی کام کی وجہ سے۔ شاید وہ ہمارے ہاں آئے۔“ عشرت نے کہا۔ ”انکل احسان اپنی بیٹی کے ساتھ اسلام آباد جا رہے ہیں۔ چند دن وہ وہاں قیام کریں گے اور نازلی سے بھی ملیں گے۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ تیمور نے کہا۔

”تیمور..... تم اکیلے کہاں نازلی کی تلاش میں پھرتے رہو گے۔ میں پھر کہتی ہوں کہ تم پولیس سے رابطہ کرلو۔“ عشرت نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”پولیس..... سے رابطہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”اگر انہیں پتہ چل گیا کہ میرے ساتھ پولیس بھی ہے تو پھر شاید نازلی کو نقصان پہنچ جائے۔“

”میں نازلی کے لیے بہت پریشان رہتی ہوں۔ مجھے ہر وقت عجیب سے خیالات آتے ہیں۔ ایک خوف اور ڈر میری رگوں میں خون کے ساتھ دوڑتا رہتا ہے۔“ عشرت نے کہا۔

”میں نے کہا تھا کہ کسی لمحے کمزور نہ پڑنا۔“ تیمور نے کہا۔

”یہ سب میرے اختیار میں نہیں ہے۔“ عشرت نے کہا۔

”اپنے آپ کو حالات کے اختیار میں مت دو۔ بہادر بنو۔ بہت جلد نازلی اس گھر میں خیریت سے واپس آ جائے گی۔“ تیمور نے اسے حوصلہ دیا اور خود منہ ہاتھ دھونے کے لیے ہاتھ روم میں چلا گیا۔

☆=====☆=====☆

ایاز مطمئن تھا کہ تیمور نے اس کے کہنے پر پوری طرح سے عمل کیا اور دولاکھ روپے کی رقم طارق کو مل جانے سے اس کے سر کا قرض اُتر گیا۔ اب اسے طارق کا کوئی خوف نہیں رہا تھا۔ وہ آزادی سے اپنے شہر میں گھوم پھر سکتا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ طارق کے ہاتھ سے نہ صرف یہ کہ دولاکھ کی رقم واپس تیمور کے پاس جا چکی ہے بلکہ وہ اس وقت پولیس کی تحویل میں بھی چلا گیا ہے۔

وہ واپس حویلی میں آ گیا تھا اور اس بات کا منتظر تھا کہ اس کی ملاقات نازلی سے ہو جائے۔

سورج سرخ نکی کی شکل اختیار کر چکا تھا اور رفتہ رفتہ وہ آسمان کی بلندی سے غائب ہو رہا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل دکھائی دے رہے تھے۔ پرندوں کے غول سورج کے سامنے سے گزر کر واپس اپنے گھونسلوں میں جا رہے تھے۔ ہوا چل رہی تھی۔ سردی میں اضافہ ہو چکا تھا۔

دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ”منشی جی لڑکی سے بھی کچھ پوچھ گچھ کی کہ نہیں.... وہ کہاں کی ہے۔ کہاں جانا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”میں نے تو اس سے کوئی بات نہیں کی ہے۔“ منشی نے کہا۔ ”میں بھلا اس سے کیا پوچھوں۔“

”کیا خیال ہے کچھ میں اس سے پوچھ لوں۔ جو وہ کہتی ہے کیا وہ سچ بھی ہے کہ نہیں۔“ ایاز نے کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں تم اس سے اچھی طرح سے پوچھو۔ کہیں ایک اور ہی مصیبت گلے نہ پڑ جائے۔“ منشی نے فوراً کہا۔ ایاز نے اسے ششے میں اتار لیا تھا۔

”میں اس سے بات کرتا ہوں۔“ ایاز نے کہا اور خراماں خراماں وہ اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ وہ اس بات پر خوش تھا کہ اس بات سے اس نے منشی کو اپنے ہاتھ میں کر لیا ہے اور منشی خوشی سے پھولے نہیں سار ہا تھا کہ پچاس ہزار روپے کے نقصان کی تلافی کی ذمہ داری ایاز نے اپنے سر لے لی ہے۔

جو فکر اور خوف اس کے دل میں پہلے موجود تھا۔ ایاز کے بات کرنے سے وہ معدوم ہو گیا تھا۔ اس نے اسی وقت اپنا کھانا بند کیا اور اپنے ڈیرے میں گاؤں کے لوگوں کے ساتھ حقے کی لے اپنے ہاتھ میں لے کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اسے ایاز کی بات میں اتنی سچائی نظر آنے لگی تھی کہ وہ اپنی فکر حقے کی گڑگڑ اور دھوکے میں اڑانے لگا تھا۔

ایاز نے کمرے میں جانے سے پہلے دروازے پر دستک دی، اور اجازت ملتے ہی وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ نازلی اس کی طرف بے چینی سے دیکھنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بہت سے سوال تھے۔

”کیا حال ہے؟“ ایاز نے پوچھا۔

”تم شہر سے کب آئے؟“ اس کا جواب دینے کی بجائے نازلی نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

”مجھے کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔“ ایاز نے جواب دیا۔ وہ اس کی بے چینی دیکھ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں شاطرانہ انداز میں مسکرایا تھا۔

”کیا خبر ہے؟ میں بھائی اور بھابی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ تم نیا نمبر لائے ہو؟“ نازلی نے کہا۔

”مجھے لگ رہا ہے کہ تم بہت پریشان ہو اور بہت ہی زیادہ بے چین بھی ہو۔“ ایاز نے

نازلی اس وقت کمرے میں آگ کے سامنے بیٹھی ہوئی تیور اور عشرت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ ان سے رابطہ کرنے کے لیے مضطرب تھی۔ اُسے ایاز کا بھی شدت سے انتظار تھا کہ وہ آ کر اس کے بھائی تیور کے بارے میں کچھ بتائے۔ وہ ان ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی وقت کیا ہو گیا ہے اس کا اسے کوئی احساس نہیں تھا۔

ایاز نے جھانک کر دیکھا کہ منشی اپنے تخت پر بیٹھا حساب کتاب میں الجھا ہوا ہے۔ ایاز اس کے پاس چلا گیا اور بولا۔ ”منشی جی..... پیسے ملے؟“

منشی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”پیسوں کو پاؤں لگے اور وہ اس حویلی سے نکل گئے۔ چوہدری صاحب سے تو میں سچ سچ کہہ دوں گا کہ میں نے اس جگہ پیسے رکھے تھے اور وہ غائب ہو گئے۔ نقصان کیونکہ میری وجہ سے ہوا ہے اس لئے بھرتا بھی مجھے ہی پڑے گا۔“ منشی کہتے کہتے اُداس ہو گیا تھا۔

”آپ فکر نہ کرنا۔ میں ٹھیک کرادوں گا۔“ ایاز نے کہا۔

”آپ کیسے ٹھیک کرادیں گے؟“ منشی نے اس کی طرف اُمید بھری نگاہوں سے دیکھا۔

”پچھا سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ پر بوجھ نہ ڈالیں اور یہ نقصان چھوڑ دیں۔“ ایاز نے کہا۔ ”وہ برداشت کر لیں گے۔“

”ایک بار اس حویلی میں ایک ملازم سے ششے کا وہ ٹوٹ گیا تھا کیا کہتے ہیں اُسے..... ہاں..... گلدان..... کہتے تھے کہ مہنگا تھا۔ چوہدری صاحب نے اس کے پیسے کاٹے تھے۔“ منشی نے کہا۔

”تب میں اس حویلی میں تھا؟“ ایاز نے اس کی طرف دیکھا۔

”تب آپ تو نہیں تھے۔“ منشی نے جواب دیا۔

”اب میں ہوں اس حویلی میں۔“ چچا میری بات کو مانتے ہیں۔ میں کہہ دوں گا اور وہ آپ کو معاف کر دیں گے اور ایک بات اگر وہ نہ مانے جس کا کوئی چانس نہیں ہے... پھر بھی میں آپ کی تسلی کے لیے کہتا ہوں ہوں کہ اگر وہ نہ مانے تو پچاس ہزار روپے میں اپنی جیب سے دے دوں گا۔“ ایاز نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس بات سے منشی سر سے پاؤں تک خوشی میں نہا گیا اور چپک کر بولا۔ ”میں نے تو آپ کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا کہ آپ ہیرا لڑکے ہیں۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ ایاز اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر نازلی کے کمرے کی طرف

کہا۔

”میں ایک پل بھی سکون سے نہیں بیٹھ سکی ہوں۔ ہر لمحہ میری بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں جلد بھائی اور بھابی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔“ نازلی نے اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

ایاز نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”ابھی یہ ممکن نہیں ہے....“

”کیا ممکن نہیں ہے؟“ نازلی نے مزید بے قراری سے پوچھا۔

”تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں ہر بات بتاتا ہوں۔“ ایاز نے ایک طرف کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں بیٹھ نہیں سکتی۔ تم مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔“ نازلی نے کہا۔

”پلیز بیٹھ جاؤ۔ سب ٹھیک ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”پھر تم میرا رابطہ میرے بھائی سے کراؤ۔“ نازلی نے کہا۔

ایاز نے ایک طرف رکھی ہوئی کرسی اٹھا کر بس کے پاس رکھ دی اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ طوعاً کرہاً نازلی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے ایاز بھی بیٹھ گیا۔ وہ چپ رہا اور نازلی اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ ایاز کو شاید اس کی بے چینی سے لطف آرہا تھا۔ وہ شطرنج کی بساط کے آگے بیٹھے اس کھلاڑی کی مانند تھا جسے معلوم تھا کہ کون سی چال چلنا اس کے حق میں بہتر ہوگی، اور وہ تحمل اور سکون سے بیٹھا تھا۔

”کیا بات ہے تم بول کیوں نہیں رہے ہو۔“ نازلی نے جب دیکھا کہ ایاز چپ ہے وہ بولی۔

”بات یہ ہے نازلی کہ میں نے شہر جا کر پوری تفصیل حاصل کی ہے۔ تمہارے بھائی جان پر کوئی بینک کا معاملہ نہیں ہے۔ انہوں نے کسی بینک کا کوئی پیسہ نہیں دینا ہے۔“ ایاز نے کہنا شروع کیا۔

”پھر کیا بات ہے؟“ نازلی نے جھٹ سے کہا۔

”معاملہ ہے پارٹنرشپ کا۔“ ایاز نے کرسی سے ٹیک لگا کر کہا۔ ”تمہارے بھائی جان نے ایک پارٹی کے ساتھ بزنس پارٹنرشپ کی تھی۔ دنوں میں کاروبار میں اچھا خاصا نقصان ہو گیا تھا۔ پیسہ یوں ختم ہو گیا تھا جیسے سوکھی گھاس کو آگ لحوں میں جلا دے اور یہ سازش تھی تمہارے بھائی کے شاطر پارٹنر کی، جس کا علم تمہارے بھائی کو ہو ہی نہیں سکا اور وہ گرداب میں پھنس گئے۔“ ایاز نے کہا۔

”تو..... پھر.....؟“ نازلی نے پوچھا۔

”اب وہ اپنا پیسہ مانگ رہے ہیں۔ اصول سے نہیں بلکہ دھونس سے، اپنے وسیع تعلقات کے زور پر..... انہوں نے تمہارے بھائی کی زندگی اجیرن کر دی ہے اور ایک عجیب سی پاپل مچی ہوئی ہے۔“ ایاز نے کہا۔ ”مجبوراً تمہارے بھائی کو اپنی بیوی کے ساتھ کہیں روپوش ہونا پڑا ہے لیکن مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ وہ روپوش ہو کر قانونی چارہ جوئی کر رہے ہیں اور کہیں خیریت سے ہیں۔“

نازلی نے حیرت سے ایاز کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر غیر یقینی سی کیفیت آئی، کہ کیا اس کا بھائی ان سے ڈر کر کہیں روپوش ہو سکتا ہے؟ وہ تو ایک مضبوط چٹان کی مانند ہیں۔ پھر اس کے ذہن میں ایاز کی بات آگئی کہ وہ لوگ افرادی اور تعلقات کی قوت میں تیمور سے کہیں زیادہ مضبوط ہیں۔

”بھائی کہاں چلے گئے ہیں؟“ نازلی کے منہ سے جیسے نکلا۔

”کہیں بھی ہوں گے اور اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ کچھ تو کر رہے ہوں گے اور ایک بات یہ ہے کہ تمہاری زندگی کو بہت خطرہ ہے۔ تمہیں ان لوگوں نے ہی اغوا کیا تھا اور اب بھی یقیناً وہ تمہاری تلاش میں ہوں گے۔“ ایاز نے کہا۔

”بھائی تو میرے بارے میں بھی بہت پریشان ہوں گے۔ مجھے ایک بار تو ان سے رابطہ کرنا ہوگا۔“ نازلی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیسے رابطہ کرو گی؟ ان کا موبائل فون بند ہے۔ گھر کو تالا لگا ہوا ہے۔ آفس بھی بند ہے۔ تم اس جگہ محفوظ ہو۔“ ایاز نے ایک بات رک رک کر کہی۔

”اب میں کیا کروں؟“ نازلی نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

”انتظار..... تم انتظار کرو۔ میں ہر روز تمہیں شہر جا کر خبر دوں گا کہ کیا صورت حال ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”میں انتظار کیسے کر سکتی ہوں۔ جبکہ مجھے ایک پل بھی چین نہیں ہے۔“ نازلی نے کہا۔

”اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔“ ایاز نے اطمینان سے کہا۔

”اس بار میں بھی تمہارے ساتھ شہر جاؤں گی۔“ نازلی نے کہا۔

”تا کہ تم پھر سے ان کے ہاتھ لگ جاؤ۔ کیا معلوم تھے کہ کون تمہارا دشمن ہے۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے کھڑا شخص کس روپ میں ہے۔“ ایاز نے آخری جملہ کہتے ہوئے خود ہی لطف لیا تھا۔

اور ایک طرف آگ لگی لکڑیاں تھیں۔ تمباکو اور دھواں اس جگہ پھیلا ہوا تھا۔ ایاز کو نشی نے اپنے پاس ہی بٹھالیا تھا۔ کچھ دیر بعد گاؤں کے لوگ ایک ایک کر کے اٹھنے لگے اور پھر اس جگہ ایک ملازم، نشی اور ایاز رہ گئے تھے۔

ایاز کے کچھ کہنے سے قبل ہی نشی بھی اپنی جگہ سے اٹھ پڑا۔ ڈیرے سے نکل کر دونوں ایک دوسرے کے برابر چلنے لگے تھے۔ نشی نے موٹی چادر اپنے اوپر لی ہوئی تھی اس کے باوجود وہ سردی میں کانپ رہا تھا۔

”نشی جی..... میں نے ابھی لڑکی سے کچھ باتیں کی ہیں۔ مجھے کسی بات میں بھی کوئی وزن نہیں لگا۔“ ایاز نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ نشی نے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ وہ لڑکی کہیں سے بھاگ کر آئی ہے اور پناہ کے لیے یہاں رک گئی ہے۔ اخبار کی کہانی سنا کر۔“ ایاز نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ابھی چلتا کر دوں کیا؟“ نشی نے آنکھیں نکال کر کہا۔

”نشی جی ایسا بھی کیا ہے۔ وہ لڑکی ہے۔ اس حویلی کی پناہ میں آئی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں۔“ ایاز نے کہا۔

”کمال ہے بھئی..... وہ ہمیں نقصان پہنچا جائے اور ہم اس کی حفاظت کرتے رہیں۔“ نشی نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”جانے کون ہے کس کی لڑکی ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔“

”وہ ایسی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی شادی کہیں اس کی مرضی کے خلاف ہو رہی تھی۔ کسی بڑے گھرانے کی ہے۔ بس بھاگ آئی۔“ ایاز نے کہا۔ ”ایک دو ملاقاتوں میں وہ سب بتا دے گی۔“

”یہ تو پولیس کیس ہے۔“ نشی نے کہا۔

”نشی جی آپ کیا پولیس سے ڈرتے ہیں۔ اس علاقے کی پولیس آپ کا حقہ لی کر کہیں آتی جاتی ہے۔ آپ کا پولیس پرائیڈر سوخ ہے۔“ ایاز نے اس کی تعریف کی۔

نشی خوش ہو کر اپنی چھاتی چوڑی کر کے بولا۔ ”ہاں یہ تو ہے۔“

”لڑکی ہے۔ اس حویلی میں رہنے سے آپ کا کیا بگڑے گا۔ ایک دو دن میں خود ہی چل جائے گی۔ آپ بس یہ کرو کہ ماسی کی ڈیوٹی لگا دو کہ وہ اس کے پاس اس کے کمرے میں ہر وقت رہے۔ اس پر نظر رکھے۔“ ایاز نے کہا۔

”میں ابھی کہہ دیتا ہوں۔“ نشی نے کہا۔

اس کی بات سن کر نازی چپ ہو کر سوچنے لگی تھی۔ ایاز ٹھیک کہہ رہا تھا کہ کون کس روپ میں ہے، کیا پتہ۔ نازی کو چپ دیکھ کر ایاز نے پھر کہا۔

”کچھ بھی ہے نازی۔ میں ایک بار تمہارے بھائی کا سامنا ضرور کروں گا۔ ان کو تلاش کروں گا اور تمہارے سامنے لا کھڑا کروں گا۔ یہی اب میرا فرض ہے۔“ ایاز نے متانت سے کہا۔ ”بس ایک دو دن کی بات ہے۔ میں انہیں تلاش کر لوں گا۔“

نازی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کیا کہے۔ کون سا قدم اٹھائے اور کون سا راستہ اختیار کرے۔ اس کے ذہن میں آنے والی سوچ کے آگے خود بخود ایک سوالیہ نشان بن جاتا تھا۔

”تم نے کچھ کھایا؟“ ایاز نے اچانک موضوع بدلنے کے لیے سوال کیا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ نازی نے جواب دیا۔

”دیکھو..... تم اتنا مت سوچو۔ تسلی رکھو۔ بہت جلد تم اپنے گھر میں ہوگی۔ وہ محض روپوش ہیں۔ چند دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کل جا کر میں کچھ اور بھی پتہ کرنے کی کوشش کروں گا اور بڑی ذمہ داری سے تمہیں تمہارے گھر والوں تک پہنچاؤں گا۔“ ایاز نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”تم کچھ کھانی لو۔“

”وہ پل کب آئے گا۔“ نازی نے کہا اور مزید اُداس ہو گئی۔ ”جب میں پھر سے اپنے گھر ہوں گی۔ اپنے بھائی اور بھائی کے ساتھ۔“

”اگر تم اس طرح کمزور ہو گئی تو یاد رکھو، وہ پل تم سے دور ہوتا جائے گا۔ اپنے آپ کو مضبوط کرو۔ حالات کا سامنا کرنا سیکھو۔ اپنے بھائی کی طرح۔“ ایاز نے کہا۔

”میں اپنے بھائی جیسی نہیں ہوں۔“ نازی نے کہا۔

”اس جیسا بننے کی کوشش تو کر سکتی ہونا۔“ ایاز نے کہا۔ اس کی باتوں نے نازی کو کچھ پرسکون ہونے میں مدد دی تھی۔ ایاز نے اُس سے مزید چند باتیں کہیں اور تسلی دینے کے بعد وہ اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔ کسی فاتح کی طرح اس نے گردن کھڑی کی اور پُر جوش انداز میں اپنے کئے لہرائے اور آگے چل پڑا۔

رات بہت ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ایاز نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور حویلی سے ملحق ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ جہاں گاؤں کے لوگ اور نشی بیٹھا حقے کی گڑ گڑاہٹ کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ ڈیرے میں سردی کی شدت کم تھی۔ اس کی وجہ حقے کی بڑی سی چلم

”ماسی سائے کی طرح اس کے ساتھ رہے اور میں لڑکی سے کریدنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔“ ایاز نے کہا۔ ”اور کہیں فون نہ کرے۔“

”ہاں ہاں تم کریدو..... چوہدری صاحب کے آنے سے پہلے اس لڑکی کو فارغ کر دو۔“ منشی نے کہا۔

”کب آرہے ہیں چوہدری صاحب؟“ ایاز نے پوچھا۔

”ان کا کیا پتہ جب دل کرے آجائیں۔“ منشی نے بتایا۔

”اتنی بڑی حویلی ہے۔ ایک لڑکی اگر کسی کمرے میں ہوگی تو چوہدری صاحب کو کیا خبر لگے گی۔ وہ کون سا حویلی میں آکر ایک ایک کمرہ چیک کرتے ہیں۔ اس حویلی پر آپ کا اختیار ہے۔ آپ کے حکم کے بغیر یہاں کچھ ہو سکتا ہے۔“ ایاز اسے خوشامد کا دانہ کھلا رہا تھا۔

”یہ تو ہے۔“ منشی نے ایک بار پھر اپنا سینہ چوڑا کیا۔ ایاز اس کی طرف دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرایا اور دونوں حویلی کے اندر چلے گئے۔ منشی شاید اسے اتنی رعایت نہ دیتا۔ وہ پچاس ہزار کا معاملہ تھا۔ اس لئے اسے ایاز کی بات ماننا پڑ رہی تھی۔ ورنہ وہ نازلی کو حویلی سے باہر نہیں تو پولیس تک ضرور پہنچا دیتا۔

منشی نے اس کی باتوں میں آکر ماسی کی یہ ڈیوٹی لگا دی کہ وہ اس کے کمرے میں رہے گی اور اس پر نگاہ رکھے گی۔ جبکہ ماسی سے یہ کہلا دیا تھا کہ اسے اس کمرے میں اس کے ساتھ اس لئے رہنے کے لیے کہا گیا ہے تاکہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو پریشانی نہ ہو اور اکیلی کمرے میں کسی گھبراہٹ کا شکار نہ ہو۔

ایاز اوپر حویلی کی چھت پر چلا گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سردی رگوں میں خون جما رہی تھی لیکن ایاز کو پیسہ حاصل کرنے کی تپش تھی جس کی وجہ سے کھلے آسمان کے نیچے آنے میں سردی مانع نہیں تھی۔

ایاز کچھ دیر سوچتا رہا کہ اسے اگلا قدم کیا اٹھانا چاہئے۔ وہ اب جلد اس جگہ سے پیسہ لے کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اپنے ذہن میں ایک نقشہ بنا کر اس نے اپنے دوست اکرم کو فون کیا جو کراچی میں مقیم تھا۔ ایاز کا خیال تھا کہ وہ تیمور سے پیسہ لے کر کراچی کے ہجوم میں گم ہو جائے اس کے بعد کسی بھی ملک کے لیے اپنے دوست اکرم کے ذریعے کوشش کر کے نکل جائے۔ جہاں وہ ایک نئی زندگی کی شروعات کرے گا۔

ایاز نے اکرم کو فون کر کے اپنے آنے کی اطلاع اور کسی ملک میں شفٹ ہونے کا عندیہ دیا تو اکرم نے کہا کہ وہ اس کے لیے کسی بھی ملک میں جانے کا انتظام کر دے گا۔ کیونکہ اکرم

جہاں اور بہت سے کام کرتا تھا، ان میں سے ایک کام اس کا یہ بھی تھا کہ وہ پیسہ لے کر لوگوں کو بیرون ملک بھجواتا تھا۔ ایاز نے اصل معاملہ مخفی رکھتے ہوئے یہ ہی اُسے بتایا تھا کہ وہ روزگار کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور اس لئے ملک سے باہر جانا چاہتا ہے۔ اکرم نے باتوں باتوں میں یہ دریافت کر لیا تھا کہ ملک سے باہر جانے کے لیے اس کی جیب میں پیسہ ہے کہ نہیں۔ جب ایاز نے اسے یہ بتایا کہ پیسے کی کوئی پریشانی نہیں ہے تو اکرم اس کا کام کرنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔

اس کے بعد ایاز نے تیمور کو فون کیا۔ رابطہ ہوتے ہی ایاز نے مسکرا کر کہا۔ ”مجھے اچھا لگا کہ تم نے میری بات پر عمل کیا..... اور پیسہ ٹھیک جگہ اور ٹھیک وقت پر پہنچا دیا۔“

”اب کیا چاہتے ہو؟“ تیمور نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”مجھے دو کروڑ روپیہ چاہیے۔ کل۔“ ایاز نے کہا۔

”پہلے میں اپنی بہن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔

”ٹھیک ہے تم اس انتظار میں ہاتھ میں موبائل پکڑے کھڑے رہو۔ ہم تمہیں رقم پہنچانے کا ایک وقت دیں گے۔ اس کے بعد اگر تمہیں کوئی افسوس ناک خبر ملے تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہوگا۔“ ایاز نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”ہاں یہ تم یقین کر لو کہ تمہاری بہن اس وقت خیریت سے ہے اور دوسرے کمرے میں آرام کر رہی ہے۔“

”بتاؤ مجھے کہاں پہنچنا ہے۔“ تیمور نے پوچھا۔ تیمور کوشش کر رہا تھا کہ وہ ایاز کی آواز پہچان سکے۔

”کل چار بجے..... تم اپنی کار میں آؤ گے۔ نوٹوں کا بیگ اس میں ہوگا۔ تم کار کھڑی کر کے اس جگہ سے چلے جاؤ گے۔ ہم تمہاری کار سے صرف اپنا مال لیں گے اور کار تمہیں کہیں بھی ٹھیک حالت میں مل جائے گی۔“ ایاز نے کہا۔

”کار کہاں لے کر آؤں۔“ تیمور نے پوچھا۔

”یہ میں تمہیں کل چار بجے سے پہلے بتا دوں گا۔ تم اپنا انتظام رکھنا۔“ ایاز نے کہا۔

”اور میری بہن.....؟“ تیمور نے پوچھا۔

”جیسے ہی تم کار چھوڑ کر جاؤ گے۔ ہم تمہیں اسی وقت کال کر کے بتا دیں گے کہ تمہاری بہن کہاں ہے۔“ ایاز نے کہا۔ ”ہم صرف پیسے دیکھیں گے۔ اسی جگہ نزدیک ہی کہیں تمہاری بہن ہوگی۔ جو تمہیں مل جائے گی۔“

”اگر میرے ساتھ کوئی دھوکہ ہوا تو؟“ تیمور نے کہا۔

”یہ تم تصور بھی مت کرو کہ ہم تمہارے ساتھ دھوکہ کریں گے، ہمارا مقصد صرف پیسہ حاصل کرنا ہے اور کچھ نہیں۔“ ایاز نے کہا۔ ”ہاں اگر تم نے کوئی دھوکہ کیا تو یاد رکھنا بہت برا ہوگا۔“

تیور نے اچانک کہا۔ ”تم ایاز ہونا؟“

دوسری طرف سے سکوت سا چھا گیا اور پھر ایاز کے ہنسنے کی آواز آئی۔ ”پہچان لیا ہے تو مجھے یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ میں وہی ہوں جو تم سوچ رہے ہو۔“

”آخر تم نے اپنی کمینگی دکھا ہی دی۔“ تیور نے کہا۔

”کاش مجھے تمہارے ساتھ کبھی بیٹھنے کا موقع ملتا لیکن اب ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں پیسہ لے کر گم ہو جاؤں گا۔ میں تمہیں بتاتا کہ میں کیا ہوں۔“ ایاز نے کہا۔

”مجھے تم نہ بھی بتاؤ مجھے پتہ چل چکا ہے کہ تم کیا ہو۔“ تیور نے کہا۔ ”ایک بات یاد رکھنا میری بہن کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ تجھے تمہارا پیسہ مل جائے گا۔“

”تمہاری بہن سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ حفاظت سے ہے۔“ ایاز نے کہا۔ ”کل ملاقات ہوگی۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے موبائل بند کر دیا۔ تیور نے غصے سے دانت پیسے۔

☆=====☆=====☆

حماد عجیب الجھن کا شکار تھا۔

اس کے سینے میں دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی باہر نکل آئے گا۔ وہ اس خوف میں اس بری طرح سے مبتلا تھا کہ جب اس کی حقیقت تیور اور عشرت پر کھلے گی تو کیا ہوگا۔ وہ ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ حالانکہ جو بھی ہوا تھا انجانے میں ہوا تھا اور پتہ چل جانے پر اس نے نازی کی مدد کرنے میں کسی تغافل سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ اس وقت سب بھول گیا تھا۔ وہ پیسہ بھی جس کے لیے وہ ان لوگوں کے ساتھ شامل ہوا تھا۔

حماد بند کمرے میں اپنے ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ چھپائے بیٹھا تھا۔ اس نے دروازہ کھلنے کی آہٹ سنی اور پھر اسے لگا جیسے کوئی اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔

”چلو اٹھو۔“ ناصر کی آواز اس کے کان میں ایسے پڑی جیسے سزائے موت کے قیدی کو پھانسی سے قبل آ کر کہا جائے۔

حماد نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور ناصر کی طرف دیکھا۔ ”کہاں جاتا ہے؟“ اس نے مرلی سی آواز میں پوچھا۔

”کہیں گھومنے چلتے ہیں۔“ ناصر نے اس کی طرف تسخراہ انداز میں دیکھ کر کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کا لہجہ درشت ہو گیا اور وہ بولا۔ ”جا کر اس لڑکی کو یہاں تک لے کر آؤ جسے تم نے آزاد کر دیا تھا۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔“ حماد نے نفی میں گردن ہلا کر کہا۔

”جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو۔“ ناصر نے اسے گھورا۔

”ہاں جانتا ہوں۔ میں اس گھر میں نہیں جاؤں گا۔“ حماد نے ایک بار پھر مصمم ارادے سے کہا۔

اس بار ناصر نے حماد کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا اور اسے کھینچ کر اس کمرے سے باہر سکندر کے پاس لے گیا۔ جہاں جمال اور نواز بھی براجمان تھے۔

”کہتا ہے میں نہیں جاؤں گا۔“ ناصر نے اسے سکندر کی طرف دھکیل کر کہا۔ حماد سکندر کے پاس ہی زمین پر گر گیا۔

سکندر نے حماد کی طرف دیکھا اور بڑے اطمینان سے بولا۔ ”نہیں جاتا تو نہ جائے..... ہم میں سے کوئی چلا جاتا ہے اور اس کی ٹیپ اس گھر میں دے کر آ جاتا ہے۔ اس کے بعد جو بھی ہوگا اسے پتہ ہی ہے۔ ہم تو بس نظارہ کریں گے۔“

اس کی بات سن کر جیسے حماد یک دم ڈر گیا ہو۔ وہ کانپ کر بولا۔ ”تم ایسا نہیں کرو گے۔“ ”نہیں کرتے۔“ سکندر نے فوراً اس کی بات مان کر کہا۔ ”تم ویسا کر لو جیسا ہم چاہتے ہیں۔ اس گھر میں جاؤ اور دیکھو وہ لڑکی کہاں ہے، اور اس کے بعد اس لڑکی کو کیسے بھی لے کر یہاں آ جاؤ۔“

حماد نے سوچا کہ وہ اس وقت ایک ایسی جگہ پر کھڑا ہے جس کے دونوں طرف کھائی ہے۔ اس نے ایک لمحے میں سوچا اور کہا۔ ”ٹھیک ہے لڑکی آپ لوگوں کے حوالے کرنے کے بعد میرا تم لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہے گا اور میرا نام کہیں بھی نہیں آئے گا۔“

”ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم تمہارا نام لیں۔ تم وہ کام ٹھیک کرو جو تم نے خود بگاڑا ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں کے راستے الگ الگ ہوں گے۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔

حماد اپنی جگہ سے اٹھا اس نے اپنی شرٹ کا کالر ٹھیک کیا اور بولا۔ ”میں جا رہا ہوں۔“ ”تم دونوں اس کے ساتھ جاؤ۔ گڑبڑ کرے تو اسے گولی مار دینا۔“ سکندر نے جمال اور نواز سے کہا۔ اس کا لہجہ یک دم درشت ہو گیا تھا۔



”کیا یہ بھی میرے ساتھ اس گھر میں جائیں گے۔“ حماد نے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ضرورت پڑے تو انہیں اپنے ساتھ گھر لے جانا۔ ورنہ یہ تمہاری نگرانی کریں گے۔ تم  
 کیا کرتے ہو، اس پر نظر رکھیں گے۔“ سکندر نے کہا۔

حماد نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ اس کے پیچھے ہی  
 جمال اور نواز بھی چل پڑے۔ سکندر نے معنی خیز انداز میں ناصر کی طرف دیکھا اور ناصر نے  
 ایک عجیب سی مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائی اور سر ایک طرف جھٹک دیا۔

جمال اور نواز کچھ فاصلے پر ایک ایسی جگہ رک گئے جہاں سے وہ تیمور کے مین گیٹ پر  
 نگاہ رکھ سکتے تھے۔ حماد نے کانپتے ہاتھوں سے بیل دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور حماد اندر چلا  
 گیا۔

عشرت نے اس کی طرف حیران کن نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اس کی اچانک آمد سے وہ  
 کچھ حیران سی ہو گئی تھی۔

”کیسے ہو؟ بڑے دنوں کے بعد تم نے چکر لگایا ہے۔“ عشرت نے پوچھا۔  
 حماد نے اپنی نگاہیں گھمائیں اور مسکرا کر کہا۔ ”وقت ہی کہاں ملتا ہے۔ آج سوچا آپ  
 سے مل آؤں۔“

”بیٹھو میں تمہارے لئے کچھ کھانے کے لیے لاتی ہوں۔“ عشرت نے کہا۔  
 ”نن..... نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔ میں تو بس یونہی  
 اس طرف آ گیا تھا۔“ حماد نے کہا۔ اس کے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ گھبراہٹ  
 اور خوف یک دم عیاں ہو گیا تھا۔ عشرت نے اس کا گہری نگاہوں سے جائزہ لیا اور پوچھا۔

”کیا بات ہے تم گھبرائے ہوئے ہو۔“  
 ”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ حماد زبردستی مسکرایا۔

”پریشان ہو..... کیا بات ہے؟“ عشرت نے پھر سوال کیا۔ اس کی نگاہیں اس کے  
 چہرے پر مرکوز تھیں۔

”نہیں آپ کو ایسا لگ رہا ہے۔ گھر میں کیا اور کوئی نہیں ہے۔“ حماد نے متلاشی نگاہوں  
 سے ادھر ادھر دیکھا۔ ”گھر میں بڑی خاموشی ہے۔“

”تیمور دوسرے کمرے میں ہیں۔“ عشرت نے جواب دیا۔  
 ”اور نازی کیا کہیں گئی ہوئی ہے..... دکھائی نہیں دے رہی۔“ حماد نے پوچھا۔

”وہ اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔ چند دن رہنے کے لیے۔ تم بیٹھو میں چائے بناتی ہوں۔“

عشرت نے کہا۔

”نہیں..... نہیں میں تو ادھر ایک کام آیا تھا سوچا آپ سے ہیلو ہائے کرتا جاؤں۔ میں  
 چلتا ہوں۔“ حماد نے کہا۔ اس نے مسکرا کر عشرت کی طرف دیکھا اور اجازت لے کر جانے لگا  
 تو عشرت نے اسے مخاطب کیا۔  
 ”تیمور سے نہیں ملو گے؟“

حماد رک کر پلٹا۔ ”پھر سہی میرے ساتھ کچھ دوست بھی ہیں۔“ حماد چند ثنائے اسی طرح  
 کھڑا رہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ اور ہمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ بول دینا  
 چاہتا تھا لیکن تذبذب کا شکار تھا۔ ایک کشمکش اس کے اندر تھی۔ وہ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔  
 ”گھر سب ٹھیک ہے ناں؟“ عشرت نے پوچھا۔ وہ اس کی طرف گہری نگاہوں سے  
 دیکھ رہی تھی۔

”ہاں سب ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔ باہر میرے دوست میرا انتظار کر رہے ہوں  
 گے۔“ حماد نے کہا وہ دو قدم چلا اور پھر رک گیا۔ اس نے ہمت کی کہ وہ پلٹ جائے لیکن ایسا  
 نہیں کر سکا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ عشرت اس کی طرف حیران کن نگاہوں سے دیکھ رہی  
 تھی۔

حماد سیدھا جمال اور نواز کی طرف چلا گیا۔ نواز نے فوراً پوچھا۔ ”ہاں... کیا بنا؟“  
 ”وہ گھر میں نہیں ہے۔“ حماد نے جواب دیا۔

”کہاں ہے؟“ نواز نے پوچھا۔  
 ”انہیں بھی نہیں پتہ..... وہ..... وہ خود بھی اس کے لیے پریشان ہیں۔“ حماد نے بات  
 بدل کر کہا۔ یہ بات حماد نے آتے آتے ہی سوچ لی تھی کہ وہ ان سے ایسا کہے گا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ جمال نے آگے بڑھ کر حماد کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ اس  
 کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چاہو تو خود اندر  
 جا کر پتہ کرلو۔“ حماد نے اکتا کر کہا۔ اسے شدید غصہ آ گیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنا  
 لہجہ بلند نہیں ہونے دیا تھا۔

اس کی بات سن کر نواز اور جمال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر دونوں نے  
 حماد کا بازو پکڑا اور اسے ساتھ لے کر نیکیسی اسٹینڈ کی طرف چل پڑے۔

تیمور ادھر اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے ابھی ابھی ایاز کا فون سنا تھا اور ٹھپکتے ہوئے وہ

سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے کہ اچانک اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر دو آدمیوں پر پڑ گئی تھی، جو بار بار اس کے گھر کے گیٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ سامنے ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ وہ کبھی درخت کے عقب میں ہو جاتے تھے اور کبھی نکل کر سامنے آ جاتے تھے اور پھر جب اس کے گھر سے حماد باہر نکل کر ان کی جانب بڑھا تو تیمور چونکا۔ تیمور نے دیکھا کہ حماد ان کے پاس گیا ہے اور ان کے درمیان کچھ باتیں ہونے لگی ہیں۔ پھر جب جمال نے غصے سے حماد کے کندھے پر ہاتھ مارا اور حماد نے آگے سے کچھ کہا تو تیمور کے لیے یہ سب مزید حیرت کا باعث تھا۔

تیمور نے اس سے قبل ان دو آدمیوں کو نہیں دیکھا تھا لیکن شکل و صورت سے وہ شریف لوگ نہیں لگتے تھے۔ ان سے حماد کا کیا تعلق ہے؟ تیمور نے سوچا۔ جیسے ہی وہ اس جگہ سے گئے، تیمور کمرے سے باہر نکل گیا تاکہ وہ عشرت سے پوچھ سکے کہ حماد کیوں آیا تھا؟

☆=====☆

سکندر نے ساری بات سن کر حماد کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی بات پر یقین کرنے کے لیے اس لئے بھی سکندر کا دل مان رہا تھا کہ ایسا ممکن ہے کہ وہ لڑکی واقعی گھر نہ پہنچی ہو۔ ان کوئی وی چینل کے ذریعے سے یہ خبر تو مل ہی چکی تھی کہ سدرہ کو کسی نے پلازے کی چھت سے گولی مار کر نیچے پھینک دیا ہے۔ سکندر سوچنے لگا۔

”ایک بات بتاؤ۔“ سکندر نے حماد کی طرف دیکھا۔ ”جب تم نے اس لڑکی کو آزاد کیا تھا تو وہ اکیلی گئی تھی یا تم اسے کہیں چھوڑ کر آئے تھے۔“

حماد نے سوچا کہ اب جھوٹ بولنا بے کار ہے۔ لہذا وہ بولا۔ ”میں نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ وہ خود ہی کہیں چلی گئی تھی۔“

اس بار حماد کا جواب سن کر جمال کا دل چاہا کہ وہ اس کا گلا گھونٹ دے۔ وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ”تم نے ہماری محنت پر پانی پھیر دیا۔ تمہاری وجہ سے ہم ایک بڑی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔“

”جمال... اپنے آپ کو کنٹرول کرو۔ میں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کو اسی نے آزاد کیا ہے۔ اب اس نے اپنے منہ سے اقرار بھی کر لیا ہے لیکن یہ وقت الجھنے کا نہیں ہے۔ اب بھی یہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ... اس کا پتہ کرنا پڑے گا۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ حماد نے کہا۔ ”مجھے اب جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ اس گھر والوں سے ذلیل ہو کر مرنے سے بہتر ہے کہ میں تم

لوگوں کے ہاتھوں مر جاؤں۔ وہ گھر میں نہیں ہے اور اس کے لیے وہ پریشان ہیں۔“

”تمہارا فیصلہ تو اچھا ہے۔“ سکندر نے اس کی بات پر مسکرا کر کہا۔ ”تمہیں ہمارے ہاتھوں ہی مر جانا چاہیے۔“

”اب کیا کرنا ہے۔“ جمال نے کہا۔ وہ بے قرار تھا۔

”تم بتاؤ کیا کرنا ہے؟“ سکندر نے جمال اور نواز کی طرف دیکھا۔

”اب پتہ نہیں وہ لڑکی کہاں ہے۔ بہت بہت ہم اس کی تلاش نہ کریں۔ کیوں نہ ہم کوئی اور پارٹی تلاش کر لیں۔ اس کا جو کرنا ہے۔“ پ ر دیں۔“ جمال نے کہا۔

”دوسری پارٹی تلاش کرنی ہے؟“ سکندر نے کہا۔

”ہاں اب اسے کہاں تلاش کریں۔ ہمیں کیا پتہ وہ کہاں ہے۔ اس شہر میں دولت مند یہ ہی ایک گھر تو نہیں ہے۔“ جمال۔۔۔۔۔

”پارٹی یہ ہی ہوگی۔ لڑکی کی تلاش بھی ہوگی اور اس کے بھائی سے ہی پیسہ وصول کیا جائے گا۔“ سکندر نے اپنی ایک ایک بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ ضروری ہے۔“ نواز نے الجھن سے کہا۔

”ہاں... یہ ضروری ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”مجھے سوچنا ہوگا اور اب تم دونوں ہماری مان کر چلو گے۔ ہم نے تم دونوں سے سیٹھ کا پیسہ لینا ہے۔ اس کا پریشر ہم پر بڑھ رہا ہے۔ ہم نے اس کے کام کی قیمت لی ہے۔ اب اسے اور کتنے بھانے بنا کر سنائیں۔“

”ہم نے بھی انہیں ایک تاریخ دی ہے اور اس تاریخ تک ہم نے اس کا پیسہ تم دونوں سے وصول کرنا ہے۔“ ناصر نے کہا۔

”تو پھر ہم کیا کریں۔“ جمال نے اُکتا کر کہا۔

”بس تم دونوں چپ رہو اور ہماری سنو۔ جو ہم کہیں اس پر عمل کرو۔ پہلے اگر تم ہمیں ساتھ لے کر چلتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ ہمیں بتاتے کہ اس کا اس گھر سے کیا رشتہ ہے۔ ہم تم دونوں کو کھیلنے کا اور اچھا طریقہ بتاتے۔“ سکندر نے تیخ پا ہو کر کہا۔

”اس دن تو آپ کہہ رہے تھے ہم نے اس کا استعمال خوب کیا ہے۔“ نواز نے کہا۔

”اس دن میں نے کہا تھا، لیکن سوچا نہیں تھا کہ تم دونوں نے اس کی چال چلتے ہوئے کہاں غلطی کی ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”تم دونوں یہاں سے نہیں جاؤ گے اور یہ... یہ تو کہیں نہیں جائے گا۔“ سکندر نے حماد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اسی اثنا میں سکندر کو اطلاع دی گئی کہ مراد نام کا آدمی اس سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ سکندر نے ان تینوں کو ناصر کے ساتھ

دوسرے کمرے میں جانے کے لیے کہا اور مراد کو فوراً اندر بلا لیا۔

جس وقت مراد کمرے میں داخل ہو رہا تھا، اس وقت وہ تینوں ناصر کے ساتھ باہر نکل رہے تھے۔ مراد نے ایک نظر جمال اور نواز کی طرف دیکھا اور پھر سکندر سے بغل گیر ہو گیا۔ دونوں پر تپاک انداز میں ایک دوسرے سے ملے تھے۔ کچھ دیر بعد ناصر بھی اس جگہ آ گیا تھا۔ اس سے بھی مراد بہت اچھے انداز میں ملا تھا۔ تینوں بیٹھ کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے تھے۔ تینوں کے ہر بات پر دانت نکل رہے تھے۔ جس سے ان کی آپس میں بے تکلفی عیاں ہوتی تھی۔

مراد..... چوہدری نواب دین کا انتہائی خاص آدمی تھا۔ اس کے جائز اور ناجائز کام وہی سرانجام دیا کرتا تھا۔ وہ اس کا قابل بھروسہ آدمی تھا۔

”میں شہر آیا تھا۔ چوہدری صاحب کا ایک کام تھا۔ وہ کام ابھی نہیں ہوا۔ وہ کام کل ہوگا۔ رات اسی شہر میں گزارنی تھی سو چاتم سے بہتر کون ہے جہاں مزے سے وقت گزر سکتا ہے۔ اس لئے میں تم لوگوں کے پاس آ گیا۔“ مراد نے کہا۔

”اچھا کیا تم آ گئے۔ بڑے دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔“ سکندر نے کہا۔

مراد نے کہا۔ ”یہ جو ابھی باہر گئے ہیں۔ ان میں سے ایک کو میں نے ایک دو دن پہلے اپنے گاؤں میں دیکھا ہے۔“

”کسے اور کب دیکھا ہے؟“ سکندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے اس کا نام تو نہیں پتہ..... وہ جو ناصر کے پیچھے چل رہا تھا۔“ مراد نے کہا۔

”اس کا نام نواز ہے۔“ ناصر نے کہا۔

”اسے میں نے کار میں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر دوبارہ میں نے دیکھا کہ یہ ہماری حویلی کے سامنے ایک مکان ہے، اس کے اندر جا رہا تھا۔ تب یہ کہیں سے پیدل آیا تھا۔“ مراد نے بتایا۔

سکندر اور ناصر نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا اور سکندر نے کہا۔

”کچھ اور بھی دیکھا تھا؟“

”کچھ اور سے مطلب؟“ مراد نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ کچھ ایسا جس سے تمہارے نتھنے کچھ سونگھنے کے لیے بے چین ہو گئے ہوں؟“ سکندر نے کہا۔

”میں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی اور پھر بارش اتنی ہوئی کہ میں دوبارہ اس طرف جانہیں

سکا۔ آج کل حویلی میں چوہدری صاحب کا ایک بھتیجا آیا ہوا ہے۔ اس پر بھی نظر رکھنے کا حکم ہے۔ اوپر سے ایک لڑکی پتہ نہیں کہاں سے آ گئی..... کہ وہ اخبار کی رپورٹر ہے۔ میں تو حیران ہوں۔“ مراد نے مسکرا کر کہا۔

لڑکی کا سنتے ہی دونوں پہلے سے بھی زیادہ بری طرح سے چونکے۔ سکندر نے تصدیق کی۔ ”کیسی لڑکی ہے؟“

”جیسی لڑکی ہوتی ہے ویسی ہی ہے۔“ مراد ہنسا۔ ”اس کے سر پر کیا سینگ نکلے ہوئے ہیں۔“

”میرا مطلب ہے کہ اس لڑکی نے اپنے بارے میں کیا بتایا ہے۔ کہاں سے آئی ہے؟“ سکندر نے پوچھا۔ ”کوئی نام پتہ؟“

”پتہ نہیں نشی صاحب اور وہ جو لڑکا ہے۔ وہ ہی اس سے بات کرتے ہیں۔ میں اس پر توجہ نہیں دیتا۔ بس اتنا پتہ ہے کہ وہ کسی اخبار کی رپورٹر ہے۔“ مراد نے کہا۔

”اس لڑکی کے بارے میں تم نے چوہدری صاحب کو بتایا ہے؟“ سکندر نے پوچھا۔

”یہ میرا فرض ہے کہ میں حویلی یا اس گاؤں میں ہونے والی ہر بات سے چوہدری صاحب کو آگاہ کروں۔ اس لئے میں نے لڑکی کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔“ مراد نے کہا۔

”لیکن بات کیا ہے۔ تم دونوں کے چہرے مجھے کچھ اور ہی اشارہ کر رہے ہیں۔“

سکندر نے ایک بار پھر ناصر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”پہلے یہ بتاؤ جس مکان میں تم نے نواز کو جاتے ہوئے دیکھا تھا وہ کس کا مکان ہے؟“

”وہ خالی مکان ہے۔ اس کا مالک اسی شہر میں رہتا ہے۔“ مراد نے بتایا۔

”اس لڑکی کو ہم کسی طرح سے دیکھ سکتے ہیں۔“ سکندر نے اپنی گردن اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

مراد نے دونوں کی طرف متانت سے دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ معاملہ کچھ گہرا ہے۔ اس نے کچھ سوچا اور کہا۔ ”میں تم دونوں کو ابھی لے جاتا لیکن چوہدری صاحب کا کام صبح ہونا

ہے۔ رکتا بھی ضروری ہے۔ چوہدری صاحب کو میں اپنے رکنے کی اطلاع بھی دے چکا ہوں اور انہوں نے تاکید کی ہے کہ میں کام ختم کر کے ہی واپس لوٹوں۔ کام بھی ایسی نوعیت کا ہے کہ غفلت مہنگی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے جیسے ہی میرا کام ختم ہو تم دونوں میرے ساتھ چل سکتے ہو۔“

”کل کتنے بجے واپسی ہے؟“ سکندر نے پوچھا۔

”دو پہر ہو جائے گی۔“ مراد نے بتایا۔

”اور ابھی ہم اس بیچ میں گاؤں نہیں جاسکتے؟“ سکندر نے کہا۔

”مجبوری ہے۔ چوہدری صاحب کا کیا ہے وہ ابھی حویلی آکر بیٹھے ہوں اور پھر کام کے معاملے میں وہ سخت ہیں اور اگر ہم راتوں رات چلے بھی جائیں تو مٹی دو باتیں اپنی طرف سے لگا کر کچھ ایسا بتائے گا کہ میرے لئے چوہدری صاحب کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ مجھے کام ختم کر کے ہی جانا ہوگا۔ کل چلے جائیں گے۔“ مراد نے کہا۔

”لیکن ہم لڑکی کو دیکھ کر کیا کریں گے۔ ہم اسے پہچانتے ہی نہیں ہیں۔“ ناصر نے کہا۔

سکندر چپ ہو گیا۔ ”ہمارا کو ساتھ لے کر چلیں گے۔“

”اب تو مجھے بھی بے چینی ہونے لگی ہے بتاؤ بات کیا ہے۔“ مراد نے مضطرب ہو کر

کہا۔

سکندر نے ناصر سے کہا۔ ”اس بات کا علم ان دونوں کو نہیں ہونا چاہئے۔ ہم صرف حماد کو ساتھ لے کر جائیں گے۔ مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ وہ لڑکی وہی ہے۔ جس نے بھاگ کر اس حویلی میں پناہ لے لی ہے۔“

”حماد کون ہے؟“ مراد نے پھر پوچھا۔ ”کچھ مجھے بھی بتاؤ گے کہ نہیں؟“

”ایک بات اور بتاؤ..... وہ جو چوہدری کا بھتیجا ہے..... وہ کیا کر رہا ہے وہاں۔“

سکندر نے پوچھا۔ ”اور وہ لڑکی سے ملا تھا؟“

”وہ بھی تاش کا ایک پتا ہے۔ چوہدری صاحب نے اس سے بھی کچھ پرانا حساب

کتاب کرنا ہے۔ مجھے ان کے حکم کا انتظار ہے کہ کب اس کی گردن اپنے ہاتھوں میں لوں۔“

مراد نے بتایا۔ ”ہاں وہ لڑکا اس لڑکی سے ملا تھا۔“

”کیا نام ہے اس لڑکے کا؟“ سکندر نے پوچھا۔

”اس کا نام ایاز ہے۔“ مراد نے بتایا۔

سکندر اس کا نام دہرانے لگا۔ پھر اس نے ناصر سے پوچھا۔ ”یہ نام ہم نے پہلے بھی

کہیں سنا ہے۔“

”اتنے لوگ تم سے ملتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا نام ہوگا۔“ مراد نے کہا۔ ”ویسے وہ

اسی شہر کا رہنے والا ہے۔“

”اس لڑکے کا بھی پتہ کرنا ہوگا کہ وہ وہاں کیا کر رہا ہے۔“ سکندر نے کہا۔

”اس کا بھی پتہ کر لینا، لیکن مجھے تو کچھ بتاؤ سارا ماجرہ کیا ہے۔“ مراد نے مزید مضطرب

ہو کر کہا۔ پھر سکندر اسے ساری کہانی سنانے لگا۔ مراد اس کی بات بغور سننے لگا تھا۔

☆=====☆=====☆

آفتاب خان کے سامنے ایک قیمتی گھڑی پڑی ہوئی تھی، جس کی چین ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ گھڑی طارق کے مکان سے ایک کرسی کے نیچے سے پڑی ملی تھی۔ آفتاب نے دیکھا کہ طارق کے بازو پر ایک عام سی گھڑی موجود ہے۔ وہ جس کمپنی کی گھڑی تھی، آفتاب اس کمپنی کا نام بار بار پڑھ کر دہراتے ہوئے کچھ سوچ بھی رہا تھا جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آفتاب کو جب کچھ بھی یاد نہ آیا تو اس نے گھڑی واپس بھجوا دی لیکن اس کی سوچ کسی خانے میں ضرور انک گئی تھی۔

اپنی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد جب آفتاب اپنی رہائش کی طرف جا رہا تھا تو اچانک سامنے سے رضوان آتا دکھائی دے گیا۔ آفتاب نے جیب اس کے پاس روک دی۔

”واک ہو رہی ہے؟“ آفتاب نے پوچھا۔

اس نے آفتاب کی طرف دیکھا تو مسکرا کر بولا۔ ”ہاں اس وقت کچھ چہل قدمی کے لیے باہر نکل آتا ہوں۔“

”جیسے جیسے انسان کے پاس دولت آتی جاتی ہے، وہ اپنی صحت کے بارے میں بھی سوچنے لگتا ہے۔“ آفتاب نے مسکرا کر کہا۔

”صحت ہوگی تو سب کچھ ہوگا۔ تم سناؤ کہاں جا رہے ہو؟“ رضوان نے پوچھا۔

”واپس اپنے گھونسلے میں جا رہا ہوں۔“ آفتاب نے جواب دیا۔ ”آؤ بیٹھو تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

رضوان اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ آفتاب نے جیب سڑک کے ایک طرف کنارے پر کھڑی کر دی تھی۔ رات کا اندھیرا چھا گیا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ رضوان نے پوچھا۔

”میں اس شہر میں کچھ لوگوں کو پکڑنے کے لیے آیا ہوں اور اس کام میں الجھ کر رہ گیا ہوں لیکن جب بھی میں تیمور کے بارے میں سوچتا ہوں میرا خون کھولنے لگتا ہے۔“ آفتاب نے متانت سے کہا۔

”تم اب بھی ویسا ہی سوچتے ہو؟“ رضوان نے بھی متانت سے کہا۔

”جب تک میرا انتقام پورا نہیں ہو جاتا میرے اندر کی سوچ تبدیل نہیں ہوگی۔ اگر تم مجھے یہاں نہ ملتے تو میں تمہاری طرف آئے والا تھا۔ ایک بات بتاؤ، تیمور کیا کاروبار کے علاوہ

بھی کچھ کرتا ہے؟“

”مثلاً.....؟“ اس نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”اس کی کچھ اور سرگرمیاں ہیں۔ جس میں وہ ملوث ہے۔ کچھ اُلٹا سیدھا.....“ آفتاب

نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”وہ تو کاروبار ہی کرتا ہے لیکن میں تمہاری بات کا مطلب ابھی تک نہیں سمجھا۔“

رضوان نے کہا۔

آفتاب نے سدرہ کا پلازے کی چھت سے ماتھے پر گولی کھا کر نیچے گرنے کی داستان

اختصار سے سنائی اور کہا۔ ”عین اس وقت آفتاب بھی اس چھت سے نیچے اُتر رہا تھا۔ وہ بارش

میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ میں اس وقت اس کی تلاشی نہیں لے سکا، اس

لئے کہ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں اس سے اس ذریعے سے انتقام لے رہا ہوں۔ میرے ہاتھ

اور زبان اس کی اس بات نے روک لئے تھے لیکن بعد میں میں اپنے آپ پر بہت برسا کہ

میں نے اس کی بات کی پرواہ کیوں کی تھی۔“

رضوان نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تمہارا خیال ہے کہ اس لڑکی کا قتل تیمور نے کیا

ہے؟ ایک بار میں بھی لفٹ کے ذریعے سے تیسری منزل کی بجائے پانچویں منزل پر چلا گیا تھا

اور پھر تیمور کا ایسے کام سے کیا تعلق، وہ ایک کاروباری شخص ہے۔“

”لیکن میرا شک ہے کہ تیمور نے ہی اسے قتل کیا تھا۔ تم میری اس سلسلے میں مدد کرو۔“

آفتاب نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ رضوان نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے

دیکھا۔ ”تمہارا شک فضول ہے۔“

”تمہارا تیمور سے تعلق تو ہوگا۔“ آفتاب نے پوچھا۔

”ہاں ہے۔“ رضوان نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تم اس سے ملو، اور جاننے کی کوشش کرو کہ وہ بزنس کے علاوہ اور کن سرگرمیوں میں

ملوث ہے۔“ آفتاب نے کہا۔

رضوان اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”آفتاب..... تمہارے سر پر تیمور بری طرح سے

سوار ہے۔ اب تم اس کے بارے میں کچھ بھی سوچ سکتے ہو، یہ غلط ہے۔“

”یہ غلط نہیں ہے وہ کسی نہ کسی معاملے میں ضرور ہے۔“ آفتاب نے پُر یقین لہجے میں

کہا۔

رضوان اس کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے پھر کہا۔ ”کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ تم تیمور کے بارے میں سوچنا ہی بند کر دو؟ اگر تم ایسا کرو گے تو اس کے بارے میں تمہاری ہر غلط فہمی خود بخود دور ہو جائے گی۔“

اچانک آفتاب نے چونک کر کہا۔ ”ایک بات بتاؤ.... جب کالج میں میری اور تیمور کی

لڑائی ہوئی تھی تو اس وقت کس کی گھڑی کھو گئی تھی، اور کسے ملی تھی، تب کون تھا کہ جس نے یہ

دعویٰ کیا تھا کہ یہ گھڑی میری ہے۔ اس کمپنی کی گھڑی میں ہی اس سارے کالج میں پہنتا

ہوں۔ جسے وہ گھڑی ملی تھی وہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اور دعویٰ کرنے والا اپنی

بات پر قائم تھا۔ ایسی باتیں ہوئی تھیں۔ جو مجھے اب یاد نہیں آ رہا کہ کون تھا کیونکہ میں اس

وقت زخمی تھا اور ہسپتال میں تم لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے کبھی توجہ سے اور کبھی سنی ان سنی

انداز میں سنتا تھا۔“

”وہ پرانی باتیں اب تمہیں کیوں یاد آرہی ہیں۔ اس وقت ہوئی تھیں یہ باتیں اور اس

بات پر بھی کالج کے لڑکوں میں ایک ہنگامہ سا ہو گیا تھا۔“ رضوان نے کہا۔

”مجھے بتاؤ..... کیوں کہ میں نے تب وہ بات غور نہیں کی تھی، لیکن اب میرا ذہن بار بار

اُن باتوں پر جا رہا ہے۔“ آفتاب نے کہا۔

”تم سے لڑتے ہوئے وہ قیمتی گھڑی گر گئی تھی۔ وہ گھڑی تیمور کی تھی جو اس کے باپ

نے بڑے شوق سے تیمور کو لے کر دی تھی اور یہ سچ تھا کہ اس کمپنی کی گھڑی کالج میں کوئی لڑکا

باندھ کر نہیں آتا تھا۔“ رضوان نے بتایا۔

آفتاب نے سنا تو اس کا دھیان فوراً اس گھڑی کی طرف چلا گیا، جو اسے طارق کے گھر

سے ملی تھی۔ وہ گھڑی اسی کمپنی کی تھی۔

”تیمور کا اب بھی ویسی ہی گھڑی پہننے کا شوق ہے کہ ختم ہو گیا ہے۔“ آفتاب نے

پوچھا۔

”اس کا اب بھی شوق ہے۔ میں اب بھی اس کی کلائی پر اس کمپنی کی قیمتی گھڑی دیکھتا

ہوں۔“ رضوان نے کہہ کر پوچھا۔ ”لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”آج کے واقعے کے ساتھ بھی تیمور کا کوئی تعلق ہے۔“ آفتاب نے خود کلامی کے

انداز میں کہا۔

”کون سے واقعے کے ساتھ؟“ رضوان نے اس کی طرف دیکھا۔

”رضوان تم کہاں جاؤ گے میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔“ آفتاب نے پوچھا۔

”ابھی میری واک ختم نہیں ہوئی۔ مجھے اسی جگہ اُترنا ہے۔“ رضوان نے کہا اور اس کی لطفِ تخمیر نگاہوں سے دیکھتا ہوا جیب سے نیچے اُتر گیا۔

آفتاب نے جیب واپس گھمائی اور اس سمت کی طرف چل پڑا، جہاں کا پتہ چھندے نے آفتاب کو لکھوایا تھا۔ طارق کی گرفتاری، اس کے مکان کی تلاشی اور دوسری باتوں کے بیچ نہ کچھ اور پوچھا گیا اور نہ ہی اس وقت چھندے کی اس بات پر غور کیا گیا تھا کہ جب اس نے توں باتوں میں کہا تھا کہ یہ اس مکان میں کسی کے ساتھ لڑ بھی رہا تھا۔ آفتاب کو یاد آیا کہ وہ اس بارے میں کوئی سوال کرنا بھی چاہتا تھا کہ کوئی اہم فون آگیا تھا، اور کم از کم فون پر پچیس منٹ کی گفتگو کے بعد اس بارے میں پوچھنا ذہن سے نکل چکا تھا۔

چھندا اپنے چچا کے گھر میں تھا۔ آفتاب کو دیکھ کر وہ یک دم گھبرا گیا تھا۔ تسلی دینے کے بعد آفتاب اسے اپنی جیب میں لے گیا تھا اور اس سے کہا۔

”مجھ سے ڈرنے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ چھندے نے کہا۔

”ابھی کچھ نہیں بھی بتایا۔“ آفتاب نے کہا۔

”میں نے کچھ نہیں چھپایا ہے۔“ چھندے نے کہا۔

”یہ بتاؤ کہ اس دن طارق کے ساتھ کس کی لڑائی ہوئی تھی۔“ آفتاب نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے لڑنے کی صرف آوازیں آرہی تھیں۔ میں تو اس کمرے میں بند تھا۔“ چھندے نے کہا۔

”تمہیں کمرے میں کیوں بند کیا تھا؟“ آفتاب نے پوچھا۔

”مجھے کیا پتہ..... اس نے مجھے کمرے میں بند کر دیا تھا۔“ چھندے نے جواب دیا۔

”تمہیں کس نے کمرے میں بند کیا تھا؟“ آفتاب کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔

”وہ جو اس مکان میں آیا تھا۔ وہ اندر آیا اور اس نے مجھے کمرے میں بند کر دیا۔ پھر جب طارق آیا تو اس کے ساتھ لڑائی شروع ہو گئی۔“ چھندے نے کہا۔

”وہ کون تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔“ چھندے نے سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ کیسا تھا؟“ آفتاب نے پھر سوال کیا۔

چھندا کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے آفتاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ آپ جیسا تھا۔ آپ جیسا لمبا چوڑا اور جوان تھا۔“

”مجھ جیسا تھا۔“ آفتاب نے کہا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے تیمور آگیا تھا۔ کیونکہ اس کا ہی قد کاٹھ اور جسامت اس جیسی ہی تھی۔

”اگر وہ تمہارے سامنے آجائے تو تم اسے پہچان لو گے۔“ آفتاب نے پوچھا۔

چھندے نے پھر سوچا اور کہا۔ ”ہاں پہچان لوں گا لیکن وہ تو چلا گیا تھا اور طارق نے ہی میرے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں باندھی تھیں۔“

”میں تمہیں اس کے پاس لے کر جا رہا ہوں۔ تم اسے دیکھو اور پہچانو کہ کیا وہ ہی تھا۔“ آفتاب نے کہا۔

اس کی بات سن کر چھندا کچھ ڈر سا گیا اور بولا۔ ”میں نے سنا ہے کہ جب کوئی کسی کو پہچان لیتا ہے تو پھر اسے بڑی دھمکیاں ملتی ہیں اور اسے جان سے بھی مار دیا جاتا ہے۔ آپ مہربانی کریں اور مجھے اس کام میں نہ ڈالیں۔“

”تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ آفتاب نے کہا۔ ”تم اسے دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ کیا وہ ہی تھا جو اس وقت اس مکان میں آیا تھا۔ محکمہ ختمیں انعام دے گا۔“ آفتاب نے اسے لالچ دی اور مزید کہا۔

”میں ہی کیا سارا محکمہ تمہارے ساتھ ہے۔“ آفتاب نے جیب ایک بار پھر گھمادی۔ جس رفتار سے جیب تیمور کے گھر کی طرف جارہی تھی اس سے بھی کہیں زیادہ چھندے کا دل ڈر اور گھبرا رہا تھا۔ بہت سے وسوسے اس کے ذہن میں سوار ہونے لگے تھے۔ کئی سنی ہوئی باتیں اس کے ذہن میں اضافہ کر رہی تھیں۔

اپنے دروازے پر آفتاب کو کھڑا دیکھ کر تیمور کو حیرت ہوئی تھی۔ آفتاب نے چھندے کو اپنی جیب میں ہی بیٹھنے کی تاکید کی تھی اور اسے کہا تھا کہ وہ کہیں بھی اٹھ کر نہ جائے۔ اس صورت میں وہ اسے جیل میں بند کر دے گا۔ چھندا اس ڈر سے بھی اپنی سیٹ کے ساتھ چپک کر بیٹھ گیا تھا۔

”آؤ اندر آ جاؤ۔“ تیمور نے ایک طرف ہوتے ہوئے کہا۔

”تم سے ایک دو باتیں پوچھنی ہیں۔“ آفتاب نے کہا۔

”اندر بیٹھ کر پوچھ لو۔“ تیمور نے کہا۔

”نہیں میں اسی جگہ ٹھیک ہوں۔“ آفتاب نے کہا۔

”گھر آئے دشمن کو بھی ہم عزت دیتے ہیں۔ اندر آ جاؤ۔“ تیمور نے کہا۔

آفتاب کی نگاہ پہلی بار تیمور کے چہرے پر پڑے زخم پر گئی تو اسے اور بھی یقین ہونے لگا تھا۔ ”آج تمہاری کسی کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی؟“

”نہیں.....“ تیمور نے بلاتامل کہا۔

”جس کے ساتھ تمہاری لڑائی ہوئی تھی اس کا نام طارق تھا اور تم اس کے گھر میں اس کے ساتھ لڑے تھے۔ کیوں؟“ آفتاب نے کہا۔

”کون طارق.....؟“ تیمور کے لہجے میں اعتماد تھا۔

”میں بہت کچھ جان گیا ہوں۔ بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم اس کے مکان میں کیوں گئے تھے اور تمہارا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔“ آفتاب نے کہا۔

تیمور نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تم ایسے ہتھکنڈے کیوں اپنارہے ہو۔ بولو کہاں آؤں جہاں تم مجھ سے لڑنا چاہتے ہو۔ میں اب بھی تم سے نہیں ڈرتا لیکن تمہاری ایسی باتوں سے مجھے شک پڑتا ہے کہ تم مجھ سے ڈرتے ہو اور مجھے کسی اور معاملے میں پھنسا کر اپنا انتقام لینا چاہتے ہو۔“

”یہ بات تم نے میرے ساتھ دوسری بار کی ہے۔ یاد رکھو تمہارے سامنے ایک پٹھان کھڑا ہے۔ میرا انتقام ان تمام باتوں سے الگ ہے۔“ آفتاب کو بھی غصہ آ گیا تھا۔

”پھر تم ایسی حرکتیں کیوں کر رہے ہو۔“ تیمور نے کہا۔

آفتاب اسی وقت تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی جیب تک گیا۔ تیمور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جیب کے پاس جا کر اس نے چھندے سے کہا۔ ”باہر نکلو۔“ چھندا ڈرتا اور سہا ہوا باہر نکلا۔

اس جگہ کچھ اندھیرا تھا تیمور ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا کہ وہ کون ہے۔ پھر جیسے ہی چھندا روشنی

میں آیا ایک لمحے کے لیے تیمور اسے دیکھ کر چونکا۔ آفتاب نے چھندے کو تیمور کے سامنے لا

کھڑا کیا۔

تیمور نے چھندے کی طرف دیکھا اور اپنے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نہیں آنے دیا کہ جس

سے یہ لگے، وہ پہلے بھی اس سے مل چکا ہے۔ چھندے نے تیمور کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ

ڈر بھی رہا تھا۔ بہت سے اندیشے خوف کی شکل میں اس کے دل و دماغ پر قابض تھے۔

”کیا یہی وہ شخص تھا جو اس مکان میں آیا تھا اور جس نے تجھے کمرے میں بند کر دیا تھا؟“ آفتاب نے چھندے سے تیمور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

چھندا تذبذب کا شکار تھا۔ اس نے تیمور کے چہرے کی طرف ایک بار پھر دیکھا۔ تیمور

اس کے سامنے بے خوف کھڑا تھا۔ جب چھندا کچھ نہ بولا تو آفتاب نے پھر کہا۔ ”بتاؤ کیا یہ

وہی شخص تھا۔“

”ہا.....ں.....“ چھندے کے منہ سے انک کر نکلا۔

”کیا.....؟“ تیمور نے جلدی سے اس کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ چھندا ایک دم

گھبرا گیا اور فوراً نفی میں گردن ہلا کر بولا۔ ”نہیں..... نہیں.....“

”کیا کہہ رہے ہو تم..... پہلے تم نے کہا کہ ہاں..... اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت

نہیں ہے۔“ آفتاب نے کہا۔

”بس آفتاب خان..... بہت ہو گیا۔ یہ کیا ڈرامہ کر رہے ہو تم۔“ تیمور نے کہا۔

”یہ ڈرامہ نہیں ہے۔“ آفتاب نے کہا۔

”مجھے پھنسانے کا کوئی اور طریقہ تلاش کرو اور اگر لڑ سکتے ہو تو میرے ساتھ مردوں کی

طرح لڑو۔“ تیمور نے کہا۔

”تم بار بار ایک ہی بات مت کرو تیمور..... میری اور تمہاری لڑائی الگ ہے۔ یہ معاملہ

اس سے علیحدہ ہے۔“ آفتاب کو غصہ آ گیا تھا اس نے پیچ و تاب کھا کر کہا۔

”لیکن مجھے ایک ہی معاملہ لگ رہا ہے۔“ تیمور نے بھی کہا۔

چھندا جو پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا ان کی باتوں سے وہ مزید خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس کا دل

چاہا کہ وہ اس جگہ سے چلا جائے۔ کچھ بھی تھا۔ آفتاب کو کیوں کہ تیمور سے چڑھتی اس لئے وہ

ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ تیمور پر الزام ثابت ہو جائے اور وہ اسے سلاخوں کے پیچھے دھکیل

دے۔ چھندا جیب کی طرف چل پڑا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ آفتاب نے اسے پیچھے سے کہا۔ وہ غصے سے بولا۔

”مجھے جانا ہے..... آپ خواہ مخواہ ان کے سامنے مجھے لے آئے ہیں۔“ چھندے نے

کانپتے ہوئے کہا اور کوئی پرواہ کئے بغیر جیب میں کسی چھوٹے بچے کی طرح سہم کر بیٹھ گیا۔

آفتاب پھر تیمور کی طرف گھوما اور بولا۔ ”یہ تو ذہن اور دل سے کمزور ہے..... لیکن

ایک اور ثبوت ہے میرے پاس..... جس سے تم لڑے تھے اس کے سامنے تمہیں کھڑا کروں

گا۔“

”اس کے علاوہ اور بھی کچھ سوچنا ہے تو وہ بھی سوچ لو۔“ تیمور نے اطمینان سے کہا۔

”تم میری بات کو غیر سنجیدہ مت لو تیمور..... میں تمہیں چھوڑنے والا نہیں ہوں۔“

آفتاب کے لہجے میں سختی تھی۔ ”یہ جان کر رہو کہ تم آج کل کرتے کیا پھر رہے ہو۔“

”اور میں تمہاری ہر چال کو ناکام بنانے کے لیے کسی چٹان کی طرح تجھے ملوں گا۔“ تیمور

نے کہا۔

”ایک ہی وار سے میں نے یہ چٹان پاش پاش نہ کر دی تو میرا نام بھی آفتاب خان نہیں ہے۔“ اس نے مصمم ارادے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اپنا نام بدلنے کی فکر کر لو آفتاب.....“ تیمور نے کہا۔  
 ”کل کا سورج تمہاری زندگی میں ہلچل برپا کر دے گا۔“ آفتاب کو اس کی بات سن کر پھر غصہ آ گیا تھا۔

”دیکھیں گے۔“ وہ بولا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر دیکھا اور آفتاب اس جگہ سے چلا گیا۔ دروازے کے پیچھے ہی عشرت کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

سورج کی پہلی کرن کھڑکی سے اندر داخل ہوئی تو حماد نے اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے میں فرش پر بھیچھی چٹائی پر ایک چھوٹی گرم چادر لئے کھڑی بنالینا تھا۔ ساری رات وہ جاگتا رہا تھا اور سوچوں کی آغوش میں رہا تھا۔ ابھی ڈیڑھ، دو گھنٹہ قبل ہی اس کی آنکھ لگی تھی۔

حماد اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے جو رات کو فیصلہ کیا تھا، وہ اس پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس جگہ سے فرار ہو سکے۔ وہ عشرت سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ عشرت کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دے۔ اس کے بعد اسے سزا ملتی ہے کہ معافی اس کی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔

حماد کچھ دیر اسی طرح سے بیٹھا رہا تھا۔ اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا صبح کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ اس نے کھڑکی کا ایک پٹ کھولا تو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے نکل آیا اور وہ کانپ کر رہ گیا لیکن اسے اچھا لگا۔ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ اچانک اس کی نگاہ کھڑکی کے نیچے پڑی۔

کھڑکی کے نیچے سات فٹ کے فاصلے پر بالکونی تھی اور بالکونی سے نیچے بارہ فٹ کے فاصلے پر سڑک تھی۔ حماد نے دیکھا کہ دور بازار میں ایک دودھ دی اور بیکری کی دکان کھلی ہے، جبکہ باقی سارا بازار بند تھا۔

حماد نے سوچا کہ اگر وہ بالکونی میں اتر جائے تو وہاں سے نیچے اترنا اس کے لیے آسان ہوگا؟ فرار ہونا ہے تو کچھ کرنا ہی ہوگا۔ اس نے سوچا اور ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھا، کوئی

نہیں تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر نکلا اور سنبھل کر نیچے لٹکتے ہوئے کھڑکی سے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ وہ ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ سیدھا بالکونی میں جاگرا۔ وہاں سے اس نے نیچے کی طرف دیکھا۔ بالکونی کے ساتھ ہی ایک پائپ نیچے کی طرف جاتا تھا۔ حماد نے وقت ضائع کرنے کی بجائے اس پائپ سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ جونہی وہ پائپ کے ساتھ لٹکا وہ تیزی سے نیچے کی طرف آیا، اس کے ہاتھ پائپ پر گر گرتے ہوئے نیچے جا رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے ہاتھوں سے آگ نکلنے لگی ہے۔ جونہی اس کے پاؤں زمین سے لگے، اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور انہیں اپنی بغل میں لے لیا۔

ایک دم اس نے اپنی تکلیف کو نظر انداز کیا اور ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ بھاگتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے اس طرف رات کو ہی غور کر لیا ہوتا تو وہ اسی وقت اس جگہ سے فرار ہو سکتا تھا۔

تیز بیل نے عشرت اور تیمور کو یک دم چونکا دیا تھا۔ تیمور نے دروازہ کھولا تو سامنے خوفزدہ انداز میں حماد کھڑا تھا۔ تیمور نے اس کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

”السلام.....م علیکم۔“ حماد نے ایک بار تیمور کی طرف دیکھا اور پھر اپنی نظریں چرائیں۔  
 ”وعلیکم السلام.....“ تیمور اس کی طرف حیرت سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے راستہ چھوڑ

دیا تھا اور حماد اندر چلا گیا تھا۔ صبح حماد کو اچانک اپنے گھر میں دیکھ کر عشرت کو بھی حیرت ہوئی تھی۔ جب وہ پہلے بھی آیا تھا تو اس کا چہرہ پریشان تھا۔ اب بھی جب عشرت نے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر ویسی ہی ویرانی تھی۔

”تم ٹھیک ہو حماد.....؟“ عشرت نے پوچھا۔  
 ”میں ایک ضروری بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔“ حماد نے کہا۔ تیمور اس کے پیچھے

کھڑا تھا۔

”ہاں آؤ اور اطمینان سے بیٹھ کر بات کر لو۔“ تیمور نے کہا۔

حماد نے کچھ دیر کھڑے ہو کر مضطربانہ انداز میں عشرت کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے اس کی طرف بڑھ کر رو دینے کے انداز میں اپنے ہاتھ اس کے آگے باندھ کر کہا۔ ”مجھے معاف کر دیجئے..... جو بھی ہوا وہ میرے علم میں نہیں تھا۔ میں اس سے بے خبر تھا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں اور جیسے ہی مجھے پتہ چلا میں نے فوراً اس کی مدد کی.....“

تیمور اور عشرت ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک حماد کو کیا ہو گیا ہے اور وہ کیا کہہ رہا ہے۔



”تم کیا کہہ رہے ہو؟“ عشرت نے کہا۔

”وہ منخوس گھڑی تھی جب میں ان لوگوں کے ساتھ ملا تھا۔۔۔ نہ میرا پاس میری سب کے سامنے بے عزتی کرتا۔۔۔ اور نہ میں اپنے دل میں یہ ٹھانتا کہ اب کچھ بھی ہو کیسے بھی ہو میں اپنا ہی بزنس کروں گا۔۔۔ کسی بھی قیمت پر نوکری نہیں کروں گا۔۔۔ اور میں نے بیس لاکھ روپے کے لیے ان کا ساتھ دیا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ جس لڑکی کو اغوا کر رہے ہیں۔۔۔ وہ نازلی ہے۔“ حماد کی اس بات سے عشرت کے ساتھ ساتھ تیمور بھی چونک پڑا۔ دونوں نے پہلے سے بھی زیادہ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”نازلی؟“ عشرت دو قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور متحیر ہو کر کہا۔  
”تم کیا جانتے ہو نازلی کے بارے میں اور۔۔۔ اور تم کیا کہنا چاہتے ہو۔۔۔ صاف صاف کہو۔۔۔“

حماد نے اختصار سے نواز اور جمال کے ساتھ مل جانے کی کہانی سنائی اور اس کے بعد نازلی کو اغوا کر کے کہاں لے کر گئے اور کیسے اس نے نازلی کو پہچان کر اس کی مدد کی۔۔۔ سب بیان کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ”مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ نازلی ہے۔۔۔“

اچانک ایک زوردار تھپڑ کی آواز گونجی اور حماد کا ہاتھ اپنے گال پر چلا گیا۔ عشرت نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔ وہ اسے خون آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دانت پیس کر بولی۔  
”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم۔۔۔ تم میرے۔۔۔ سگے بھائی ہو۔“

”کچھ بھی کہہ لو۔۔۔ کوئی بھی سزا دے دو لیکن میں نے سچ بتایا ہے۔“ حماد کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ ”میں مجرم ہوں مجھے سزا دے دو، کچھ بھی کرو آپی۔ لیکن مجھ سے جو بھی ہوا وہ انجانے میں ہوا۔“

عشرت کا ہاتھ ایک بار پھر اسے مارنے کے لیے اٹھا لیکن تیمور نے بیچ میں آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور نرمی سے بولا۔ ”بس کرو۔۔۔ اس کے سچ پر یقین کرو۔۔۔ اس کا اعتراف مان لو۔۔۔“ پھر وہ حماد کی طرف گھوما اور اس سے پوچھا۔ ”نازلی کہاں ہے؟“

حماد نے چونک کر تیمور کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا نازلی گھر نہیں آئی؟“

”اگر گھر آئی ہوتی تو میں تم سے یہ سوال نہ کرتا۔“ تیمور نے کہا۔

”میں نے اس کے ہاتھ پاؤں کھول کر اسے کچھ روپے دیئے تھے اور کہا تھا کہ وہ گھر چلی جائے۔“ حماد کی حیرت دو چند ہو گئی تھی۔

”تم اسے خود گھر تک کیوں نہیں لے کر آئے تھے؟“ اس بار تیمور نے کچھ غصے سے کہا۔

”میں نے اس کے سامنے اپنا چہرہ عیاں نہیں کیا تھا۔۔۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ گھر چلی جائے گی اور میرا راز بھی آپ لوگوں پر نہیں کھلے گا لیکن میں بری طرح سے پھنس گیا۔“ حماد نے کہا۔

”ان لوگوں کے ساتھ اور کون ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”وہ ہے۔۔۔ سکندر۔۔۔ اس وقت بھی وہ دونوں اسی کے پاس ہیں۔ میں بھی ان کی قید میں تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میں نازلی کو اس گھر سے کسی طرح سے بھی لا کر ان کے حوالے کروں۔۔۔ میں وہاں سے فرار ہو کر آیا ہوں۔“ حماد نے بتایا۔  
”کوئی ایاز نام کا لڑکا بھی تھا تم لوگوں کے ساتھ؟“ تیمور نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ اس نام کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔“ حماد نے کہا۔

تیمور سوچنے لگا اور پھر وہ بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ نازلی ایاز کے پاس ہے۔۔۔ اس تک کیسے پہنچی یا وہ نازلی تک کیسے پہنچا۔۔۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔۔۔ یا پھر دوسری بات یہ ہو سکتا ہے کہ ایاز اس سارے معاملے سے واقف تھا۔۔۔ نازلی اب کہاں ہے اسے علم ہے۔۔۔ اور وہ اس کا فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہے۔“

”تم کیا کہہ رہے ہو؟“ عشرت نے پوچھا۔

تیمور نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”حماد نے جو بھی کیا غلط کیا تھا۔۔۔ اپنا بزنس کرنے کے لیے اس نے جو قدم اٹھایا وہ انتہائی غلط تھا۔۔۔ اس پر ہم بعد میں بات کریں گے لیکن پہلے میں اسے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ عشرت نے اس کی طرف دیکھا۔

”حماد ایک ذریعہ ہے کہ میں ان لوگوں کو ان کے انجام تک پہنچاؤں گا۔“ تیمور نے کہا۔

”تم ان کو ان کے انجام تک پہنچانے کی بات کیوں کرتے ہو؟ تم نازلی کو بچانے کی فکر کرو اور بس۔“ عشرت نے زور دیتے ہوئے کہا۔

”نازلی تک بھی پہنچوں گا لیکن ان کو بھی نہیں چھوڑوں گا جنہوں نے میری بہن کو اغوا کیا تھا۔“ تیمور نے کہا۔

”تو پہلے اس کا سراغ کے تن سے جدا کرو۔“ عشرت نے حماد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نفرت سے کہا۔

”جودہ کر رہے تھے وہ اس کے علم میں نہیں تھا اور جب اسے پتہ چلا تو اس نے نازی کی مدد کی.....“ تیمور نے کہا۔

”یہ اس کے جرم کی معافی کی دلیل نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کے ساتھ ملا ہی کیوں تھا۔“ عشرت بیخ پا ہو کر چیخی۔

”میں نے کہا ناں کہ تم اس پر بعد میں بات کر لینا اور نہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس کا اعتراف اس کے جرم کی معافی کی درخواست ہے۔“ تیمور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”میں نے تمہیں کہا تھا تیمور..... کہ وہ شخص اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے کچھ بھی کرے گا۔ اس تھپڑ کا بدلہ جو تم نے اس کے منہ پر مارا تھا اس نے نازی کو اغوا کر کے لینا چاہا ہے۔“ عشرت نے کہا۔

”اس کی سزا بھی اسے ملے گی۔“ تیمور نے کہا۔

”تم کسی عدالت کے جج نہیں ہو کہ کسی کو سزا دینے کا اختیار رکھو.....“ عشرت نے جھلا کر کہا۔

”میں انہیں انجام تک پہنچاؤں گا سزا قانون دے گا۔“ تیمور نے کہا۔

عشرت نے قہر آلود نگاہوں سے حماد کی طرف دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔ تیمور اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ پہلے اس نے ساری تفصیل اس سے سنی، نازی کو کہاں رکھا تھا اس کے بارے میں جانا..... اور پھر سوچتے ہوئے وہ ٹہلنے لگا۔ حماد چپ ایک طرف کھڑا تھا۔

”نور پور گاؤں کا قاصد اس شہر سے دور نہیں ہے۔ پھر نازی کہاں چلی گئی۔ اسے ایاز مل گیا تھا۔ یا وہ ان ہی لوگوں کے ساتھ پس پردہ شامل تھا؟ لیکن اگر وہ شامل تھا تو، اور نازی اس کے پاس ہے تو پھر وہ لوگ نازی کو حماد کے ذریعے سے کیوں دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے؟ کیا ایاز انہیں دغا دے گیا تھا؟ تیمور اس ضمن میں سوچتا رہا..... اور حماد چپ ایک طرف کھڑا رہا۔ ندامت اس کے چہرے سے مترشح تھی۔

”تمہارے پاس موبائل ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”ہاں ہے۔“ حماد نے فوراً کہا لیکن جیسے ہی اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف گیا اسے خیال آیا کہ کمرے میں بند کرنے سے قبل اس آدمی نے اس کا موبائل لے لیا تھا۔ ”نہیں وہ انہوں نے لے لیا تھا۔“

تیمور کمرے سے باہر چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک موبائل فون

تھا۔ اس نے فون حماد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہیں سکندر اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے فون نمبر پتہ ہیں۔“

”ہاں میری اتنی یادداشت ہے کہ ان کے فون نمبر میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔“ حماد نے کہا۔

”ٹھیک ہے اب تم ویسا ہی کرو گے جیسا میں کہوں گا۔“ تیمور نے موبائل فون اسے دیتے ہوئے کہا۔

☆=====☆=====☆

ایاز نے صبح ہوتے ہی ان تمام کاغذات کو آگ لگا دی تھی جس پر اس نے اس جگہ کے نقشے بنائے تھے جہاں اس نے تیمور کو بلانا تھا۔ سیاہ راکھ میں تبدیل ان کاغذات کو ایاز نے بڑی احتیاط سے ایک شاپر میں ڈال کر ایک الماری میں پڑے اخبارات کے نیچے رکھ دیا تھا۔

ایاز نے سب سوچ لیا تھا کہ اس نے تیمور کو کہاں بلانا ہے اور کس جگہ سے اس کی کار لے کر کہاں تک جا کر اس بیگ کو لے کر کار اسی جگہ چھوڑ کر فرار ہو جانا ہے۔ ایاز نے تیمور کو ریلوے اسٹیشن کے پاس ہی بلایا تھا۔ اسی جگہ سے اسے ٹرین میں بیٹھ کر کراچی کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے دوست سے کراچی رابطہ کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جیسے ہی آئے گا چند دنوں میں وہ اسے ملک سے باہر بھجوا دے گا۔

ایاز اپنے کمرے سے باہر نکل کر کچھ دیر باہر چہل قدمی کے لیے نیچے آیا تو وہ چونک پڑا۔ سامنے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے نواب دین براجمان تھا۔ اس کے سامنے منشی کھڑا تھا۔ جونہی ایاز وہاں گیا، نواب دین نے منشی سے اپنی توجہ ہٹا کر فوراً ایاز کی طرف دیکھا۔

”جاگ گئے ایاز؟“ نواب دین نے اس کی طرف مسکراہٹ بھرا کر بولا۔ ”آپ کب ایاز کو اس وقت نواب دین کا آنا ناگوار لگا تھا۔ وہ زبردستی مسکرا کر بولا۔“ آپ کب آئے..... اور اتنی سویرے؟“

”ہم کسی کے پابند تھوڑی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنے آپ کو گھڑی کی سوئیوں میں بھی قید نہیں کیا ہے۔ جب دل چاہا جس وقت چاہا، قدم اٹھا دیئے۔“ نواب دین نے مسکرا کر کہا۔ ”تم سناؤ کیسے دن گزر رہے ہیں۔“

”بہت زبردست۔“ ایاز نے کہا۔

”اس جگہ دل لگ گیا ہے۔“ نواب دین نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”اتنی اچھی جگہ پر کس کا دل نہیں لگے گا۔“ ایاز نے کہا۔

”کیا پتہ کیا تم نے..... وہ لڑکی کون ہے؟“ اچانک غیر متوقع انداز میں نواب دین نے سوال کر دیا۔

ایاز نے ایک نظر منشی کی طرف دیکھا جو نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ ایاز نے پہلے تو دل ہی دل میں منشی کو برا بھلا کہا کہ جس نے اپنے پیٹ میں بات نہیں رکھی اور نواب دین کو آتے ہی سب کچھ بتا دیا۔ حالانکہ یہ بات مراد نے بتائی تھی اور نواب دین نے آتے ہی منشی سے ساری تفصیل اس لڑکی کے بارے میں لی تھی۔ منشی نے کچھ بھی مخفی نہیں رکھا تھا۔

”وہ..... ابھی کھل کر بات نہیں ہوئی۔“ ایاز نے کہا۔ ”میں نے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی۔“

”لیکن منشی تو کہتا ہے کہ تم نے پتہ کیا تھا..... وہ کسی گھر سے بھاگ کر آئی ہے اور اس کی مرضی کے خلاف کہیں شادی ہو رہی تھی۔“ نواب دین نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر پیوست کرتے ہوئے کہا۔

کم بخت نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ایاز نے دل میں کہا اور بولا۔ ”یہ بات کنفرم نہیں ہے۔ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔“

”اندازہ لگایا ہے یا یہ سچ ہے؟“ نواب دین کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”مجھے معلوم نہیں ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”تو پھر کیا لڑکی سے پوچھیں؟“ نواب دین کا لہجہ بدستور ویسا ہی تھا۔ ایاز کو لگا کہ نواب دین کچھ اور ہی سوچ رہا ہے۔

”آپ پوچھ سکتے ہیں۔“ ایاز نے آہستہ سے کہا۔

”بہتر یہ نہیں ہے کہ تم خود ہی بتا دو..... آخر میں تمہارا چچا ہوں..... اور پھر تمہارے دوست کی طرح ہوں۔“ نواب دین نے کہا۔

”میں کیا بتاؤں۔“ ایاز نے بات کی گہرائی میں جاتے ہوئے کہا۔

نواب دین نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس جاتے ہوئے کہا۔ ”گزرتی ہوئی عمر انسان کو بڑھا پے کے قریب ہی نہیں کرتی بیٹا جی..... اسے بہت سے تجربات سے بھی آگاہ کرتی ہے۔ ہوا کا زرخ کیا صورت حال اختیار کرے گا، اس کا بھی پتہ دیتی ہے۔“

ایاز مسکرایا۔ ”ہاں... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں... لیکن میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا ہوں۔“

”تم مجھے پہلے ہی بتا دیتے کہ تمہارا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔“ نواب دین نے

زیر لب مسکرا کر کہا۔

ایاز ایک بار پھر چونکا۔ ”مقصد؟“

”میں جانتا ہوں..... تمہاری ماں ایک سخت دل عورت ہے۔ تمہاری بات کو وہ ایسے ہی رد کر دیتی ہے جیسے تمہارے باپ کی بات کی اسے پرواہ نہیں ہوتی لیکن تم مجھے صاف صاف کہہ سکتے تھے۔“ نواب دین نے کہا۔

ایاز اس کی بات کو کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ وہ بولا۔ ”لیکن آپ کیا سمجھتے ہیں۔“

”وہ ہی جو تم مجھے شاید بتانا نہیں چاہتے تھے۔“ نواب دین نے کہا۔

”میں آپ سے کوئی بات چھپا کر کیا کر سکتا ہوں۔“ ایاز نے چالاکی سے کہا۔ اس کا

ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اگلی بات کا اسے کیا جواب دینا ہے۔ جو بات نواب دین کے دماغ میں آئی ہے، اس کا موقع کی مناسبت سے کیا جواب بنتا ہے۔

”پھر تم نے یہ کیوں چھپایا کہ تم اس لڑکی کو چاہتے ہو۔ پہلے تم یہاں آئے اور پھر اس

لڑکی کو بھی ایک جھوٹی کہانی کے ساتھ حویلی میں لے کر آ گئے۔ تم دونوں شادی کرنا چاہتے ہو ناں؟“ نواب دین نے کہا کہ ایک بار ایک سی ہنسی اپنے منہ سے نکالی اور ہولے سے مکہ اس کے سینے میں مار دیا۔

ایاز بھی ہنسا اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اسے لگا کہ جیسے اس کا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ جیسے اس وقت جو بات ہوئی ہے وہ سراسر اس کے فائدے کی ہوئی ہے۔

”کیوں میں نے ٹھیک کہا ہے۔“ نواب دین نے اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

”چچا جان آپ بھی بس.....“ ایاز شرمانے کے انداز میں بولا۔

”تم منشی کو بے وقوف بنا سکتے ہو، لیکن مجھے نہیں۔ ماں نہیں مانی تھی یا اس کے گھر والے نہیں مانے تھے؟“ نواب دین نے پوچھا۔

”ماں کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔“ ایاز نے کہا۔

”اور اس کے گھر والے۔“ نواب دین نے کہا۔

”وہ ماں کی وجہ سے بدظن ہو گئے تھے۔“ ایاز نے فوراً کہا۔

”کس کی بیٹی ہے؟“ نواب دین پوچھا۔

”چچا جان اتنی گہرائی میں جا کر آپ کیا کریں گے۔ میں تو کل ہی منشی جی سے بہانے سے پوچھ رہا تھا کہ آپ کب آؤ گے۔ کیوں منشی جی میں نے پوچھا تھا ناں۔“ ایاز نے کہا۔

”ہاں کل آپ پوچھ رہے تھے۔“ منشی نے مسکرا کر کہا۔

نواب دین ہنس۔

”میں چاہتا تھا کہ آپ آئیں اور میرا بھی کچھ کریں۔“ ایاز نے کہا اور ایک بار پھر شرمایا۔ وہ شاطرانہ انداز اپنائے ہوئے تھا

”میں تمہارا ہی کچھ کرنے کے لیے آیا ہوں۔“ نواب دین نے متانت سے کہا اور ایک دم مسکرایا۔ ”لڑکی سے نہیں ملوؤ گے؟“

”آپ کی ہونے والی بہو ہے..... آپ نہیں ملیں گے تو پھر اور کون ملے گا لیکن آپ اس سے اس کے خاندان کے بارے میں کوئی بات مت کیجئے گا۔“ ایاز نے ہوشیاری سے کہا۔

”وہ کیوں؟“ نواب دین نے پوچھا۔

”وہ ذرا ڈری ہوئی اور سبھی ہوئی ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”میں اس سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔“ نواب دین نے کہا۔

نواب دین اور ایاز جیسے ہی نازلی کے کمرے میں گئے، نازلی ڈر کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ نواب دین اس کے قریب گیا۔ اس نے ایک حریص نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”مجھے ایاز نے سب بتا دیا ہے..... تمہیں ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم جیسا چاہو گی ویسا ہی ہوگا... بلکہ ہم جیسا چاہیں گے ویسا ہوگا۔“

نواب دین نے ایک بار پھر اپنی نگاہ اس کے چہرے پر پیوست کی اور اپنی مونچھ کو تانواؤ دے کر دل میں کہا۔ ”جو ہداری نواب دین..... تم نے دو شادیاں گاؤں کی عورتوں سے ہی کی ہیں.... اب تیسری شادی کے لیے تم کسی شہر کی لڑکی کی تلاش میں تھے۔ اس کا انتظام تمہاری حویلی میں ہی ہو گیا ہے۔ ایاز کے باپ سے یہ بھی میرا انتقام ہوگا۔“

نواب دین نے ایاز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دبایا اور دونوں نازلی کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ ایاز کچھ دیر بعد پھر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس غلط فہمی نے اس کے لیے آسانی پیدا کر دی ہے۔ جبکہ اپنے کمرے میں جو ہداری نواب دین فون پر مراد سے پوچھ رہا تھا۔ ”تم کب تک آرہے ہو؟“

”میں بارہ بجے کے بعد آ رہا ہوں۔“ مراد نے جواب دیا۔

”آ جاؤ..... آج تم نے ایک اور اہم کام کرنا ہے..... میں تمہارا نور پور والی حویلی میں

انتظار کر رہا ہوں۔“

مراد نے اپنا موبائل بند کر کے سکندر کی طرف دیکھا جو کچھ ہی فاصلے پر بیٹھا تھا اور اس نے کہا۔ ”جو ہداری صاحب حویلی میں آگئے ہیں۔“

”اب ہم حویلی میں نہیں جا سکیں گے؟“ سکندر نے چونک کر پوچھا۔

”ایسے ان کے سامنے جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ میں اپنا کام ختم کر کے سیدھا نور پور چلا جاؤں گا۔ جیسے ہی جو ہداری صاحب واپس چلے جائیں گے، میں تمہیں فون کروں گا۔ تم انتظار کرتا۔“

”کیا وہ آج ہی چلے جائیں گے؟“ سکندر نے پوچھا۔

”وہ زیادہ نہیں رکھتے..... چلے جائیں گے۔“ مراد نے کہا۔

مراد اپنے کام کے لیے نکل گیا تھا۔ تب ناصر بھاگتا ہوا سکندر کے پاس آیا اور بولا۔

”حماد اپنے کمرے میں نہیں ہے۔“

”نہیں ہے..... کہاں ہے؟“ سکندر چیخا۔

”وہ کھڑکی کے راستے بھاگ گیا ہے۔“ ناصر نے بتایا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ سکندر نے کہا اور اس کے ساتھ اس کمرے میں چلا گیا جہاں حماد کو انہوں نے بند کیا تھا۔ کھڑکی کا ایک پت کھلا ہوا تھا۔ نواز اور جمال کو بھی اس کمرے میں بلا لیا تھا۔ سب حیران تھے۔

”اس کمرے میں بند کرتے ہوئے تم نے اس بات کا خیال کیوں نہیں کیا کہ وہ اس جگہ سے بھاگ سکتا ہے۔“ سکندر نے کھڑکی سے بالکونی تک اور پھر نیچے تک دیکھتے ہوئے ناصر سے کہا۔

”اب یہ کیسے کہا جا سکتا تھا کہ وہ اس اونچائی سے نیچے اتر جائے گا۔“ ناصر نے کہا۔

سکندر نے نواز کے پاس جا کر پوچھا۔ ”تم کہہ رہے تھے کہ تم نے حماد کی کوئی ٹیپ تیار کی ہے؟“

”وہ تو میں نے شخص اسے ڈرانے کے لیے کہا تھا۔“ نواز نے کہا۔

سکندر کو یوں لگا جیسے ایک بار پھر تیمور کا تھپڑ اس کی گال پر پڑ گیا ہے۔ وہ چیخ کر بولا۔

”اب اُسے تلاش کرو... وہ جہاں بھی ہے۔ ورنہ میں تم دونوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ مجھے ایک دو گھنٹے کے اندر چاہیے۔“

”ہم کوشش کرتے ہیں۔“ نواز نے کہا۔

سکندر نے اس کا گریبان پکڑ کر اپنی طرف کھینچ کر کہا۔ ”کوشش نہیں مجھے حماد چاہیے۔“

اسی اثنا میں جمال کا موبائل فون بج اٹھا۔ اس نے پہلے سکندر کی طرف دیکھا اور پھر اپنا موبائل فون نکال کر اسکرین پر نمبر دیکھا اور کان سے لگا کر بولا۔ ”ہیلو۔“

”اگر تم کمرے میں اکیلے ہو..... تمہارے ساتھ صرف نواز ہے تو ٹھیک ہے..... ورنہ میری بات علیحدہ ہو کر سنو..... میں حماد بول رہا ہوں اور جو کہنا چاہتا ہوں وہ تم دونوں کے فائدے کی بات ہے۔“ دوسری طرف سے حماد نے بغیر رکے کہا۔

جمال نے ایک بار پھر سکندر کی طرف دیکھا جو دوسری طرف منہ کر کے کھڑا تھا۔ جمال کمرے سے باہر نکل گیا۔ ”ہاں بولو کیا بات ہے۔“

”سکندر تم دونوں کے ساتھ دھوکہ کر رہا ہے۔ اس کے مقاصد کچھ اور ہیں۔ جس میں تم پھنس جاؤ گے۔ میں نے ان کی باتیں سنی ہیں۔ تم دونوں کی زندگیوں کو خطرہ ہے۔ مجھے بھی اسی نے غائب کرایا ہے لیکن میں وہاں سے نکل کر اس وقت ڈرائیور ہوٹل میں چھپ کر بیٹھا ہوں..... یہ وہی ہوٹل ہے جو اب ویرانی کی تصویر بن چکا ہے۔ تم جانتے ہو گے۔“ حماد نے کہا۔

”ہاں میں جانتا ہوں۔“ جمال نے دروازے کی طرف دیکھ کر سرگوشی کی۔

”پھر یہاں آ جاؤ..... میں بتاتا ہوں کہ سکندر کیا کرنا چاہتا ہے۔“ حماد نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ یک دم دروازہ کھلا اور سکندر باہر آ کر بولا۔

”کس کا فون تھا؟“

”میرے ایک جاننے والے کا تھا۔ اس کے ذمے میں نے اس لڑکی پر نظر رکھنے کی ڈیوٹی لگائی تھی۔“ جمال نے فوراً بہانہ کیا۔

”کیا کہتا ہے وہ؟“ اس نے پوچھا۔

”اس نے ابھی تک اس لڑکی کو نہیں دیکھا..... مجھے ایک دو ایسی جگہ کا پتہ ہے جہاں حماد جاسکتا ہے..... ہم اسے پکڑ کر لاتے ہیں۔“ جمال نے کہا۔

”کہیں تم دونوں نے تو نہیں اسے غائب کر دیا۔“ سکندر نے اس کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم ایسا کیوں کریں گے۔ ہم خود اس وقت مصیبت میں ہیں اور آپ کی مدد کے بغیر کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔“ جمال نے کہا۔

”میں تم دونوں کو صرف دو گھنٹے دیتا ہوں۔ اسے کہیں سے بھی تلاش کر کے لاؤ۔ اگر اسے نہیں لاسکتے تو پھر اس لڑکی کو لے کر آؤ۔“ سکندر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”یاد رکھنا یہ شہر

تمہیں کہیں بھی پناہ نہیں دے سکتا..... کہیں چھپنے کی کوشش مت کرنا۔“

”میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہم آپ کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔“ جمال نے کہا۔

جمال اور نواز اس جگہ سے باہر نکل گئے۔ ناصر نے سکندر کے پاس جا کر کہا۔ ”تم نے ان دونوں کو جانے دیا..... یہ تو بھاگ جائیں گے اور کیا یہ اچھا نہیں تھا کہ ہم ان دونوں میں سے کسی کو نور پور لے جاتے اور اگر وہی لڑکی ہوتی تو اسے لے آتے۔ حماد جاتا ہے تو جائے۔“

”کبھی کبھی تم بے وقوف بن جاتے ہو۔ حماد اس لڑکی کی نشاندہی کرے گا تو ہم ساری رقم وصول کریں گے اور انہیں مجبور کریں گے کہ وہ پیسہ حاصل کرنے کے لیے کچھ اور ہاتھ پیر ماریں۔“ سکندر نے کہا۔

”ایک تیر سے تین تین شکار۔“ ناصر نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

”بابو کو فون کرو..... وہ باہر ہی بیٹھا ہے۔ وہ ان دونوں کی نگرانی کرے۔ جمال اور نواز اسے نہیں جانتے اس لئے انہیں یہ شک نہیں پڑے گا کہ ان کی نگرانی ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ان دونوں کا کام ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”ایک بار پھر یہ ہمیں اندھیرے میں رکھ کر چلنا چاہتے ہیں۔“

ناصر کے حکم سے بابو ان کے تعاقب میں نکل گیا تھا۔ حماد نے جو صورت حال تیمور کو بتائی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سکندر، نواز اور جمال کو اپنی نظر سے دور نہیں ہونے دے گا۔ اسے یقین تھا کہ اگر نواز اور جمال اس ڈرائیور ہوٹل تک آئے تو ان کے پیچھے سکندر کی نگاہیں بھی ضرور ہوں گی۔ وہ ایسا چاہتا بھی تھا۔

وہ ڈرائیور ہوٹل شہر سے نکلنے والی سڑک پر تھا۔ ہر ٹرک، بس اس جگہ ضرور رکتی تھی لیکن اچانک نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ وہ ہوٹل بند ہو گیا تھا اور پھر وہ کھنڈر کی تصویر بن گیا تھا۔ تیمور کی ہدایت پر حماد اس ہوٹل میں ایک ایسی جگہ پر چھپ کر بیٹھ گیا تھا جہاں سے دیوار میں رستہ بنا ہوا تھا جس سے وہ ضرورت کے وقت فرار ہو سکتا تھا۔

تیمور اس ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ایک گھنے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔ حماد اور تیمور میں موبائل فون پر رابطہ تھا۔ جیسے ہی نواز اور جمال ٹیکسی میں بیٹھ کر اس جگہ پہنچے، انہوں نے ٹیکسی کو فارغ کرنے کے بعد دائیں بائیں دیکھا اور پھر ہوٹل کے مین ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ جمال نے راستے میں ٹیکسی میں سوار ہونے سے قبل نواز کے گوش حماد کی سادہ بات گزاردی تھی۔ انہیں حماد کی بات پر یقین کرنا پڑا تھا۔ سکندر کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا تھا۔ انہیں خود بھی اس سے خطرہ تھا لیکن وہ اپنے مطلب اور تحفظ کے لیے

”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس جگہ سے نکلنا چاہئے۔“ نواز نے کہا۔

”یہ جگہ محفوظ ہے۔“ جمال نے اپنی نگاہیں چاروں طرف دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”کیوں

”حماد ٹھیک کہتا ہے۔“ نواز نے کہا

”یہ..... یہ لوگ مجھے اٹھا کر یہاں تک لائے ہیں۔“ حماد نے یک دم گھبراہٹ آمیز لہجے میں کہنا شروع کر دیا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ جمال چیخا۔

”یہ کہہ رہے تھے کہ ہم سکندر کو بیچ میں نہیں رکھنا چاہتے۔“ حماد نے پھر کہا۔ ”یہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے۔“

”تم..... ابھی کچھ اور کہہ رہے تھے اور اب تم نے بیان بدل لیا۔“ نواز غصے سے حماد کی طرف بڑھا لیکن اسے اپنے قدم اسی جگہ روکنے پڑے۔ سکندر نے دھاڑ کر اپنی بندوق کا رخ اس کی طرف کر کے کہا۔

”اسی جگہ رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا..... ایک بار پھر تم دونوں نے مجھے دھوکہ دیا

جونہی وہ دونوں اس ہوٹل کے اندر گئے۔ بابو بھی اپنی موٹر سائیکل پر اس جگہ پہنچ گیا۔ اس نے ایک طرف کھڑے ہو کر فون کیا لیکن اس سے بھی پہلے جب نواز اور جمال ابھی اس جگہ آکر رہے تھے، تیمور نے حماد کو اطلاع کر دی تھی۔

تیمور جیسا چاہتا تھا ویسا ہی ہوا تھا۔ نواز اور جمال کے تعاقب میں جو آدمی سکندر نے بھیجا تھا اسے دیکھ کر تیمور چونکا ہو گیا تھا۔

”کہاں ہو..... حماد.....؟“ نواز نے اندر جا کر متلاشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے پکارا۔

حماد جس جگہ چھپا ہوا تھا وہ باہر نکل آیا۔ ”وقت کم ہے۔ تم دونوں کو میرا بلانے کا مقصد یہ تھا کہ سکندر تم دونوں کو مار دینا چاہتا ہے۔“

”وہ ہمیں کیسے مار سکتا ہے جبکہ ہم نے اس کا پیسہ دینا ہے۔ وصولی کے بغیر وہ ہمیں اُنٹلی بھی نہیں لگا سکتا۔“ نواز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ میرے ذریعے سے اس لڑکی کو پھر سے اغوا کرنا چاہتا ہے۔ میں اپنی رشتہ داری بھول کر اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک دوسری جگہ بند کر دیا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ وہ تم دونوں کو مار دینا چاہتا ہے اور تاوان میں ملنے والا روپیہ کہیں زیادہ ہے۔ وہ خود ہی اس پر ہاتھ صاف کر دینا چاہتا ہے۔“ حماد نے بڑے اعتماد سے کہا۔

نواز اور جمال نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ نواز نے پھر کہا۔ ”لیکن تمہیں کب سے ہمارے ساتھ ہمدردی ہونے لگی ہے۔“

”مجھے تم دونوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔“ حماد نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”میں نے اپنے مطلب کے لیے تم دونوں کو یہاں بلایا ہے۔ کیوں اگر میں سکندر کا ساتھ دیتا ہوں تو مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ شاید اس کے بدلے مجھے بھی ایک گولی مل جائے..... لیکن تم دونوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے جس لاکھ روپیہ دو گے۔“

جمال اور نواز نے سوچا۔ جمال نے کہا۔ ”لڑکی کہاں ہے؟“

”ہے۔“

”ہم نے کوئی دھوکہ نہیں دیا ہے۔“ جمال نے کہا۔

”تو پھر یہ کیا ہے۔“ سکندر نے کہا۔ ”اب میں تم دونوں کو معاف نہیں کروں گا۔“

”بھون دو سکندر ان کو اور یہاں سے نکلو.....“ ناصر نے آگے بڑھ کر کہا۔

”حماد تم ہمارے ساتھ چلو گے۔“ سکندر نے اس بار اپنی بددق کا رخ اس کی طرف

کر لیا تھا۔

”سکندر بھائی اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے..... یہ دونوں مجھے یہاں تک لائے

تھے۔“ حماد نے کہا۔ اس کے کان باہر کچھ سننے کے لیے بے تاب تھے۔

”تم ڈرو نہیں..... میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“ سکندر نے کہا۔ ”جو بھی کہوں گا ان کو کہوں

گا کیوں کہ انہوں نے مجھے ایک بار پھر دھوکہ دیا ہے۔ اب میں اپنا پیسہ ان سے ابھی اور اسی

وقت وصولوں گا۔“

”تم نے اس کی بات پر یقین کر لیا ہے اور ہماری بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی.....

اسی نے مجھے فون کر کے یہاں بلایا تھا۔“ جمال نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔

”تم اپنی بولتی بند رکھتے ہو کہ نہیں۔“ ناصر غصے اس کی طرف بڑھا اور اس کا گریبان پکڑ

کر اپنا پستول اس کے سر پر رکھ دیا۔

”سکندر اسے کہو کہ یہ میرا گریبان چھوڑ دے.....“ جمال نے کہا۔ اسے بھی غصہ آ گیا

تھا۔

”نہیں چھوڑا تو کیا کر لو گے۔“ ناصر اور سیخ پا ہو گیا تھا۔

”اچھا نہیں ہوگا۔ پستول میرے پاس بھی ہے۔“ جمال نے مزاحمت کرتے ہوئے

کہا۔

”مجھے کھلونے کی دھمکی دیتا ہے۔“ ناصر اس کے ساتھ الجھنے لگا تھا۔

”ناصر چھوڑ دو اسے۔“ سکندر نے کہا۔

”نہیں چھوڑوں گا۔“ ناصر بولا۔

نواز نے آگے بڑھ کر ناصر کا بازو پکڑ کر کھینچا اور ناصر نے جمال سے اپنا پستول ہٹا کر

اس کا رخ نواز کی طرف کیا اور گولی مار دی، جو کہ سیدھی اس کے سینے پر لگی اور نواز ترپ کر

فرش پر جا گرا۔ اسی اثنا میں جمال نے بھی اپنا پستول نکال لیا اور ناصر پر فائر کھول دیا۔ سکندر

کے ساتھ کھڑے آدمی نے جمال پر گولی چلا دی اور ایک گولی اس آدمی کے بھی جا لگی۔ نواز کا

جسم تو ساکت ہو گیا تھا لیکن وہ تینوں تڑپنے لگے تھے۔ سکندر ابھی حیرت سے دیکھ ہی رہا تھا

کہ باہر ایمر جنسی پولیس کی گاڑی کا ہوٹر بجنے کی آواز سنائی دی۔ انہیں تیمور نے اطلاع کی

تھی۔ سکندر نے ایک نظر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نگاہ اس جگہ گئی جہاں حماد کھڑا

تھا لیکن وہاں حماد نہیں تھا۔ وہ اسی وقت نکل گیا تھا جب وہ آپس میں الجھ پڑے تھے اور اس

وقت وہ تیمور کے ساتھ کار میں بیٹھا تھا جو ایک طرف نظروں سے اوجھل کھڑی تھی۔

پولیس ہوٹل کے دروازے کے پاس آ کر پوزیشن لے چکی تھی۔ سکندر کی نگاہ اسی رستے

پر پڑی اور وہ اس راستے کی طرف بھاگنے لگا تو ناصر نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ شدید زخمی

تھا۔ وہ اپنی لڑکھاتی آواز میں بولا۔ ”مم..... میں نے کتنا..... تم..... ہارا..... ساتھ دیا.....

اور..... تم..... مجھے..... چھو..... ڈ..... کر جا رہے ہو۔“

سکندر نے ایک جھٹکے سے اپنی ٹانگ چھڑا کر کہا۔ ”اب تم کس کام کے۔“ وہ اسی رستے

سے باہر نکل گیا۔ سامنے جھاڑیاں تھیں۔ وہ ان میں گم ہو کر بھاگنے لگا۔

نوثتی سانس..... اور بند ہوتی آنکھوں سے ناصر کو وہ وقت یاد آیا جب وہ محلے میں

برے دوستوں کے ساتھ بیٹھے اُٹھتے پہلی بار جیل گیا تو واپسی پر اس کی ماں نے اس کی التجا

کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”تو جس راستے پہ چل نکلا ہے اس کا انجام گولی ہے.....“

ناصر نے ایک ہچکی لی اور آخری سانس کے ساتھ اس کے منہ سے نکلا۔ ”ما..... س۔“

اس کے ساتھ ہی اسلحہ تانے پولیس اندر آ گئی۔ تیمور نے بھی اپنی گاڑی کا رخ سڑک کی

طرف کیا اور اس سے بے خبر تھے کہ سکندر وہاں سے فرار ہوتے ہوئے تیمور اور حماد کو ایک

ساتھ دیکھ چکا تھا۔

☆=====☆=====☆

چوہدری نواب دین کو مراد کا شدت سے انتظار تھا۔ نواب دین اس لڑکی کے بارے

میں ہی سوچے جارہا تھا۔ پہلی ہی نگاہ میں اسے نازلی اچھی لگی تھی۔ اس کے خاندان میں ایک

سے زائد شادیاں کر لینا کوئی عار نہیں تھا۔ وہ زمینوں کے مالک تھے۔ پہلی بیوی سے رائے لینا

بھی ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ خاندان میں دوسری اور تیسری خوبصورت بیوی

لانا ان کے لیے زعم کی بات تھی۔

نواب دین نے سوچا کہ جب وہ اس لڑکی کو بیاہ کر اپنے خاندان میں جائے گا، تو اس کی

نئی بیوی دیکھ کر سب دنگ رہ جائیں گے۔ اس کا شملہ فخر سے اور اونچا ہو جائے گا۔ اُسے اس

بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ یہ لڑکی کون اور کس خاندان کی ہے۔ اپنے علاقے کے وہ بااثر

لوگ تھے۔ دولت اور افرادی قوت کے نشے میں پُور تھے۔

مراد آیا تو سیدھا نواب دین کے پاس چلا گیا۔ پہلے اس نے اپنا کام ہونے کی خوشخبری سنائی۔ جسے سن کر نواب دین نے خوش ہو کر کہا۔ ”بہت خوب..... یہ کام بھی ہو گیا۔ اب ہم اور بھی طاقت ور ہو گئے ہیں۔“

”جی چوہدری صاحب۔“ مراد نے کہا۔

”اب تم میرا دوسرا کام کرو گے۔“ نواب دین فوراً مطلب کی بات پر آتے ہوئے

بولے۔

”حکم چوہدری صاحب۔“ مراد نے شائستہ لہجے میں کہا۔

”ایاز کے باپ کے ساتھ میرا ایک پرانا حساب ہے۔“ نواب دین نے کہا۔

”میں جانتا ہوں جناب۔“ مراد نے کہا۔

”تم ایاز کو یہاں سے لے جاؤ اور اسے اپنا ج بنا کر کسی چوراہے میں بٹھا۔ لوگ اسے تڑپتا ہوا دیکھیں اور اسے کسی ہسپتال میں پہنچانے کی بجائے بھکاری سمجھ کر اس کے آگے سکے پھینک کر چلے جائیں۔ ایاز کے باپ سے میرا انتقام پورا ہو جائے گا۔ سانپ کے بچے کو میں نے اپنی آستین میں رکھا تھا۔ اب اسے باہر نکال دو۔“ نواب دین نے کہتے ہوئے نفرت آمیز انداز میں دانت پیسے۔ اس کا چہرہ کسی سفاک درندے کی طرح ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی جیسے پسیدی ختم ہو گئی تھی اور لگتا تھا وہاں سیاہی پھیل گئی ہے۔

”ایسا ہی ہوگا چوہدری صاحب۔“ مراد نے کہا۔

”یہ کام تم رات کو کرنا اور ابھی سے اس پر نگاہ اس طرح سے رکھو کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نگاہ سے اوجھل نہ ہو۔“ نواب دین نے کہا۔

”نہیں ہوگا چوہدری صاحب۔“ مراد نے کہا۔

”میں اب شہر جا رہا ہوں۔ اس کا صرف تمہیں پتہ ہوگا کسی کو نہیں بتانا کہ میں کہاں

ہوں۔“ نواب دین نے اسے تاکید کی۔

”کسی کو خبر نہیں ہوگی چوہدری صاحب۔“ مراد کی نواب دین کے آگے سعادت مندی کسی چھوٹے بچے کی طرح تھی۔ وہ جو کہہ رہا تھا وہ مان رہا تھا۔ کوئی سوال نہیں اور کوئی اپنی طرف سے بات نہیں تھی۔

”میں شہر وانی کوٹھی میں ہوں گا۔ اس بات کی بھی میں تمہیں ہی خبر دے رہا ہوں کہ میں اپنے ساتھ اس لڑکی کو لے جا رہا ہوں۔“ نواب دین نے کہا۔ یہ بات سن کر مراد ایک لمحے

کے لیے چونکا۔ وہ بولا۔ ”میں نے اس لڑکی سے نکاح کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

مراد نے جیسے ہی یہ الفاظ چوہدری نواب دین کے منہ سے سنے وہ بری طرح سے چونک پڑا۔

”چوہدری صاحب..... اچانک اتنا بڑا فیصلہ.....“ پہلی بار مراد نے کوئی سوال کیا۔

نواب دین ہنسا۔ ”ہم نے اپنے فیصلے کسی سے پوچھ گچھ کرنے ہیں؟ جانتے نہیں ہوں جب میں نے دوسری شادی کی تھی تو منٹوں میں اپنا فیصلہ لڑکی کے باپ چوہدری کرامت کو سنا دیا تھا۔ میں صرف اپنے دل کا غلام ہوں۔“

”چوہدری صاحب وہ لڑکی کون ہے کس خاندان کی ہے.....“ مراد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ جو بھی بعد میں ہوگا دیکھا جائے گا۔“ نواب دین نے لاپرواہی سے کہا۔ ”مجھے کسی ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی۔ تم جانتے ہو کہ میں نے ایک بار تم سے بھی کہا تھا۔“

”لیکن چوہدری صاحب.....“ مراد نے کچھ اور بھی کہنا چاہا۔

نواب دین نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور بولا۔ ”پہلے پیار سے..... بات بن جائے تو ٹھیک ہے ورنہ زبردستی کرنے کا ہتھیار تو ہمارے پاس ہے ہی..... تم سیکنہ کو میرے پاس بھیجو۔“

مراد کچھ نہ بولا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایاز تو اچانک اس طرف آ رہا تھا کہ اسے نواب دین اور مراد کی گفتگو سنائی دی، اس کے قدم فوراً اسی جگہ رک گئے تھے اور وہ دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے وہ نواب دین کی باتیں سن رہا تھا اس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ تب تو وہ دنگ رہ گیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ وہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جو نبی باہر نکلنے کے لیے مراد دروازے کی طرف بڑھا تھا، ایاز نے وہ جگہ دے پاؤں چھوڑ دی تھی۔

ایاز واپس اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ نواب دین کے بارے میں جان کر اسے دھچکا لگا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر اسے نازی کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ نازی کو کسی طرح سے یہاں سے اپنے ساتھ لے جائے اور تیمور سے پیسہ وصول کرنے کے بعد وہ نازی کو اس کے حوالے کر دے لیکن اس کے لئے نازی کو اس جگہ سے لے جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ خود تو کسی نہ



کسی طرح سے یہاں سے بھاگ سکتا تھا۔ نازی کو اپنے ساتھ لے کر جانا بہت بڑا خطرہ تھا۔ اس کے پاس وقت بھی کم تھا۔ کیوں کہ نواب دین کے جاتے ہی مراد کی نگاہیں اس پر پتھر ہو جائیں گی۔ وہ اس کی نگاہوں سے تب تک ہی محفوظ تھا جب تک کہ نواب دین اس حویلی میں تھا۔

ایک کوشش کرنے کی غرض سے اس نے اپنے کمرے سے باہر نکل کر نازی کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ یک دم اسے رکنا پڑا۔ سیکنہ، نازی کو اپنے ساتھ لے کر نواب دین کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ ایاز پلٹا، اس نے حویلی سے باہر نکلتے ہی مین گیٹ استعمال کرنے کی بجائے مالٹوں کے باغ میں بیچ بھاگنا شروع کر دیا، اور چھوٹے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

☆=====☆=====☆

ایاز اب نازی کے بغیر ہی تیمور سے روپیہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ نازی اب کسی بھی صورت تیمور سے رابطہ نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ نواب دین ایسا کرنے ہی نہیں دے گا اور وہ تیمور سے روپیہ لینے کے بعد اسے بتا دے گا کہ اس کی بہن نواب دین کے پاس ہے۔ اس کے بعد ان کے درمیان کیا ہوگا، اسے اس کی کوئی پروا نہ تھی۔

نواب دین نے سیکنہ کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ سیکنہ نے نازی سے اتنا کہا کہ اسے چوہدری صاحب شہر اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔

یہ سنتے ہی نازی خوش ہو گئی تھی۔ وہ سمجھی کہ ایاز اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ اس کے کہنے پر ہی اس کا چچا اسے اپنے ساتھ شہر لے جا رہا ہے تاکہ وہ اس کے بھائی کے حوالے کر سکے۔ وہ اس کے باپ کی عمر کا تھا، اس لئے اس کے دل میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ وہ سیکنہ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اس نے ایاز کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا کہ وہ ساتھ جا رہا ہے کہ نہیں جا رہا، وہ جانتی تھی کہ ایاز ابھی اس کے بھائی کے سامنے نہیں جائے گا، اس لئے اس نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ خوش تھی کہ ایاز کا چچا اپنا وعدہ نبھا رہا ہے۔ کیوں اس نے کہا تھا وہ ویسا ہی کرے گا جیسا وہ چاہے گی۔

اپنے سامنے نازی کو دیکھ کر نواب دین نے پہلے سیکنہ کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اس کی تعریف کی کہ وہ ایک سمجھ دار عورت ہے۔ اس نے ضرور کچھ ایسا اس لڑکی سے کہا ہوگا کہ وہ اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ نواب دین کو سیکنہ پر بہت اعتماد تھا۔ دوسری شادی کے لیے بھی سیکنہ نے اس کی بہت مدد کی تھی۔

”تمہاری زبان میں جادو ہے۔“ نواب دین نے سیکنہ کے پاس جا کر مسکراتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

سیکنہ کو کوئی ایسی کہانی نازی کو نہیں سنائی پڑی تھی۔ وہ تو شہر کا سن کر ہی اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اب جبکہ چوہدری نواب دین نے اس کی تعریف کی تو وہ پھولے نہ سماتے ہوئے اصل بات کو چھپا گئی۔ وہ ایک بڑے انعام سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ سیکنہ نے خوشی سے اپنی گردن کھڑی کر لی تھی۔

جانے سے پہلے نواب دین نے ایک بار پھر مراد کو تاکید کی کہ وہ ایاز پر اپنی نگاہ رکھے اور رات کو اس کا کام کر دے۔ مراد کا دھیان سکندر کی طرف تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سکندر اس کی فون کال کا انتظار کر رہا ہوگا۔

نازی نے اپنے نگاہ اٹھا کر متلاشی نگاہوں سے دیکھا کہ ایاز کہاں کھڑا ہے۔ وہ کہیں بھی دکھائی نہ دیا تو اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر اس کے سامنے نہیں آنا چاہتا ہو۔

”ایاز کہاں ہے؟“ اچانک نواب دین نے نشی سے پوچھا۔

”جی وہ اپنے کمرے میں ہوگا۔“ نشی نے جواب دیا۔ ”میں اسے بلاؤں چوہدری صاحب؟“

”نہیں رہنے دو..... وہ آرام کر رہا ہوگا۔“ نواب دین نے کہا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ جیب میں ایک ڈرائیور، اور ایک نواب دین کا گن مین تھا۔ اسے دیکھ کر مراد نے فکڑ سے کہا۔

”چوہدری صاحب..... کیا بات ہے آپ اپنے سارے گن مین نہیں لے کر آئے۔“

”اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔“ نواب دین نے لا پرواہی سے کہا۔

”کیوں ضرورت نہیں ہے..... ہماری دشمنی ہے اور.....“ مراد نے کہا۔

نواب دین اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”تم جانتے ہو کہ چھ مہینے پہلے ہم نے ان کو کیسا سبق سکھایا تھا۔ کسی نے بھی اب تک سر اٹھانے کی جرأت نہیں کی ہے۔“

”لیکن پھر بھی چوہدری صاحب احتیاط تو ضروری ہے۔“ مراد نے کہا۔

”یہ ایک ہی کافی ہے۔“ نواب دین نے اپنے گن مین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور جیب میں بیٹھ گیا۔ جیب حویلی کی حد سے باہر نکل گئی۔ مراد نے فوراً سکندر کو فون کیا تو سکندر نے اُسے آج ہونے والے واقعے کے بارے میں بتا کر کہا کہ وہ اس وقت ایک دوست کے پاس ریلوے پھانک کے پاس ہی چھپا ہوا ہے اور باہر کی صورت حال جاننے کی

کوشش کر رہا ہے۔ مراد نے اسے مزید کچھ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کہ سکندر نے خود بھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ اُلجھن کا شکار تھا۔

نازلی اپنے بھائی اور بھابی سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔ وہ ایاز کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ جس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اسے اب اس کی ہر بات پر یقین آ گیا تھا جو اس نے اپنے بارے میں بتائی تھی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس سے دوری ایک غلط فہمی تھی۔ وہ اب اپنے بھائی اور بھابی کی وہ غلط فہمی دور کر دے گی۔ نازلی نے سوچا اور وہ زیر لب ہولے سے مسکرا پڑی۔

راستے میں تقریباً آدھا گھنٹہ نواب دین اپنے ایک دوست کے پاس بھی رکا تھا۔ اس دوران نازلی، سیکینہ اور دونوں آدمیوں کے ساتھ جیپ میں ہی براجمان رہی تھی۔

ان ہی خیالوں میں وہ شہر کب پہنچ گئے نازلی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ اچانک ایک شور برپا ہو گیا۔ کان پھاڑ دینے والی آوازیں، چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ جیپ ڈرائیور کے اختیار سے باہر نکل کر سامنے کھبے کے ساتھ جا ٹکرائی۔ نازلی نے اپنے آپ کو سنبھالا، اس کے اوپر سیکینہ گری ہوئی تھی۔ پھر اس کی نگاہ سامنے ڈرائیور پر گئی، وہ خون میں لت پت اسٹیرنگ پر اوندھا پڑا تھا، اس کے ساتھ براجمان گن مین بھی اسی حالت میں تھا جبکہ نواب دین بھی خون میں نہایا ہوا بے جان جسم کے ساتھ پڑا تھا۔ نازلی کے کان میں کسی کی آواز پڑی۔ اس نے نفرت سے کہا تھا۔ ”ہم دشمنوں کی بھی عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔“ اس کے بعد ایک ساتھ دو، تین موٹر سائیکلیں تیزی سے چلنے کی آوازیں آئیں۔ نازلی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ چوہدری نواب دین کو اس کے دشمنوں نے گولیاں مار دی تھیں۔ وہ یک دم جیپ سے باہر نکلی اور اندھا دھند ایک طرف بھاگنے لگی۔ اسے یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرف اور کیوں بھاگ رہی ہے۔ اچانک وہ ایک مضبوط شخص کے ساتھ ٹکرائی۔

☆=====☆=====☆

ایاز نے مین سڑک پر آتے ہی تیمور کو فون کیا اور بولا۔ ”مجھے ابھی رقم چاہیے۔ تم فوراً ریلوے اسٹیشن کے باہر پہنچو۔“

”تم نے مجھے کوئی اور وقت دیا تھا۔“ تیمور نے کہا۔

”کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری بہن کو تمہاری فضول باتوں کی وجہ سے مار دوں۔“ ایاز نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”میں جیسا کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔“

تیمور نے اس کی بات برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ”نازلی کہاں ہے؟“

”وہ میرے ساتھ ہی ہوگی۔ جب میں تمہیں کار چھوڑ دینے کے لیے کہوں تو تم کار سے باہر نکل کر اس جگہ سے چلے جانا۔ پیسہ پورا دیکھ کر میں تمہیں بتا دوں گا کہ نازلی کہاں ہے۔“ ایاز نے کہا۔ ”بیگ میں پورا ڈیڑھ کروڑ روپیہ ہو۔ اس سے کم ہوا تو یاد رکھنا تم اپنی بہن سے کبھی نہیں مل پاؤ گے۔“

”مجھے نازلی اسی جگہ چاہیے..... ایک ہاتھ دو اور دوسرے ہاتھ لو۔“ تیمور نے کہا۔ ”میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے نازلی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہاں وہ پاس ہی کہیں ہوگی۔ میں تمہیں بتا دوں گا اور تم وہاں پہنچ جانا۔“ ایاز نے کہا۔

”میں پھر کہہ رہا ہوں کہ کوئی دھوکہ نہیں چلے گا۔“ تیمور نے کہا۔ ”فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو اور جیسا میں نے کہا ہے ویسا کرو۔ ریلوے اسٹیشن کے باہر پہنچو۔ تب تک کار میں رہنا جب تک میں فون نہ کروں۔ کوئی ہوشیاری نہیں... ورنہ کچھ اور بھی ہیں جو تم پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔“ ایاز نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اسی اثنا میں ایک کار اس طرف آرہی تھی۔ ایاز نے اس سے لفٹ لینے کا اشارہ کیا۔ کار اس کے پاس رک گئی اور ایاز کار میں بیٹھ گیا۔

تیمور نے فون بند ہوتے ہی سوچا کہ وہ کیا کرے۔ یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ ایاز کو محض روپے کی ضرورت ہے، وہ نازلی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر چلا جائے گا لیکن تیمور نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اسے اتنی آسانی سے نہیں جانے دے گا۔

تیمور نے عشرت کو کچھ ہدایت کی اور بیگ میں روپے اور اس کے نیچے کاغذات رکھ کر وہ اپنی گاڑی میں باہر نکل گیا۔ حماد کو اس نے اوپر کمرے میں رہنے کی ہدایت کی تھی۔

ایاز کار سے نیچے اترا تو اس نے ٹیکسی لی اور سیدھا ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ ایاز نے ٹیکسی سے اترتے ہی ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں سے وہ واضح طور پر تیمور کو دیکھ سکتا تھا۔ جس جگہ تیمور کو آکر رکنا تھا وہاں ابھی وہ نہیں آیا تھا۔

تیمور ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے آفتاب کی جیپ تیزی سے نکل کر اس کی کار کے آگے آکر رک گئی کہ تیمور کو اچانک اپنی کار کی بریک لگائی پڑی۔

آفتاب اپنی جیپ سے نکل کر اس کے پاس آیا اور جھک کر کار کے شیشے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اچانک تم پر نظر پڑ گئی تھی۔ اس لئے تمہیں روک لیا۔“

”مجھے کیوں روکا ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”یہ بتانے کے لیے کہ تم قسمت کے اچھے آدمی ہو۔“ آفتاب نے کہا۔ ”جس سے تم

نے لڑائی کی تھی۔ اس کا نام طارق ہے۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہے۔ کم بخت اس وقت ہسپتال میں لیٹا ہوا ہے۔ ورنہ تمہاری شناخت کے بعد تمہاری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جاتا۔“

تیور اس کی طرف دیکھ کر متسخرانہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ”تمہاری باتیں تم ہی جانو..... پتہ نہیں تم کس کے دھوکے میں مجھے گھسیٹ رہے ہو۔“

”کسی کے دھوکے میں نہیں بلکہ میں ٹھیک تمہیں ہی گھسیٹ رہا ہوں۔“ آفتاب نے کہا۔

”مجھے ایک کام سے جانا ہے۔ میرا راستہ چھوڑ دو تو مہربانی ہوگی۔“ تیور نے کہا۔

”اس بیک میں کیا ہے؟“ اچانک آفتاب نے پوچھا۔

”کچھ بھی ہو..... تمہیں کیا؟“ تیور نے متانت سے کہا۔

”پولیس والا ہوں..... مشکوک چیز چیک کر سکتا ہوں۔“ آفتاب نے کہا۔

”ایک شریف شہری کو تم اس طرح سے اپنے انتقام کا نشانہ نہیں بنا سکتے۔“ تیور نے اس کی دکھتی رگ پر پھر ہاتھ رکھ دیا۔ آفتاب اس کی بات سن کر تڑپ اٹھا اور اس نے غصے سے کہا۔

”تم مجھے ایک ہی بات کہتے ہو۔“

”کیونکہ تم اسی بات کے پیچھے مجھے نہ جانے کس جرم میں گھسیٹنا چاہتے ہو۔“ تیور نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ سب باتیں ایک طرف کل ٹھیک دس بجے کالج کے اسی درخت کے نیچے اسی گراؤنڈ میں میں تمہیں بلاتا ہوں۔ تمہاری ہڈی پبلی ایک نہ کردی تو میرا نام بھی آفتاب خان نہیں ہوگا۔ تجھے اپناج بنا کر پھر تمہارے ساتھ قانون کی بات کروں گا۔“

”میں کل دس بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔“ تیور نے کہا۔

”اب بھاگنا نہیں۔“ آفتاب نے اس کی طرف اپنی شہادت کی انگلی کرتے ہوئے کہا۔

”بزدل نہیں ہوں۔“ تیور نے کہا۔

آفتاب نے اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور اس کی کار سے پیچھے ہٹ گیا۔ تیور نے اپنی کار آگے بڑھا دی۔ آفتاب اس کی کار جاتی ہوئی دیکھتا رہا تھا۔ جب اس کی کار نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو آفتاب نے جیب میں بیٹھے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ جیب ایک طرف

کھڑی کر دے اور خود وہ غصے سے ایک طرف رفتہ رفتہ چل پڑا۔ اپنے اندر غصے کے اٹھنے والے طوفان کو وہ کچھ دیر چلنے سے دبا نا چاہتا تھا۔

آفتاب ابھی کچھ ہی فاصلے پر گیا تھا کہ اسے دائیں طرف سے گولیوں کی آواز آئی۔ وہ اسی جگہ رک گیا۔ اس نے اس طرف دیکھا اور اپنا ریوالور نکال کر جیب میں موجود چند سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ اس کی طرف بھاگے۔ ان کا رخ اب اس طرف تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر چوک سے بائیں طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئی تھیں۔ جونہی آفتاب چوک سے بائیں جانب مڑنے لگا ایک بھاگتی ہوئی لڑکی اس سے ٹکرائی۔

آفتاب نے اس لڑکی کا بازو پکڑ لیا۔ وہ نازلی تھی۔ یک دم وہ خوف سے چیخی۔ ”مجھے چھوڑ دو..... مجھے چھوڑ دو.....“

”کون ہو تم؟“ آفتاب نے پوچھا۔ ”اور ہوش کرو۔“

پہلی بار نازلی نے آفتاب کی طرف دیکھا۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں خوف تھا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور اس کا جسم آفتاب کی بانہوں میں جھول گیا۔ نازلی بے ہوش ہو گئی تھی۔

☆=====☆=====☆

ایاز نے دیکھا کہ تیور اس جگہ پر آ گیا ہے۔ اس نے کار کھڑی کر دی ہے۔ ایاز نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک پنجر ٹرین اس اسٹیشن سے روانہ ہونے والی تھی۔ ایاز کا خیال تھا کہ وہ اس کی کار وہاں سے لے کر آگے لے جائے گا۔ بیک میں پیسہ دیکھ کر وہ بیک نکالے گا اور گھوم کر پڑی سے ہوتا ہوا ریلوے اسٹیشن کے اندر چلا جائے گا اور پھر اس پنجر ٹرین میں بیٹھ کر آگے کسی شہر میں اتر جائے اور وہاں سے پھر واپس اسی جگہ آجائے گا۔ جب تک کراچی جانے والی ٹرین کا وقت ہو جائے گا اور وہ اطمینان سے اس ٹرین میں سوار ہو جائے گا۔ اس طرح اگر کوئی اس کی تلاش بھی کرے گا تو وہ ٹرین میں ہونے کی وجہ سے محفوظ رہے گا۔

”آگے ہو تم۔“ ایاز نے اسے فون کیا۔

تیور نے موٹر سائیکل اسٹینڈ کی طرف دیکھا۔ دلبر وہاں کھڑا ایک بچے سے بوٹ پالش کر رہا تھا۔ تیور کے دیئے ہوئے وقت کے مطابق وہ اس جگہ موجود تھا۔ تیور نے کہا۔ ”ہاں آگیا ہوں۔“

”اب تم اپنی کار سے باہر نکلو اور اس جگہ سے چلے جاؤ۔ بالکل کار کی مخالف سمت کی

طرف جانا اور چلتے ہی جانا۔“ ایاز نے ہدایت کی۔

”نازلی کہاں ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”وہ اسی جگہ ہے۔ پیسہ ہاتھ آتے ہی میں تمہیں بتا دوں گا۔“ ایاز نے کہا۔

”تم اس کار کی طرف نازلی کو بھیج دو۔ میں کار سے نکل کر اسے یہاں سے لے جاتا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم انتظار کرو۔ کچھ دیر بعد میں تمہیں اطلاع کرتا ہوں کہ نازلی کی لاش کہاں پڑی ہے۔“ ایاز نے اطمینان سے کہا۔

”خبردار جو تم نے ایسے الفاظ بھی منہ سے نکالے۔“ تیمور چیخا۔

”پھر جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔“ ایاز نے کہا۔

تیمور نے کچھ دیر سوچا اور ایک نظر دلبر کی طرف دیکھا۔ وہ بوٹ پالش کراچکا تھا اور وہ بڑی ہوشیاری سے تیمور کی کار پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ تیمور کار سے باہر نکلا تو موٹر سائیکل اسٹینڈ کے ساتھ بنے ریلوے کو اثر کی ایک کھڑکی میں جس کے آگے جالی لگی ہوئی تھی، سکندر نے تیمور کو دیکھ لیا اور یک دم چونکا۔

”یہ یہاں..... نہیں چھوڑوں گا اسے۔“ سکندر نے دانت پیس کر کہا اور اپنا ریوالور کھول کر دیکھا، وہ لوڈ تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس کو ارٹھر سے باہر نکلا۔

تیمور کار کی مخالف سمت کی طرف چل پڑا تھا۔ وہ قدم قدم کار سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ دلبر ایک طرف دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس جگہ چند فلی، کچھ مسافر بھی کھڑے تھے۔ دلبر نے اپنا موبائل فون نکال لیا تھا اور اس کی نگاہ تیمور کی کار کی طرف تھی۔ جس کی طرف ابھی کوئی نہیں بڑھا تھا۔

ایاز اسی جگہ کھڑا تیمور کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ جونہی تیمور آگے جا کر بائیں طرف مڑا۔ ایاز نے دائیں اور بائیں دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کار کی طرف بڑھتا۔ سکندر اس کار کے قریب سے گزرتے ہوئے یک دم رکا۔ اسے کار کے اندر بیگ دکھائی دیا تھا۔ ایک دم اس کے دماغ نے کام کیا اور اسے خیال آیا کہ تیمور یہاں کار چھوڑ کر گیا ہے۔ اس کے اندر ایک بیگ بھی ہے۔ کیا اسے یہاں اس شخص نے تو نہیں بلایا جس کے پاس اس کی بہن ہے؟ اور اس بیگ میں تاوان کا روپیہ ہے؟ کار کو اس طرح سے چھوڑ کر چلے جانا، یہ ہی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ اسے یقیناً ایسا کرنے کی ہدایت ملی ہوگی۔

سکندر نے یہ بھی سوچا کہ اس کار پر اس کی نگاہ بھی ہوگی جنہوں نے تیمور کو یہاں بلایا

ہے۔ وہ واپس پلٹا اور جیسے ہی اس نے کار کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا، کار کا دروازہ کھل گیا۔ ایاز کی نگاہ جیسے ہی سکندر پر پڑی وہ چونکا۔ دلبر نے تیمور کو اطلاع دی کہ سکندر کار لینے کے لیے آیا ہے۔

تیمور پہلے ہی اس جگہ سے بھاگتا ہوا دوسری طرف سے اس سمت آ رہا تھا۔ اس نے اپنی بھاگنے کی رفتار اور تیز کردی تھی۔ سکندر کے بارے میں جان کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ ایاز، سکندر کے ساتھ مل کر یہ کام کر رہا ہے۔

ایاز نے سوچا کہ یہ اس جگہ کہاں سے آ گیا ہے؟ اگر سکندر کار لے گیا تو اس کی قسمت بھی ساتھ ہی چلی جائے گی۔ وہ پھر تہی دست رہ جائے گا۔ یہ ہی ایک موقع ہے کہ وہ بھاگ کر اس سے پہلے کہ وہ کار میں سوار ہو، سکندر کو دھکا دے کر دور گرا دے اور خود کار لے کر اس جگہ سے فرار ہو جائے۔

سکندر کار کا دروازہ آہستہ سے کھول رہا تھا۔ وہ تیمور کو بھول گیا تھا۔ اس کی نگاہ میں اب صرف وہ بیگ تھا۔ جس میں اسے ہرے ہرے نوٹ دکھائی دے رہے تھے۔ ایاز نے دائیں اور بائیں دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ دلبر کی نگاہ ایاز کی طرف بھی چلی گئی۔ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور تیمور کو اگلی اطلاع ایاز کی دی۔ تیمور بھاگتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔

سکندر نے جیسے ہی کار کا دروازہ کھولا اور اس میں بیٹھنے کے لیے ایک قدم اٹھایا ہی تھا کہ ایاز کسی طوفان کی طرح اس کی جانب بڑھا اور اس کے ساتھ اس زور سے ٹکرایا کہ سکندر اُچھلتا ہوا نیچے گرا اور دو تین قلابازیاں کھا کر سڑک کے عین درمیان میں لیٹ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا ہوا ہے۔

ایاز نے فوراً کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی لیکن کار میں چابی نہیں تھی۔ ایاز نے جلدی سے تلاشی نگاہوں سے دیکھا، تیمور نے ہوشیاری سے جان بوجھ کر چابی نیچے گرا دی تھی۔ ایاز نے کار کی چابی اٹھائی اسے لگایا اور اشارت کرنے کے لیے گھمایا، کار جونہی اشارت ہوئی، اسی اثنا میں سکندر بھی اپنی جگہ سے اُٹھ گیا تھا۔ اس نے کار کی طرف دیکھا، کہ کوئی اس میں بیٹھا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ کار کی طرف بڑھا۔ دلبر بھی کار سے کچھ ہی فاصلے پر آ گیا تھا۔ تیمور بھاگتا ہوا اس جگہ تک پہنچ گیا تھا جہاں ایاز کھڑا تھا۔ ایاز نے کار گیزر میں ڈالی اور ابھی وہ آگے بڑھنے ہی والا ہی تھا۔ سکندر اس کی طرف بڑھا اور کار کے دروازے کو ہاتھ ڈال لیا۔ لوگ کھڑے ہو گئے تھے۔ سب کی توجہ ان کی طرف

تھی۔ تیمور بھی بھاگتا بھاگتا رک گیا تھا۔ سکندر اور ایاز کو ایک دوسرے کے ساتھ اس حالت میں دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی تھی۔ اسے نازی سے غرض تھی۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ نازی کہاں ہے۔ اس بارے میں وہ کیسے پتہ کرے۔ ایاز نے کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔ سکندر کا ہاتھ اسٹیرنگ پر تھا۔ اس نے اسٹیرنگ گھمایا اور ایاز کے ہاتھ سے کار بے قابو ہو کر سامنے کی دیوار کی طرف تیزی سے بڑھی۔ اس جگہ چند قلی اور لوگ کھڑے تھے۔ اچانک کار کو اس طرف آتا دیکھ کر وہ تیزی سے ایک طرف ہٹ گئے اور کار سیدھی دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی۔ ایک دھماکہ ہوا۔ سکندر پھر نیچے گر گیا۔ ایاز کا سراتنی زور سے اسٹیرنگ سے ٹکرایا کہ اس کا ہاتھ پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ اسی اثنا میں تیمور آگے بڑھا اس نے سکندر کو پکڑا اور اتنی زور سے سامنے کی دیوار میں دے مارا کہ سکندر نڈھال ہو گیا۔ اس کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ دلبر نے آگے بڑھ کر اسے قابو میں کر لیا۔ تیمور جلدی سے ایاز کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کر اس کا گریبان پکڑا، اور جھنجھوڑ کر پوچھا۔

”بتاؤ نازی کہاں ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ نازی کہاں ہے۔“

ایاز مدہوش سا ہو گیا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ اب اس کا فرار ہونا ممکن نہیں ہے۔ سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اس نے بند آنکھوں سے اپنی لاغر آواز میں کہا۔

”اے چوہدری نواب دین اپنے ساتھ لے گیا ہے۔“

”کون ہے وہ..... اور کہاں لے گیا ہے۔“ تیمور نے پوچھا۔

”وہ.....“ ایاز کچھ کہنے والا ہی تھا۔ کہ وہاں پر موجود پولیس آگئی تھی۔ انہوں نے سکندر اور ایاز کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ تیمور کے لیے ایاز سے کچھ پوچھنا اب ممکن نہیں تھا۔ اس نے پولیس کو بیان دیا کہ یہ اس کی کار ہے۔ یہ دونوں اس کی کار چھین رہے تھے۔

پولیس سکندر اور ایاز کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ تیمور سوچ رہا تھا کہ نواب دین کون ہے اور وہ نازی کو اپنے ساتھ کہاں لے کر چلا گیا ہے۔ وہ اس بات کا کیسے پتہ کرے؟

☆=====☆=====☆

حوالات میں بند ایاز کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی ماں نے اسے اپنی مرضی سے چلانا چاہا تھا۔ اس کے باپ نے کبھی پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اس کے ماں باپ کے اختلافات ان کے درمیان تھے، جبکہ اس کا کیا قصور تھا؟ زیادہ روپیہ حاصل کرنے کی لالچ میں اس نے اپنا کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل یہ بھی نہ سوچا کہ اس کا انجام کس اندھیری گلی میں ہوتا ہے۔

ایاز کے دل میں پچھتاوے کے کانٹے چبھ رہے تھے۔ اسے وہ وقت بھی یاد آیا جب اس کے دوست نے ایک بار اسے پیشکش کی تھی کہ وہ اپنے باپ سے کہہ کر اپنی کمپنی میں نوکری دلا سکتا ہے۔ تنخواہ بھی اچھی تھی۔ وہ باعزت طریقے سے کما سکتا تھا۔ اس کی ہر جائز ضرورت بڑے احسن طریقے سے پوری ہو سکتی تھی۔

ایاز کی جب نازی سے ملاقات ہوئی تو اس نے سوچا تھا کہ وہ نوکری کرنے کی بجائے اس لڑکی کے ذریعے سے بہت کچھ کیوں نہ حاصل کرے؟ طمع کی کشتی میں سوار ہو کر اس نے اپنے دوست کو انکار کر دیا تھا اور پھر وہ اس جگہ تک پہنچ گیا۔ جس کے بارے میں اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔

اُسے یہ بات بھی بتادی گئی تھی کہ اس کے گھر والوں کو اس کے بارے میں اطلاع کی گئی ہے لیکن اس کی ماں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہہ دیا ہے، وہ اس کا بیٹا نہیں ہے، وہ جس کی اولاد ہے وہ جانے کہاں ہے۔ اس کی بہن نے بھی منہ پھیر لیا تھا۔

ایاز نے ایک کرب سے سوچا..... کیا کوئی ماں اتنی بھی سنگدل ہو سکتی ہے؟ شاید یہ بھی اس کے گناہوں کی سزائیں شامل ایک سزا تھی۔ وہ رونے لگا تھا۔

☆=====☆=====☆

تیمور اپنے گھر میں موجود تھا اور حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ عشرت کو بھی ساری بات کا پتہ چل گیا تھا۔ کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دونوں پریشان تھے۔ اچانک دروازے کی گھنٹی نے دونوں کو چونکا دیا۔ تیمور نے دروازہ کھولا تو سامنے آفتاب کھڑا تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔“ آفتاب نے پوچھا۔

”کیا آج دروازے پر کھڑے کھڑے بات نہیں کرو گے۔“ تیمور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم ایسا چاہتے ہو تو میں اندر نہیں آتا۔“ آفتاب نے کہا۔

”میں نے تو اس دن بھی کہا تھا کہ ہم گھر آئے دشمنوں کی بھی عزت کرتے ہیں۔“ تیمور نے کہا۔

”اس دن وہ بات میں سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔“ آفتاب نے کہا۔

وہ اسے اندر لے آیا۔ آفتاب نے کہا۔ ”آخر مجھے پتہ چل ہی گیا کہ تم کون سی جنگ لڑ رہے تھے۔“

حماد کو عشرت نے معاف کر دیا تھا اور تیمور کے کہنے پر اس نے حماد کی بات نازیلی پر عیاں نہیں کی تھی کہ اسے اس جگہ سے آزاد کرانے والا کون تھا۔ حماد نے بھی توبہ کر لی تھی کہ اس نے اپنا راستہ پانے کے لیے جو غلط راستہ اختیار کیا تھا، اس بارے میں وہ کبھی نہیں سوچے گا۔ اس نے اپنی اصلاح کر لی تھی۔

اسی شام کو احسان احمد اپنی بیٹی کے ساتھ آ گیا تھا۔ وہ اسلام آباد جانے سے قبل تیمور سے ملنے کے لیے آ گئے تھے۔ تیمور نے انہیں بتایا کہ نازیلی کچھ دیر قبل ہی پہنچی ہے۔ اُداس ہو جانے کی وجہ سے وہ جلدی واپس آ گئی ہے۔ یہ سن کر احسان احمد اور اس کی بیٹی خوشی سے جھوم اُٹھے تھے۔ نازیلی ان کے سامنے آئی تو احسان احمد نے پیار اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ تیمور کا گھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس گھر کے ساتھ کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہی نہیں ہے۔ وہ سب کچھ بھول گئے تھے۔ سب خوش تھے۔

☆=====☆ ختم شد =====☆

تیمور اس کی بات سن کر چونکا۔ ”کیا مطلب.....“ آفتاب اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے سوچا کہ تم نے پولیس سے کیوں مدد نہیں لی۔ قانون اس ملک کے لوگوں کے لیے ہی ہے۔ خود ہی اپنی جنگ لڑنا قانون کو ہاتھ میں لینا ہے۔“

”تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”شاید تم کسی اور بات میں الجھے ہوئے ہو۔“

”آج ساری الجھنیں دور ہو گئی ہیں۔“ آفتاب نے کہا۔

”ہاں کل تم مجھ سے اپنا انتقام جو لے لو گے۔“ تیمور مسکرایا۔

”پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہاری اور میری دوستی ہوتی تو تم مجھ پر اعتبار ضرور کرتے۔ ہم دونوں کے بیچ انانہیں آتی۔ جو خلیج ہے وہ نہ ہوتی..... کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟“

اس نے ایک بار پھر تیمور کی بات نظر انداز کی۔

”مجھے نہیں معلوم....“ تیمور نے کہا۔

”میری طرف دیکھ کر کہو..... کیا میں یہ ٹھیک نہیں کہہ رہا۔“ آفتاب نے کہا۔ ”جب ہماری لڑنے کی عمر گزر گئی ہے تو ہم کیوں اپنی اپنی لڑائی اپنے دلوں میں لئے ایک دوسرے سے دور ہیں؟“ تیمور چپ رہا۔ آفتاب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”آج میں کہتا ہوں کہ میری تم سے کوئی دشمنی اور لڑائی نہیں ہے۔ میں تم سے نہیں لڑوں گا اور دوستی کے لیے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ چاہو تو مجھ سے ہاتھ چھڑالو..... چاہو تو اس ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دو۔“

تیمور نے آفتاب کی طرف دیکھا اور مسکرا کر اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ اس کے بعد آفتاب نے رضوان کو بھی باہر سے بلا لیا وہ کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ نازیلی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر تیمور حیرت سے اُچھل پڑا تھا۔ آفتاب نے جو کچھ نازیلی سے جانا تھا وہ اس کے گوش گزار دیا تھا۔ وہ گھرا ب خوشیوں میں نہا گیا تھا۔ پرانے دوست پھر سے ایک ہو گئے تھے۔

آفتاب نے آہستہ سے تیمور سے کہا۔ ”سکندر پر تو بہت سے مقدمات ہیں۔ تمہارا نام آئے بغیر میں ایاز پر بھی اغوا برائے تاوان کا مقدمہ درج کروں گا..... یہ میں نے سوچ لیا ہے۔“

☆=====☆=====☆